بسم الله الرحمن الرحيم

تفسیر خطبه فاطمیه سلام الله علیها

نام کتاب: تفسیر خطبہ فاطمیہ سلام اللہ علیہا

مؤلف: **سید جواد نقوی**

ترتیب: **مرکز تحقیقات اسلامی بعثت**

ناشر: **متاب پبلی کیشنز**

اشاعت: **دوم، جمادی الاوّل ۱۴۴۳ھ**

تعداد: **۱۰۰۰**

عرضِ ناشر

قرآن میں حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا سے منسوب دیگر آیات کے علاوہ ایک پورا سورہ بنام ''سورہ کوثر'' موجود ہے، ائمہ علیہم السلام سے مروی دعاؤں میں آپؑ کو ''سرِ مستودع'' یعنی رازِ پنہاں کہا گیا ہے۔ امام خمینیؒ آپؑ سے متعلق اپنے عجز کا اظہار یوں فرماتے ہیں کہ ''میں حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کے مقام و عظمت کو درک کرنے سے عاجز ہوں''

علامہ اقبالؒ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے بارے میں فرماتے ہیں: ''اللہ کا دین اور فرمان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے روک رہا ہے ورنہ اقبالؒ کا ایک ہی کام ہوتا کہ ساری زندگی فاطمہ سلام اللہ علیہا کی قبر کا طواف کرتا رہتا اور اسی طرح اپنی جان دے دیتا''

اگرچہ دینی منابع جنابِ زہرا سلام اللہ علیہا کے مقام و رتبہ کو واضح و روشن کر رہے ہیں لیکن افسوس امتِ محمدیؐ کے لیے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی شخصیت آج بھی ناشناختہ ہے۔ عقیدتوں سے سرشار اور حقیقتوں سے خالی اُمت کو جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی شناخت و معرفت کروانے کے لیے استادِ محترم سید جواد نقوی حفظہ اللہ نے گزشتہ سالوں سے ایامِ فاطمیہؑ کے دوران اپنی مجالس میں خود جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے اس فراموش، متروک و مہجور تاریخی خطبہ فاطمیہؑ معروف خطبۂ فدکیہ کی آئیڈیالوجیکل و مکتبی تفسیر و تشریح کا آغاز کیا ہے۔ استادِ محترم فرماتے ہیں کہ ایامِ فاطمیہؑ میں مناسب ترین گفتگو حماسۂ فاطمیہ و قیامِ فاطمیہؑ کی تشریح ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے اس خطبہ کے ضمن میں ایک بہت ہی خوبصورت نکتہ نقل کیا ہے کہ جب یہ خطبہ اہل ادب و اہل فصاحت و بلاغت علماء کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے اس طرح اپنے ہاتھ کاٹنے شروع کیے جس طرح خواتینِ مصر نے یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹنے شروع کئے تھے۔ جی ہاں! تاریخ میں ایسے علماء و ادباء و فصیح و بلیغ لوگ گزرے ہیں جنہوں نے حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کا خطبہ کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔

یہ خطبہ درحقیقت تشیع کا نصاب ہے۔ اگر کوئی انسان یہ خطبہ آغاز سے انتہا تک تفسیر کے ساتھ پڑھ

لے تو ایسا ہے جیسے اس نے اسلام شناسی کا کورس مکمل کرلیا ہو۔ بی بی سلام اللہ علیہا نے معارف توحیدی سے خطبے کا آغاز کیا پھر مقام رسالت، مقامِ امامت، فلسفۂ دین اور حقیقت قرآن بیان کی ہے۔ اس خطبے میں بی بیؑ نے پورا دین سمجھایا ہے۔ یہ ہماری تنگ نظری و محدود ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ ہم اس خطبے کا محرک صرف جائیداد کا جھگڑا قرار دیتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب بعنوان ''تفسیر خطبۂ فاطمیہؑ'' میں استادِ محترم سید جواد نقوی حفظہ اللہ نے خطبہ فاطمیہؑ کے ابتدائی حصے کی تشریح بیان فرمائی ہے جس میں بی بی سلام اللہ علیہا کی گفتگو کا بنیادی محور معرفت توحیدی ہے۔ کتاب کی ابتدائی فصل میں تعارف و مقام فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک قانونِ کلّی بیان فرمایا ہے کہ ہر متکلم اپنے کلام میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ لہٰذا حقیقت فاطمیہؑ کو سمجھنے کے لیے خود کلام فاطمہؑ کو سمجھا جائے۔ خطبۂ فاطمیہؑ درحقیقت تجلی گاہِ مقامِ فاطمہؑ ہے۔ روایات میں آیا ہے کہ بی بی سلام اللہ علیہا کی ولادت کے موقع پر خود جبرائیل آئے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبارکباد دینے کے بعد فرمایا کہ اللہ نے اس کا نام ''فاطمہؑ'' تجویز کیا ہے۔ مقامِ فاطمہؑ سے آگاہی کے لیے یہی کافی ہے کہ جب بی بی سلام اللہ علیہا تشریف لاتیں تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہوجایا کرتے تھے اور جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر یا مسجد میں جاتے تو پہلے فاطمہ سلام اللہ علیہا کے گھر کے سامنے آکر سلام فرماتے۔

جبکہ ہمیں جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کا تعارف رسمی و روایتی انداز سے کروایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ جنابِ زہراء سلام اللہ علیہا کو ہمارے آنسوؤں کی ضرورت ہے کہ ہم اُن کے بیٹے کو روتے رہیں اور دوسرا ہمیں اپنی حاجتوں کے لیے حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہم نے بی بی سلام اللہ علیہا کا مطالبہ پورا کر دیا اور بی بی سلام اللہ علیہا نے حاجتوں کے لیے ذریعہ بن کر ہمارا مطالبہ پورا کر دیا۔ استادِ محترم اس خطبے کے بنیادی محرکات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تاریخ اسلام کا سب سے پہلا انحراف جو اُمت نے خطِ رسولؐ سے کیا وہ فرمان غدیر کو فراموش کرتے ہوئے پارٹی بنیاد پر ووٹوں کے ذریعے ایک خود ساختہ حکومت کا قیام تھا۔ اس حکومت نے پہلا حکومتی حکم نامہ یہ صادر کیا کہ فدک جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے واپس لے لیا جائے۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے نظام الٰہی و نظام امامت و ولایت کے دفاع میں فدک کو ایک بہانہ قرار دیا اور حکومت

کے مقابلے میں قیام ومبارزہ کیا۔

حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کو ان کی وصیت کے مطابق رات کو غسل وکفن دے کر رات ہی میں دفن کیا گیا اور ان کی قبر کا نشان بھی مٹا دیا گیا اور کسی کو بھی اُن کی شہادت کی اطلاع نہیں دی گئی۔ سوال یہ ہے کہ اگر بی بی سلام اللہ علیہا کو رنجش تھی تو چند افراد سے تھی، لیکن آپ نے عوام، خواص وحکومت سب کا بائیکاٹ کیوں کیا؟ اصلاً جب بی بی سلام اللہ علیہا نے خطبہ دے دیا اور ان لوگوں کو بات سمجھ نہیں آئی تو حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا اس نظام واس دنیا سے اظہارِ ناراضگی کر کے چلی گئیں۔

استادمحترم سید جواد نقوی حفظہ اللہ نے خطبہ فاطمیہ میں شامل متن کی انتہائی دقیق انداز میں تشریح کی ہے تاکہ پڑھنے والا اپنے مقصود تک پہنچ جائے۔ خطبہ کے پہلے پیراگراف میں چار حصے اور ہر حصے میں تین تین جملے ہیں۔ خطبے کے پہلے حصے میں جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے تین جملوں کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں حمد وتعریف پیش کی ہے۔ نعمتوں پر حمدِ خدا کی ہے، الہامات پر شکرِ خدا اور جو نعمتیں خدا نے پیش کی ہیں اُن پر ثناء بجالائی ہیں۔

استادِ محترم سید جواد نقوی حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ نعمت خدا کے دیئے ہوئے اس وسیلے یا ذریعے کو کہتے ہیں جو انسان کو مقصدِ خلقت تک پہنچنے میں مدد دے۔ خطبے میں بی بی سلام اللہ علیہا حمدِ خدا رسماً بیان نہیں کررہیں بلکہ معرفت کے ساتھ بجالارہی ہیں۔ یہ حمد خودخواہی والی بھی نہیں ہے کیونکہ بی بی سلام اللہ علیہا یہ نہیں کہہ رہیں کہ خدا نے جو نعمتیں مجھے دی ہیں ان پر خدا کی حمد ہے۔

شکر وکفر کے بارے میں فرق کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نعمتِ خدا کو ظاہر کرنا شکر ہے اور نعمتِ خدا کو چھپانے کا نام کفر ہے، لفظِ الہام، تعلیم ومعلومات کے فرق کی بھی وضاحت کی گئی ہے، تعلیم یعنی مختلف ذرائع سے لقمہ لقمہ کر کے سیکھنا اور سمجھانا جبکہ الہام یعنی ایسی آگہی وہدایت جو اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ بی بی سلام اللہ علیہا نے لفظِ ثناء استعمال کیا۔ اجمالی طور پر ثناء اس تعریف کو کہتے ہیں جو بار بار تکرار ہو۔ جو کچھ خدا نے بشر وکائنات کے لیے پیش کیا ہے اس پر بی بی سلام اللہ علیہا خدا کی تعریف مکرر اور نہ ختم ہونے والی تعریف بیان کررہی ہیں۔

بی بی سلام اللہ علیہا نے حمد وثناء کے تین جملے بیان کرنے کے بعد مزید تین جملے خداوند تبارک وتعالیٰ کی

نعمتوں کے بارے میں اسی فصاحت و بلاغت کے ساتھ ارشاد فرمائے۔

بی بی سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں ''ان عمومی نعمتوں پر ثنائے پروردگار ہے جو خدا نے ابتداءً عطا کی ہیں اور حمد و ثناء ہے خدا کی ان فراوان نعمتوں پر جو خداوند تبارک وتعالیٰ نے ہمارے لیے ہر سو عطا کی ہیں اور اے پروردگار! تو نے اتنی فراوان نعمتیں عطا کیں لیکن ان میں سے ایک ذرہ بھی بے جا عطا نہیں کیا اور یہ کامل نعمتیں تو نے متواتر اور پے در پے عطا کی ہیں۔''

استاد محترم فرماتے ہیں جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا خطبہ کے ایک مرحلے میں خدا شناسی کے ساتھ کائنات شناسی کا ذکر نعمتوں پر ثنائے پروردگار کے وسیلے سے فرما رہی ہیں۔ پروردگار عالم نے بغیر مانگے یہ ساری کائنات خلق کی ہے۔ صدیوں سے حل طلب سوالات کا جواب بی بی سلام اللہ علیہا نے اس ایک خطبے میں دے دیا کہ اس کائنات کا خالق کون ہے؟ مقصد خلقتِ انسان کیا ہے؟ خدا نے اس کائنات کو کیوں پیدا کیا؟ خدا غنی ہے لہٰذا اُس نے کائنات کو اپنی ضرورت کے لیے پیدا نہیں کیا بلکہ خدا نور ہے اور نور کا کام روشنی دینا ہے لہٰذا خدا نے کائنات کو سود کے لیے نہیں بلکہ جُود کی وجہ سے پیدا کیا ہے۔

ہم اصلاً عمومی نعمتوں کو نعمتیں ہی شمار نہیں کرتے اس طرح انسان نعمتِ خدا کو جھٹلاتا ہے۔ عبدِ خدا کے نزدیک سب نعمتیں خدا کی عطا کردہ ہیں مگر قارون صفت انسان خدا کی نعمتوں کے حاصل ہونے کے بعد کہتا ہے کہ یہ سب کچھ میں نے اپنی محنت اور ہنر سے حاصل کیا ہے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے نعمتوں کے متعلق تین نکتے بیان فرمائے؛ نعمتوں کی عمومیت، نعمتوں کی سبوغیت اور نعمتوں کی تمامیت لیکن یہ تینوں جملے الگ الگ نعمتوں کے لیے بیان فرمائے۔

پھر بی بی سلام اللہ علیہا ان تین جملے توصیفِ نعمت یعنی ان نعمتوں کی خصوصیات کے بارے میں فرماتی ہیں:

''یہ عمومی، متواتر اور فراوان نعمتیں جو تُو نے عطا کی ہیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کے عدد کو شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان نعمتوں کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ان کی جزا نہیں دی جاسکتی اور یہ نعمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی کوئی انتہا معین نہیں کی جاسکتی۔''

یہ بی بی سلام اللہ علیہا کا عارفانہ عجز اور بہترین معرفت ہے۔ یعنی انسان خدا کا شکر ادا کرنے سے قاصر

ہے،اس کی نعمتوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا اور خدا کی نعمتیں نہ ختم ہونے والی ہیں۔

پھر خطبے کا چوتھا حصہ شروع ہوتا ہے کہ خدا نے یہ نعمتیں کیوں عطا کی ہیں؟ یعنی ان نعمتوں کی حکمت و فلسفے کو بیان کیا ہے۔تُو نے اس لیے نعمتیں دیں تا کہ تیرے بندے تیرے شکر گزار ہو جائیں۔خداوند تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس لیے حمدِ خدا کرو تا کہ نعمتوں کا سلسلہ متصل و جاری رہے۔

شکر کے مختلف مراحل ہیں،شکر نعمت کا پہلا مرحلہ خدا کی نعمت کا تذکرہ زبان پر لانا، دوسرا مرحلہ اس نعمت کو کام میں لانا اور تیسرا مرحلہ نعمت سے متعلق ذمہ داری بھی ادا کرنا۔

بی بی سلام اللہ علیہا ان غاصبوں کو اس چیز کی طرف متوجہ کر رہی تھیں کہ تم نے نعمتیں لے لیں لیکن ذمہ داریاں چھوڑ دیں۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا معارفِ توحیدی بیان کرنے کے بعد شہادت توحید سے اپنے خطبے کو جاری رکھتی ہیں۔استادِ محترم گواہی اور شہادت کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ توحید کی معلومات جمع کرنے سے انسان موحد نہیں ہو جاتا۔ابھی ہم نے صرف زبان سے لا الہ الا اللہ کہا ہے اور توحید کو اپنا مقام نہیں ملا۔جو کچھ ہم زبان سے کہہ رہے ہیں وہ اظہار ہے، جو کچھ ہم ذہنوں سے سمجھ رہے ہیں وہ مفہوم ہے اور جو کچھ ہمارے وجود سے ٹپک رہا ہے،نمایاں ہو رہا ہے اور لوگ محسوس کر رہے ہیں وہ ہماری گواہی ہے۔

استادِ محترم فرماتے ہیں شہادتِ وحدانیتِ خدا کا ایک اہم شعبہ نظامِ خدا،حکومت و حاکمیت الٰہی ہے۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا ایسے طبقے کے سامنے آئیں جس نے زبان سے لا الہ الا اللہ کہا تھا لیکن اپنا حاکم ووٹ کے ذریعے چنُا اور اللہ کے بنائے ہوئے حاکم کو رد کر دیا۔آج طاغوت جو بھی شیعہ چُنتا ہے، وہ شیعہ پارلیمنٹ کو شیعہ نہیں کرتا بلکہ طاغوت کا حصہ ہو جاتا ہے۔قوم جو اعمال انجام دے رہی ہوتی ہے وہ اس کی شہادت ہوتی ہے۔اگر آپ کے عمل سے جمہوریت ٹپک رہی ہے تو آپ کو گواہی دے رہے ہیں کہ آپ امامی نہیں ہے بلکہ جمہوری ہیں۔آپ امامی اُس وقت کہلائیں گے جب نظامِ امامت کے نفاذ کے لیے عملی جدوجہد کریں گے۔

استادِ محترم نے بی بی سلام اللہ علیہا کے اس جملے ''اخلاص کو کلمہ توحید کی تاویل قرار دیا گیا ہے'' کی بہت خوبصورت تشریح فرمائی ہے۔تاویل سے مراد معنی کو حقائق کی طرف لوٹانا ہے یعنی یہ وہ کلمہ ہے جو اخلاص بن

کر حقیقت کا لباس پہنتا ہے۔ بی بی سلام اللہ علیہا ان لوگوں کو فرما رہی ہیں کہ اگر تم نے لا الہ الا اللہ کی گواہی دی ہوتی تو آج تمہارے پاس خالص دین موجود ہوتا اور تم دین کے اہم رکن یعنی ولایت کو باہر نکال کے نہ بیٹھے ہوتے۔

پھر بی بی سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں ''یہ وہ کلمہ ہے جس کا پیوند دلوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔'' استادمحترم فرماتے ہیں قرآن کی نظر میں دل انسان کی روح کا مرکز ہے۔ دل وصالِ خدا کے لیے بنایا گیا ہے۔ جب انسان کا خدا کے ساتھ قلبی رابطہ برقرار ہو جائے تو اُس کے بعد مقامِ شہادت آتا ہے۔

پہلے معقولِ توحید ذہن میں ڈالا جاتا ہے پھر حقیقتِ توحید دل میں آتی ہے اور پھر دل سے حقیقتِ توحید شہادت و شہود کے اندر اُترتی ہے۔ اُس وقت تک توحید شہادت نہیں بنتی جب تک اُمت کے رویوں میں توحیدِ خالقیت، توحیدِ ربوبیت و توحیدِ حاکمیت نہ آئے اور اُمت طاغوت کی حاکمیت کا انکار نہ کرے۔

قارئین کرام!

مختلف زمان و مقام پر علماء و حکماء کی شکل میں انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے ایسے حقیقی وارث گزرے ہیں جنہوں نے اُمت کو بیدار کرنے کے لیے اپنی کُل حیات وقف کر دی۔ ان میں سید جمال الدین افغانیؒ، علامہ اقبالؒ، شہید استاد مرتضیٰ مطہریؒ و رہبر کبیر امام خمینیؒ جیسی شخصیات سرفہرست ہیں۔ استاد محترم سید جواد نقوی حفظہ اللہ کی شخصیت انہی برجستہ شخصیات کا ایک تسلسل ہے جو تمام فرقوں، گروہوں اور تنظیموں سے بالاتر ہو کر اُمت کو بیدار کرنے کے لیے اسے مشربِ ناب و اسلام ناب کا جام پلا رہے ہیں۔ گزشتہ دہائیوں سے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعے اُمت کو دینِ اسلام کی مکتبی شناخت کروا رہے ہیں۔

ہم امُید کرتے ہیں کہ استادِ محترم سید جواد نقوی حفظہ اللہ کی یہ کتاب ''تفسیر خطبۂ فاطمیہ سلام اللہ علیہا'' ہمیں راہِ سیدہ سلام اللہ علیہا دکھاتے ہوئے اس سرزمین سے طاغوتی نظام کے خاتمے اور نظامِ امامت و ولایت کے نفاذ میں مددگار و معاون ثابت ہوگی۔ ان شاءاللہ

(مرکز تحقیقاتِ اسلامی بعثت)

متاب پبلی کیشنز

فہرستِ مطالب

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

فصل اول:

مقامِ فاطمہ علیہا السلام
در
کلامِ فاطمہ علیہا السلام

حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا، حقیقتِ ناشناختہ

قرآنِ کریم، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے فرامین میں حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کی شخصیت اور مقام کا تذکرہ بہت ہی عظمت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ بالخصوص قرآن کریم میں آپؑ کے فضائل، خصائل اور اوصاف کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ حضرتِ زہراء سلام اللہ علیہا کے لئے سب سے بڑا اعزاز وتمغہ یہ ہے کہ خداوندتبارک وتعالیٰ نے ایک پورا سورہ بنام ''سورۂ کوثر'' آپؑ کی شان میں اتارا ہے۔ آپؑ کا قرآنی لقب کوثر ہے۔ یہ سورہ ان تمام تبلیغاتِ سوء کے مقابلہ میں قرآن کا ایسا انمول جواب ہے جس کا کوئی اور جواب نہ لاسکا۔ حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کی شخصیت وہستی اس قدر عظیم وبلند ہے کہ خدا، انبیاء، معصومین وائمہ اطہار علیہم السلام ثنا گوئے حضرت زہراء سلام اللہ علیہا ہیں اور ملائکہ الٰہی بارگاہِ حضرت زہراء سلام اللہ علیہا میں خاضع وتسلیم ہیں لیکن اس عظمت کے باوجود جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی شخصیت کے ایسے بہت سارے پہلو موجود ہیں جن کی طرف ابھی امت نے توجہ نہیں کی ہے حتیٰ کہ حقیقتِ فاطمیہ سلام اللہ علیہا ابھی تک پیروانِ اہلبیتؑ کے لئے بھی حقیقتِ ناشناختہ ہے۔

مقامِ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے متعلق امام خمینیؒ کا اعتراف

اگرچہ اس موضوع سے متعلق علمائے کرام نے بہت کچھ بیان کیا اور لکھا ہے لیکن اس کے باوجود مقامِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے بعض پہلو ابھی تک تشنہ ہیں۔ فضائلِ حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا باوجود کثرتِ ذکر کے امتِ اسلامیہ، اہلِ علم اور حتیٰ علماء کے لئے بھی ابھی تک ناشناختہ ہیں۔ اس سلسلے میں دلیل ومدرک کے طور پر سب سے اہم ترین دستاویز اس بزرگوار ہستی کی ہے جس نے مشکوٰۃ ونورِ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واہلبیت علیہم السلام سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے اور وہ حضرت امام خمینیؒ کی عظیم شخصیت ہے جو فانی در سیرتِ معصومین علیہم السلام ہے۔ فرزندِ حضرتِ زہراءؑ امام خمینیؒ نے ان سارے مقامات وتعریفات کا نچوڑ بیان کر دیا ہے۔ حضرتِ امام راحلؒ فرماتے ہیں:

''میں حضرتِ زہراء سلام اللہ علیہا کے مقام وعظمت کو درک کرنے سے عاجز ہوں''۔

جب اس عظیم منزلت کا فقیہ و عارف یہ اعتراف کرتا ہے کہ میں مقامِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو سمجھنے سے عاجز ہوں تو پھر عام انسان آپؑ کی شخصیت، آپؑ کے مقام کی حقیقت اور اس کی کنہ و گہرائی کو کیسے درک کر سکتے ہیں۔

حضرتِ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا، سر المستودع

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا اسرارِ الٰہی میں سے ایک سِر اور راز ہیں۔ بعض دعاؤں میں ہمیں استجابتِ دعا کیلئے یہ ادب سکھایا گیا ہے کہ خدا کو سِرِ مستودع کا واسطہ دیں:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِحَقِّ فَاطِمَۃَ وَ اَبِیْھَا وَ بَعْلِھَا وَ بَنِیْھَا وَ السِّرِّ الْمُسْتَوْدَعِ فِیْھَا...... [1]

اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا، ان کے والد، ان کے شوہر، ان کے بیٹوں اور اس رازِ پنہان کے حق کے واسطے سے جو ان کے درمیان ہے......

سِرِ مستودع حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی ذات ہے۔ یعنی ہستیٔ حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کے اندر خدا نے ایک راز ودیعت کر رکھا ہے کہ جس سے خدا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علی علیہ السلام وسیدہ سلام اللہ علیہا اور اولادِ سیدہ علیہم السلام آگاہ ہیں۔

مَاالْفَاطِمَۃَ وَمَا اَدْرَاکَ مَاالْفَاطِمَۃَ، آپ کو کیا پتا حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کیا ہیں؟ حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا سرِ نبوت، سرِ امامت، سرِ ولایت و سرِ نظامِ خدا ہیں لہٰذا جب دُعا مانگتے ہیں تو سرّ فاطمہ سلام اللہ علیہا کا واسطہ دیں، جو رازِ نخفتہ و رازِ پنہان حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی ذات میں ہے وہ خدا کے سامنے پیش کریں۔

اس حقیقت تک پہنچنے سے ہر انسان حتیٰ کہ فقیہِ متبحر بھی عاجز ہے البتہ فقیہ کا اظہارِ عجز عالمانہ ہے کیونکہ کسی چیز کی نسبت انسان کی عاجزی دو قسم کی ہوتی ہے:

۱) جاہلانہ عاجزی

۲) عارفانہ عاجزی

---

[1]...... (زندگی نامہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا) (فقہاء نامدار شیعہ)

بعض اوقات انسان اپنی جہالت اور کوتاہی کی وجہ سے اسے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا جبکہ عالمانہ اظہارِ عجز یہ ہے کہ اپنی پوری کوشش اور معرفت وعلم کے بعد جو کچھ حاصل ہوا وہ یہ ہے کہ یہ حقیقت قابلِ دسترس نہیں ہے۔قرآن کریم کی آیات اور معصومین علیہم السلام کے فرامین میں جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے جو فضائل بیان ہوئے ہیں اور احادیث میں جس سر المستودع کا ذکر آیا ہے اس سے مراد جنابِ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کا مقامِ ولایت ہے۔ اگرچہ آپؑ نہ منصبِ نبوت رکھتی ہیں اور نہ درجۂ امامت پر فائز ہیں لیکن صاحبِ ولایتِ عظمیٰ ہیں۔ یہ بات لفظوں کی حد تک تو سمجھ آسکتی ہے لیکن اس کی حقیقت، کنہ، تہہ اور راز تک پہنچنا مشکل ہے۔ پس جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے فضائل اور''سر المستودع'' ہونا اپنی جگہ حقیقتِ ناشناختہ ہے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے ناشناختہ فضائل

حضرتِ زہراء سلام اللہ علیہا کے قرآن واحادیث میں بیان کردہ فضائل خصوصاً احادیثِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وائمہ اطہار علیہم السلام میں جو فضائل ذکر ہوئے ہیں یہ بھی ناشناختہ ہیں، ہر چند کہ ان کا تذکرہ بہت ہوتا ہے۔ حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کے کچھ فضائل القابات کی صورت میں ہیں جن میں سے بعض معروف اور بعض غیر معروف ہیں۔غیر معروف القابات کا تذکرہ بہت کم ہوتا ہے اور جو معروف ہیں ان سے بھی ہم فقط لفظی حد تک آشنا ہیں جبکہ ان کے اندر بہت عظیم گہرائی پائی جاتی ہے۔

منبروں سے بیان ہونے والے تذکرے

اس وقت ہمارے ماحول اور ثقافت (Culture) میں ائمہ طاہرین علیہم السلام کے فضائل ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو عموماً منبروں سے بیان کی جاتی ہیں۔ان میں بہت سارے تذکرے فضائل کے زمرے میں ہی نہیں آتے۔ ہمارے یہاں عام طور پر منبروں پر ہونے والی تقریر (Speech) دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے:

ا) فضائل

۲) مصائب

یعنی اگر خطیب و ذاکر کی گفتگو میں رلانے کی بات ہو تو مصائب اور اگر رلانے کی بات نہ ہو تو سب فضائل ہیں جبکہ ان کی گفتگو کا بیشتر حصہ نہ مصائب سے کوئی تعلق رکھتا ہے اور نہ ہی فضائل سے۔

فضائل کا معنٰی

فضائل، فضیلت کی جمع ہے اور فضیلت کمال کا نام ہے۔ بنا بر ایں ہر چیز کو فضائل نہیں کہتے بلکہ فضائل ان کمالات کو کہتے ہیں جو انسان کے مرتبے کو بڑھا دیتے ہیں اور اسے ارتقاء عطا کرتے ہیں لہٰذا فضائل کے حقیقی معنٰی کے لحاظ سے حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے کثرت سے تذکروں کے باوجود بہت سارے فضائل ابھی تک ناشناختہ ہیں۔ فضائل کو سمجھنے کے لئے تجزیہ و تحلیل کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ ہم اس کوشش اور تحقیق سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ ہم زبانی تذکرے تو بہت کرتے ہیں لیکن ان فضائل کا تجزیہ نہیں کرتے، انہیں کھولتے نہیں اور ان کی گہرائی میں نہیں اترتے۔

فضائل کا معنٰی

فلسفۂ بیانِ فضائلِ اہل بیت علیہم السلام

فضائلِ اہلبیت علیہم السلام بیان کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔ ہمیں حکم ہوا ہے کہ ہم اہلبیت علیہم السلام کے فضائل بیان کریں، انہیں سنیں اور اپنی مجالس و محافل کو ذکرِ نورانی اہلبیت علیہم السلام سے منور کریں۔ اس لئے کہ فضائل کے بیان میں حکمت پائی جاتی ہے اور وہ حکمت فقط ثوابِ دارین کمانا نہیں بلکہ اپنے آپ کو فضائلِ اہلبیت علیہم السلام کا مظہر بنانا ہے کیونکہ جب انسان اپنی زبان سے فضائل بیان کرتا ہے یا کان سے سنتا ہے تو بیان کرنے والے کی زبان اور سننے والے کے کان فضائل سے آشنا ہوتے ہیں۔ نتیجتاً بیان کرنے والے اور سننے والے کے اذہان ان فضائل سے مانوس ہوتے ہیں۔ اگلے مرحلہ میں ان کا وجود ان فضائل کو اپنانے کیلئے آمادہ ہو جاتا ہے اور آخر میں انسان کا دل ان فضائل کے ظہور اور تجلی کا مظہر بن جاتا ہے۔

یہ ایک فطری پہلو ہے کہ جس بات کا تذکرہ کثرت سے کیا جاتا ہے نہایتاً وہ بات آپ کے دل تک جا پہنچتی ہے۔ خدانخواستہ اگر کوئی اپنی زبان لہویات ولغویات کیلئے استعمال کرے تو یہ اس کے دل میں جاگزین ہوتی ہیں اور آہستہ آہستہ اس کا دل لہولعب اور لغویات کا مرکز بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان اہل بیت اطہار علیہم السلام کے فضائل کثرت سے سنے یا بیان کرے تو دل ان فضائل کو اپنانے کیلئے آمادہ و تیار ہو جاتا ہے۔

فضائل ناشناختہ ہونے کی علامت

جس طرح ہمارے لئے حضرتِ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کے فضائل ناشناختہ ہیں اسی طرح امیر المومنین علی علیہ السلام کے فضائل بھی کثرت سے تذکرے کے باوجود ناشناختہ ہیں۔ فضائل کے ناشناختہ ہونے کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ جو لوگ کثرت سے یہ فضائل بیان کرتے ہیں وہ خود عمر بھر ان فضائل سے متصف نہیں ہوتے اور جو بہت کثرت سے فضائل سنتے ہیں ان کے اندر یہ فضائل ظہور نہیں کرتے۔ اگر ان فضائل کی شناخت ہوتی تو بولنے والے اور سننے والے کے اندر ان فضائل کی تجلی ضرور نظر آتی اور ان کمالات کا پرتو وسایہ ضرور موجود ہوتا۔ چنانچہ اہلبیت پیغمبر علیہم السلام کی محافلِ فضائل سے بیان کرنے والے اور سننے والے کا خالی ہاتھ لوٹ جانا، بغیر کوئی فضیلت اپنائے اٹھ کے چلے جانا اس بات کی واضح علامت و دلیل ہے کہ فضائل کا حق ادا نہیں ہوا ہے۔

فضائلِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے آشنائی کے موثر ذرائع

حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کی شخصیت و مقام کو پہچاننے کا ایک ذریعہ وہ فرامین ہیں جو معصومین علیہم السلام نے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی شان میں بیان کئے ہیں۔ یہ ایک وسیع باب ہے اور بعض علمائے کرام و بزرگوں نے اچھی کوشش کر کے وہ فرامین اکٹھے کئے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح بعض نے سید الشہداء علیہ السلام کے تمام فرامین کتابی شکل میں اکٹھے کئے ہیں۔ آرزو ہے کہ توفیق ہو اور یہ سارے پہلو بیان کئے جائیں۔

تفسیر خطبہ فاطمیہ سلام اللہ علیہا، دیرینہ آرزو!

آپ کی خدمت میں ایک دیرینہ آرزو پوری کرنا چاہتے ہیں کہ خود جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا تاریخی خطبہ، خطبہ فاطمیہؑ جو خطبہ فدکیہ کے نام سے معروف ہے اس کے بعض جملات کی طالبِ علمانہ تفسیر وشرح آپ کی خدمت میں بیان کی جائے۔ خداوند تبارک وتعالیٰ سے دعاوامید ہے کہ وہ اس کی تکمیل کی توفیق عنایت فرمائے تاکہ ہم ان اسرار ورموز سے آشنا ہوسکیں جو بی بی دو عالم سلام اللہ علیہا نے اس خطبہ نورانیہ میں بیان فرمائے ہیں۔ یہ خطبہ تاریخ میں محفوظ تو ہے لیکن امت کے اذہان میں مفقود ومتروک ہے۔ ابھی بھی آپ بہت سارے شیعوں سے پوچھ لیں کہ انہوں نے یہ خطبہ پڑھا یا سنا ہوا ہے یا اسی پر اکتفاء کیا ہوا ہے کہ بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا نے خطبہ دیا تھا۔ ہم صرف اسی کو اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں کہ بی بی سلام اللہ علیہا کو باغ واپس نہیں کیا گیا ورنہ خطبہ سے ہمیں کیا لینا دینا حتیٰ کہ یہ خطبہ منبروں پر بھی فراموش شدہ خطبہ ہے۔

عقیدتوں کا انسائیکلو پیڈیا

ہمارے معاشرے میں یہ رواج عام ہے کہ ہم معصومین علیہم السلام کے متعلق خود اپنا کلام زیادہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ خطیب خطابت کی شکل میں، شاعر شعر کی شکل میں، مداح مدح کی شکل میں اور نعت خواں نعت کی شکل میں معصومین علیہم السلام کے متعلق اپنا اپنا اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ نعت ایک خاص صنفِ کلام ہے جس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف، فضیلت اور مقام ومنزلت بیان کیا جاتا ہے۔ ابھی تک فقط اردو زبان میں لکھی جانے والی نعتوں کو اکٹھا کیا جائے تو ایک بہت ضخیم دائرۃ المعارف (Encyclopedia) وجود میں آجائے گا اور اگر دنیا کی ساری زبانوں میں کہی گئی نعتوں کو کتابی شکل دی جائے تو لاکھوں کی تعداد میں صفحے اور کئی جلدیں بنتی ہیں۔ فقط نعتوں کی کتابیں رکھنے کیلئے ایک لائبریری درکار ہوگی۔ اسی طرح اگر مختلف شعراء نے شانِ اہلبیت وائمہ اطہار علیہم السلام میں جو قصیدے کہے ہیں انہیں اکٹھا کیا جائے تو لاکھوں صفحات اور سینکڑوں جلدوں پر مشتمل کتابیں بن سکتی ہیں۔ اسی طرح وہ تقاریر وخطبے جو خطباء نے شانِ نبیؐ وآلِ نبیؑ میں تاریخ بھر

میں پڑھے ہیں قابلِ شمار نہیں ہیں۔اس قدر کثرت سے شانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شانِ اہلبیت علیہم السلام میں اظہارِ عقیدت کیا جاتا ہے۔

عقیدت کا اظہار

عقیدتوں کا اظہار نہ صرف ایک مستحسن اور قابل تعریف عمل ہے بلکہ اسلام ہمیں ان عقیدتوں کے اظہار کا حکم بھی دیتا ہے۔اس لئے کہ ان میں تاثیر ہوتی ہے۔ان عقیدتوں کو چھپانا نہیں چاہئے۔بعض لوگ ان عقیدتوں کے اظہار پر بعض اوقات حساسیت ظاہر کرتے ہیں۔عقیدتیں ضرور ظاہر ونمایاں ہونی چاہئیں البتہ عقیدتوں کے اظہار کی ایک حد ہے اوراس حد کے اندر عقیدت کا اظہار ضروری ہے۔

حقیقت سے دور عقیدت

اس سارے سلسلے میں ایک چیز کی کمی رہ جاتی ہے کہ عقیدتوں کے ان جذبات کے اندر حقیقتوں کے جلوے نظر نہیں آتے۔عقیدتوں کے شدید جذبات ہوتے ہیں لیکن حقیقت کم جلوہ گر ہوتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحبِ سخن جب اپنی عقیدت وجذبے کا اظہار کرتا ہے گویا اپنی علمیت کا اظہار کر رہا ہوتا ہے یعنی جو کچھ اس نے اپنے محدود چھوٹے سے ذہن سے سمجھا ہے اسی کو دوسروں کے سامنے پیش کر رہا ہے اور چھوٹے ذہن کے اندر حقیقت نہیں سما سکتی۔حقیقت ایک طالبعلم کے ذہن سے کہیں زیادہ وسیع ہوتی ہے۔

صاحبِ عقیدت اور اظہارِ حقیقت کا موقع

حقیقتوں کے اظہار کے لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے اپنی طرف سے انبیاء، رسل اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کو مقرر کیا ہے اور انہیں حقیقتوں سے آگاہ کیا ہے۔پہلے خدا نے حقیقتوں کے جلوے ان کے دلوں پر ظاہر کئے تاکہ وہ اپنے کلمات کے ذریعے حقیقتوں کی تجلیاں عام لوگوں کے سامنے پیش کریں لیکن لوگوں کی طرف سے

انہیں جو کچھ پیش ہوگا، وہ عقیدت ہے۔ہم کبھی بھی انبیاء وائمہ علیہم السلام کو حقیقت نہیں دکھا سکتے چونکہ حقیقت ان کے پاس ہے، حقیقت، راستہ، سمت، مقصد، اس راہ پر چلنے کا طریقہ اور راستے کے پیچ وخم انہوں نے ہمیں بتانے ہیں لیکن ہم نے ان سب پر اپنی عقیدتوں کا اظہار کرنا ہے۔

یہاں عقیدت مندوں کو چاہئے کہ خود صاحبِ عقیدت کو موقع دیں تا کہ وہ کچھ حقیقت کے جلوے انہیں بھی دکھا سکے چونکہ اگر ہم ہی عقیدتوں کے جذبے دکھاتے رہے اور انہیں حقیقتوں کے جلوے دکھانے کا موقع ہی نہ دیا تو ہماری عقیدتیں اگر چہ ہمیں اجر وثواب کا مستحق بنا سکتی ہیں لیکن ہماری مشکلات ان سے حل نہیں ہوسکتیں بلکہ حقیقت سے ہی مشکلات کا حل نکلتا ہے۔

حقیقت کے بغیر عقیدت کا ڈھیر

محفل میلاد کا انعقاد کیا جاتا ہے تو بعض اوقات بیسیوں نعت خوان بلائے جاتے ہیں۔ایک سے بڑھ کر ایک اچھی نعت پڑھنے والا سریلی آواز، سوز، عقیدت، اخلاص اور جذبے کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔شب بھر عقیدت کے جذبات سے سرشار محفلِ نعت منعقد رہتی ہے اور صبح ہونے پر عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عقیدتوں کے جذبے لئے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں لیکن ساری رات جو عاشقانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اپنی عقیدتوں کا اظہار کرتے ہیں اس میں چند منٹ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں دیئے جاتے کہ اس عقیدت بھری محفل میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حقیقت بھی بیان کریں۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چند منٹ حقیقت بیان کردیں تو وہ حقیقت پوری رات کی عقیدتوں کو با مقصد اور با معنیٰ بنا سکتی ہے لیکن اگر اس محفل میں حقیقت کا اظہار نہ ہو تو وہ عقیدتیں جو یک طرفہ تھیں اور ہماری علم و دانائی کی سطح کی حد تک تھیں شاید با کرامت ثابت نہ ہوں۔پس عقیدتوں کا اظہار ضروری ہے لیکن حقیقتوں کو بھی موقع فراہم کیا جائے۔مجالسِ عزاداری کا سلسلہ جو صدیوں سے قائم و دائم ہے اور ان شاء اللہ خدا اس کو قائم و دائم رکھے گا۔ ہزاروں مقامات پر مجالسِ عزاء کا انعقاد کیا جاتا ہے جن میں ذاکرین، خطباء، شعراء اور ہر طبقہ

اپنی اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ کربلا کے بارے میں عقیدتوں کا اظہار تو ہوجاتا ہے لیکن روحِ کربلا وحقیقتِ کربلا کا اظہار کیسے ہوگا؟ کربلا کی حقیقت کا اظہار کبھی بھی ایک شاعر، خطیب یا عقیدت مند نہیں کرسکتا بلکہ حقیقتِ کربلا کا اظہار خود صاحبِ کربلا کرسکتا ہے۔

اسی طرح دیگر نورانی کلمات کے ساتھ ساتھ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے دو خطبے بہت معروف ہیں۔ ایک خطبہ فدکیہ یا خطبہ فاطمیہؑ ہے جو آپؑ نے مسجد میں بیان فرمایا اور دوسرا عظیم الشان خطبہ انصار کی خواتین کے سامنے بیان فرمایا۔ اسی طرح ثانی زہراء سلام اللہ علیہا نے جو خطبات دربار ابن زیاد، دربار یزید اور کوفہ وشام کے بازاروں میں دیئے تاریخ میں موجود ہیں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہم ان خطبات سے زیادہ آشنا نہیں ہیں۔ بی بی زینب سلام اللہ علیہا بازار میں تو وہ خطبے سنا گئیں لیکن ان کی شان میں ہونے والی مجالس میں ہم یہ موقع ہی نہیں دیتے کہ وہ اپنی زبانِ مبارک سے چند کلماتِ نورانی ہمیں بھی تعلیم دیں۔ بی بی سلام اللہ علیہا کے وہ خطبات تاریخ میں تو محفوظ ہیں لیکن مجلسِ عزائے زینبیؑ میں مفقود ہیں۔

حقیقت بیانی، بشریت کی مشکلات کا حل

آج کے دور میں ہماری عقیدتیں خطرے میں پڑ چکی ہیں۔ ہماری عقیدت بھری محافل ومجالس میں دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ اگر مجالسِ حسینؑ میں تھوڑا سا وقت خود امام حسین علیہ السلام کو بھی دے دیا جائے کہ وہ اپنی مجلس میں اپنی حقیقت خود اپنی زبانِ مبارک سے بیان کردیں، اگر فضائلِ علی علیہ السلام کی مجلسوں میں تھوڑا سا وقت خود امام علی علیہ السلام کو بھی دے دیا جائے کہ علی علیہ السلام خود اپنی حقیقت بیان کردیں تو وہ حقیقت اگرچہ چند لمحوں کی ہی کیوں نہ ہو، بشریت کی تمام مشکلات کو حل کرسکتی ہے۔

پس بانیانِ محافل ومجالس، خطباء، ذاکرین وشعراء کوشش کرکے تھوڑا سا وقت ان ہستیوں کو بھی دے دیں کہ جن کی شان میں یہ محافل ومجالس برپا ہورہی ہیں تاکہ وہ حقیقتوں کا اظہار کریں۔

الحمدللہ! پاکستان میں مومنین کی ایامِ فاطمیہؑ سے آہستہ آہستہ آشنائی ہورہی ہے اور مجالسِ عزا برپا ہورہی

ہیں۔ ایامِ فاطمیہ کی نسبت عقیدتوں کا اظہار ہورہا ہے لیکن وہ سرِ حقیقت جس کی وجہ سے ان ایامِ سوگ کی بناء ڈالی گئی، عقیدت مندوں کی عقیدت سے کبھی بھی ظاہر نہیں ہوسکتی۔ وہ حقیقت خود صاحبِ حقیقت ہی بیان کرسکتے ہیں۔ حقیقتِ فاطمیہ خود حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی زبانِ مبارک سے ہی ادا ہوسکتی ہے۔ ہمارے لئے شخصیت، فضائل، منزلت وحقیقتِ جنابِ سیدہ کو سمجھنا تو دور کی بات بلکہ ہم ان کی عقیدت کے اظہار سے بھی عاجز ہیں۔

بارگاہِ معصومین علیہم السلام میں خاموش رہنے کا حکم

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے دور میں اس قسم کی محافل ومجالس منعقد ہوتیں اور وہ ان میں مدعو ہوتے تو اپنی شان میں برپا ہونے والی محافل میں کچھ بیان کرنے کی خواہش کا ضرور اظہار فرماتے کہ آپ نے اپنی اپنی بساط میں اظہارِ عقیدت کیا لیکن اب ہمیں بھی کچھ نہ کچھ بیان کرنے کا موقع دیا جائے۔ ہم بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن ہم انہیں یہ مہلت دینے کیلئے حاضر نہیں ہیں۔ ہمارا ذوق وشوق یہ ہے کہ لوگ ہمیں سنیں۔ بعض اوقات یہ شوق اتنا خودخواہی تک جا پہنچا تا ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ میں پڑھوں اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سنیں، میں بولوں اور علی علیہ السلام سنیں، میں خطاب کروں اور حسین علیہ السلام سنیں، میں تقریر کروں اور فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا سنیں۔ یہ بے ادبی کے زمرے میں آتا ہے۔

صدرِ اسلام میں بعض اعراب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کچھ سنا کے جائیں۔ اللہ نے آیت نازل کی کہ خبردار جب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں آتے ہو تو چپ رہو۔

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ...... [1]

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو......

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ نورانی کھلے اور تم اس کو سنو، زبانِ علوی کھلے اور تم اس کو سنو۔ تمہیں یہ شوق کیوں

---

[1]......(سورۃ الحجرات، آیہ ۱)

ہے کہ انہیں زیادہ سے زیادہ سنائیں۔ عموماً ذاکرین مجلس میں کہہ بھی دیتے ہیں کہ مولاؑ آئے ہوئے ہیں۔ اگر مولاؑ آئے ہوئے ہیں تو پھر آپ کیوں بول رہے ہیں، پھر تو آپ مولاؑ کو بولنے دیں لیکن وہ اس لئے کہہ رہا ہوتا ہے کہ میری گفتگو اتنی اہم ہے کہ مولاؑ بھی بیٹھ کر سن رہے ہیں۔ اگر مولاؑ آ گئے ہیں پھر آپ کا بولنا بے ادبی ہے۔

معصومین علیہم السلام، حاضر و ناظر

حقیقت یہی ہے کہ ائمہ علیہم السلام مجالس میں حاضر و ناظر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شہید کے بارے میں فرمایا ہے کہ شہید اس دنیا سے جا کر مرتا نہیں ہے بلکہ گواہ ہے، حاضر و ناظر ہے۔ گواہ اسی کو کہتے ہیں جو زندہ ہو، حاضر ہو، دیکھ رہا ہو اور ادراک رکھتا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں قرآن کا فرمانا ہے کہ وہ شہیدوں کے بھی شاہد ہیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے جانے کے بعد بھی حاضر ناظر اور امت پر گواہ ہیں۔

اسی طرح ائمہ اطہار علیہم السلام بھی اس امت پر حاضر و ناظر اور گواہ ہیں۔ امام ہوتا ہی امت کا گواہ ہے اور پھر ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ وہ ذخیرۂ الٰہی ابھی اس دنیا میں حی اور حاضر و ناظر ہے۔ ان کی نظر ان مجالس و محافل کے اوپر بھی ہے تو پھر انسان زیادہ محتاط ہو جائے اور موقع دے کہ وہ خود حقیقت کا اظہار کریں۔

متکلم کا کلام میں جلوہ گر ہونا

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک قانونِ کلی بیان فرمایا ہے کہ ہر متکلم اپنے کلام میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ امامِ ششمؑ قرآن مجید کے بارے میں فرماتے ہیں:

لَقَدْ تَجَلَّى اللّٰهُ لِخَلْقِهِ فِيْ كَلَامِهِ...... [1]

---

[1]......(بحار الأنوار-الشیخ العلامہ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۸۹، صفحہ ۱۰۷) (عوالی اللآلی-ابن ابی جمہور احسائیؒ، الجزء ۴، صفحہ ۴۰) (اسرار نماز-مرحوم ملا محسن فیض کاشانیؒ)

خداوندتبارک وتعالیٰ اپنے کلام میں مخلوق کے لئے جلوہ گر ہے......

قانون یہ ہے کہ کلام میں وہ جلوہ گرنہیں ہوتا جس کے بارے میں کلام ہو مثلاً قرآن میں شیطان، ابولہب، فرعون، قارون اوراسی طرح بہت سارے گمراہوں کا نام آیا ہے لیکن وہ قرآن میں جلوہ گرنہیں ہیں بلکہ قرآن میں وہ جلوہ گر ہے جس کا یہ کلام ہے۔ سورۂ لہب، ابولہب اوراس کی بیوی کے بارے میں ہے لیکن وہ دونوں اس میں جلوہ گرنہیں ہیں بلکہ خدا جلوہ گر ہے۔ پس اگر خدا اپنے کلام میں جلوہ گر ہے تو ہر متکلم اپنے کلام میں جلوہ گر ہے۔

امام المتقین حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

اَلْمَرْءُ مَخْبُوْءٌ تَحْتَ لِسَانِهٖ......[1]

انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے۔

انسان کی شخصیت اس کی زبان کے پیچھے چھپی ہوئی ہوتی ہے لہٰذا جب زبان کھولتا اور بولنے لگتا ہے تو اس وقت وہ اپنی شخصیت اور حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔ پس وہ دعا و مناجات جو ائمہ اطہار علیہم السلام سے منقول ہیں ان کے اندر حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ بولنے والا اچھے موضوع پہ بول رہا ہو یا کسی نامناسب موضوع مثلاً شیطان کے موضوع پر ہر دو صورت میں اس کلام میں متکلم جلوہ گر ہوتا ہے۔ متکلم اپنے علم، حکمت، معرفت اور دانائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں بولنے والے کی شخصیت، علم، حکمت، معرفت اور دانائی درحقیقت اس کے کلام کے اندر نمایاں ہو رہی ہوتی ہے۔ اس لئے اگر خداوندتبارک وتعالیٰ کو دیکھنا ہو تو قرآن میں دیکھیں۔

نعتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلوہ گرنہیں ہیں بلکہ نعت لکھنے والا شاعر، اس کی عقیدت اور جذبہ جلوہ گر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنی حدیث میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر امام علی علیہ السلام کو دیکھنا ہے تو علی علیہ السلام ان رباعیوں اور منقبتوں میں نظر نہیں آئیں گے جو شاعروں نے علی علیہ السلام کی شان میں لکھی ہیں چونکہ وہ امام علی علیہ السلام کے بارے میں ہیں، علی علیہ السلام کی نہیں ہیں۔ ان میں بھی شاعر جلوہ گر ہے۔ ہماری پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم مولا علی علیہ السلام کے بارے میں رباعی و منقبت زیادہ سے زیادہ سنیں لیکن علی علیہ السلام کا خطبہ سننا طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے۔

متکلم کا کلام میں جلوہ گر ہونا

---

[1]...... (نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۸)

اگر اس قانون کے تحت ہم ایامِ فاطمیہؑ میں جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے بارے میں فصیح و بلیغ کلام و شاعری کے ساتھ عقیدتوں کا اظہار کریں تو بھی آپؑ کی حقیقت سامنے نہیں آئے گی۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا اس کلام میں متجلی نہیں ہیں جو حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کے متعلق خطیب و ذاکر بیان کرتے ہیں بلکہ ان کلمات، خطبوں اور شعروں میں خطیبوں و شاعروں کی عقیدت جلوہ گر ہوتی ہے۔ حقیقتِ فاطمیہؑ خود کلامِ فاطمیہؑ میں جلوہ گر ہے۔ خطبہ فاطمیہؑ درحقیقت تجلی گاہِ مقامِ فاطمہ سلام اللہ علیہا ہے اور ایام فاطمیہؑ میں بہترین گفتگو کلامِ فاطمیہؑ کی تشریح و تفسیر ہے۔

ایامِ فاطمیہ سلام اللہ علیہا اور ان کی اہمیت

تاریخی حوالوں میں اختلاف کی بناء پر مومنین دو مختلف مہینوں میں حضرتِ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کی وفات کے ایام مناتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کتنا عرصہ زندہ رہیں اس کے بارے میں تاریخ میں دو مختلف تاریخیں درج ہیں۔ تیرہ جمادی الاول بھی ہے اور تین جمادی الثانی بھی لیکن زیادہ تر علماء تین جمادی الثانی کو ہی روزِ شہادتِ حضرتِ زہراء سلام اللہ علیہا قرار دیتے ہیں اور اس مناسبت سے یہ عشرہ ''عشرۂ فاطمیہؑ'' کہلاتا ہے۔ پہلی جمادی الثانی سے دس جمادی الثانی تک عشرۂ فاطمیہؑ ہے۔ یہ ایام اس لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں کہ جو روح ایامِ عاشورا میں پائی جاتی ہے، وہی ایامِ فاطمیہؑ میں ہے۔ دراصل ایامِ فاطمیہؑ اسلام، قرآن اور نظامِ الٰہی کی حیات کے ایام ہیں۔

احیائے ایامِ فاطمیہؑ میں انقلابِ اسلامی کا کردار

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انقلابِ اسلامی کے توسط سے تمام بشریت، امتِ مسلمہ اور بالاخص ملتِ تشیع کو وہ برکات عطا فرمائی ہیں جو صدیوں سے کسی قوم کو عطا نہیں فرمائی تھیں۔ ان برکتوں اور توفیقات میں سے ایک جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی یاد منانے کیلئے ایام فاطمیہؑ کا احیاء ہے۔ بعض لوگ اس نعمت کے قدردان نہیں ہیں اور انہیں یہ نہیں معلوم کہ خدا نے ہمیں کن وسیلوں سے کیا کیا نعمتیں عطا فرمائی ہیں؟ یہ انقلابِ اسلامی ہی کی

برکات میں سے ہے کہ اس نے فراموش شدہ دین کو پھر سے زندہ کیا ہے۔

اب ایامِ فاطمیہؑ اوران ایام میں سوگواری عام، رائج اور گھر گھر شروع ہوگئی ہے۔ہمیں یاد ہے کہ حتیٰ انقلاب کے بعد بھی چند علماء اور مراجع کرام کے دفتروں میں ایک بہت رسمی سی مجلس کے علاوہ ایام فاطمیہؑ کا کسی کو علم نہیں ہوتا تھا۔آج پوری دُنیا کے اندر ایام فاطمیہؑ برپا و برگزار ہیں اور یہی حکمتِ دین خدا ہے۔ جب اللہ کا نظام آتا ہے تو یہ ایام زندہ ہوجاتے ہیں لیکن طاغوتی نظام میں فراموش ہوجاتے ہیں۔

خدا رحمت کرے اُس فرزندِ زہراءؑ امام خمینی روح اللہ الکبیرؒ پر جس نے اسلام، تشیع، ایام فاطمیہؑ وعاشورہ کو زندہ کیا اور ہمیں ان حقیقتوں کی نورانیت کی طرف متوجہ کیا۔ ایامِ فاطمیہؑ میں مناسب ترین گفتگو حماسۂ فاطمیہؑ و قیامِ فاطمیہؑ کی تشریح ہے تاکہ آج کا پیروئے فاطمہ سلام اللہ علیہا جو ابھی تک فقط حاجتوں کے لئے فاطمہ سلام اللہ علیہا کا نام لیتا تھا اب نجات کے لئے بھی فاطمہ سلام اللہ علیہا کی پناہ میں جائے، اپنے ملک کے حالات سنوارنے، اپنی قوم کو نجات دینے اوراس دُنیا میں عزت کے ساتھ رہنے کے لئے دامن فاطمہ سلام اللہ علیہا کو تھام لے۔صدیوں سے محدود سطح پر جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی یاد میں مجالس کا انعقاد کیا جا تا رہا ہے اور اب الحمدللہ! وسیع پیمانے پر ایامِ فاطمیہؑ منائے جاتے ہیں لیکن حقیقتِ فاطمیہؑ اور سرِ فاطمہ سلام اللہ علیہا پھر بھی مستور ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے خطباء و شعراء کے کاندھے پر ایک عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

خطباء اور شعراء کی ذمہ داری

الحمد للہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا ، امام علی علیہ السلام اور دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام کے خطبات کتابوں میں محفوظ ہیں لہٰذا اگر خطباء، علماء، اہلِ علم، ذاکرین وشعراء انہی خطبوں اور معصومین علیہم السلام کے فرامین کو شاعری اور ہنری زبان میں ڈھال دیں کہ اللہ نے ان کو قدرتِ سخن کی توفیق دی ہوئی ہے تو اس وقت ان کی عقیدت، دین کی حقیقت کے ساتھ مل کر ظاہر ہوجائے گی بجائے اس کے کہ اپنی طرف سے خود گھڑیں۔ اگر یہ عقیدت کے غلاف میں حقیقت کو لپیٹ کے پیش کریں تو لوگ عقیدتوں کے ساتھ

ساتھ حقیقتوں سے بھی آشنا ہو جائیں لیکن ایسا کام رائج نہیں ہے۔ مجالس میں کتاب کھول کر نہج البلاغہ سے خطبہ پڑھنا رائج نہیں ہے اور اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ بعض نے اظہار بھی کیا ہے اور ہماری گفتگو میں ایک عیب یہ نکالا کہ یہ کتاب سے دیکھ کر پڑھتے ہیں۔

ایک اچھی سنت

پاکستان میں کتاب کھول کر مصائب پڑھنے کا رواج نہیں ہے لیکن یہ کام انجام پانا چاہئے۔ میری دلی آرزو ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ اس کی توفیق دے اور یہ کام شروع ہو جائے۔ پاکستان میں یہ انوکھا کام لگے گا لیکن رہبر معظم آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ نے اس سنتِ حسنہ کا آغاز کیا ہے اور اہلِ منبر کو حکم دیا ہے کہ آپ بھی یہ کام کریں۔ وہ کام یہ ہے کہ آپ مصائب کی کتاب سے مستند مصائب پڑھیں۔ خود رہبرِ معظم نے جمعہ کے خطبہ میں سید ابن طاؤس کی مصائب کی کتاب لہوف کھول کر مصائب پڑھے۔ یہ مسلمات میں سے ہے کہ رہبرِ معظم جیسا فصیح وبلیغ خطیب کوئی بھی نہیں ہے۔ آپ بہت ہی اعلیٰ سطح کے خطیب ہیں لیکن چونکہ ہمیں فارسی نہیں آتی لہٰذا ہم ان چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

یہ آپ کے علم میں ہونا چاہئے کہ اس زمانے کے فنِ خطابت میں رہبر معظم سرِ فہرست شخصیت ہیں۔ ولی فقیہ کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے جب آپ امام جمعہ تھے حتیٰ انقلاب سے بھی پہلے معروف تھے۔ انقلاب سے پہلے انقلابی شخصیات میں صرف دو یا تین اس پائے کے خطیب تھے۔ ایک شہید مطہریؒ تھے، ایک رہبر معظم اور ایک اور شخصیت تھی کہ وہ پڑھے ہوئے تو حوزے کے تھے لیکن عبا قبا کی بجائے پتلون پہنتے تھے۔ جب یہ لوگ خطابت کرتے تھے تو گویا لوگوں کے اوپر ایک سحر طاری ہو جاتا تھا لیکن یہی اعلیٰ ترین سطح کا خطیب، مرجع تقلید، ولی فقیہ اور عالم وحکیم جب مصائبِ کربلا پڑھتے ہیں تو سید ابن طاؤسؒ کی مصائب کی کتاب کھول کر جملہ جملہ پڑھتے ہیں اور دوسرے خطیبوں سے کہا کہ بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اس طرح سے مصائب پڑھیں تاکہ سننے والوں کو بھی معلوم ہو کہ کیا پڑھ رہے ہیں، اپنی طرف سے نہیں

بنا رہے بلکہ حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ ایسا عملِ احسن ہے جو اس وقت رائج نہیں ہے چونکہ عوامی مزاج ابھی اس کام کے لئے تیار نہیں ہے۔ خدا کرے کہ ایک دن آئے اور یہ کام شروع ہو جائے کہ علماء وخطباء منبروں کے اوپر بجائے خود مضامین باندھنے کے خود کتاب کو ہی کھول کر سنائیں۔

کتاب سے پڑھنا آسان، گھڑنا مشکل

ایک مقام پر پاکستان کے معروف خطیب سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ آپ جو مجلس پڑھتے ہو یہ تو بہت آسان ہے اور ہم جو پڑھتے ہیں وہ بہت ہی مشکل ہے۔ میں نے کہا وہ کیسے؟! انہوں نے کہا: آپ کے لئے اس لئے آسان ہے کہ آپ کتاب پڑھ کے آجاتے ہو یا کتاب کھول کے سامنے جو کچھ کتاب میں ہے وہ پڑھ کے سنا دیتے ہو، لیکن ہمیں جو کچھ سنانا ہوتا ہے وہ سب خود سے بنانا ہوتا ہے، گھڑنا پڑتا ہے۔ اس کے اوپر بہت زیادہ ٹائم صرف ہوتا ہے اور بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ میں نے اس پر غور کیا تو بات کسی حد تک صحیح تھی۔ کتاب کو کھول کے سنا دینے میں کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی لیکن خود مجلس تیار کرنے میں زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً کربلا کی داستان کتاب سے پڑھنے میں زیادہ محنت نہیں ہوتی لیکن کربلا کے متعلق الگ سے ایک داستان بنانے میں انسان کو بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور تخیل سے کام لینا پڑتا ہے۔

اب یہ کام آسان بھی ہے اور ضروری بھی کہ اگر ہم اپنی بصیرت سے جلوۂ فاطمیہؑ دیکھنا چاہتے ہیں تو خود بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کو خطاب کا موقع فراہم کریں۔ بی بی سلام اللہ علیہا خطاب فرمائیں اور ہم سنیں۔ وہ حقیقت جو خداوند تبارک وتعالیٰ نے اس ہستی کے اندر رکھی ہے زبانِ مبارکِ حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا سے ظاہر ہو رہی ہے۔ جس طرح نہج البلاغہ کے خطبات شخصیت وحقیقتِ علویؑ کی ترجمانی کر رہے ہیں اسی طرح خطبہ فاطمیہؑ عظمتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی عکاسی کر رہا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام وجنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کفوِ باہمی

یہ حدیث ہم نے کثرت سے سنی ہے کہ اگر خدا علی علیہ السلام کو خلق نہ کرتا تو فاطمہ سلام اللہ علیہا کا کوئی کفونہیں تھا:

لَوْ لَمْ يَخْلُقِ اللهُ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ مَا كَانَ لِفَاطِمَةَ كُفْو ...... [1]

یہ مطلب دوطرفہ ہے یعنی اگر سیدہ سلام اللہ علیہا نہ ہوتیں تو علی علیہ السلام کا بھی کوئی کفونہیں تھا۔ اسے ہم عموماً فقط رشتہ ازدواج کی حد تک سمجھتے ہیں۔ اب ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے اور بھی متعدد شادیاں کیں جن سے اولاد بھی ہوئی تو کیا وہ محترم و بزرگوار خواتین امیرالمومنین علیہ السلام کی کفونہیں تھیں؟ کفو کی ایک اصطلاح فقہ میں ازدواج کے موضوع میں استعمال ہوتی ہے لیکن یہ جملہ جو جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی شان میں کہا جاتا ہے کہ اگر علی علیہ السلام نہ ہوتے تو سیدہ سلام اللہ علیہا کا کوئی کفونہیں تھا صرف امرِ ازدواج کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

ہمسری کے غلط معیارات

آج ہم اپنے معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ لوگوں نے خود سے اپنے لئے کفو کا ایک معیار قائم کرلیا ہے جو کہ نادرست، غلط، باطل اور چہ بسا حرام ہے۔ شادی اور ازدواج کے مسئلے میں ہمارا اپنا قائم کردہ معیارِ کفو بہت سارے پہلوؤں سے غلط، باطل اور ناجائز ہے۔ قومیت، رنگت، مال و دولت، علاقائیت وزبان کی شرط رکھنا اور ظاہری و مادی امور کو کفو کا معیار قرار دینا باطل معیارات ہیں۔

[1] ......(بحار الأنوار- الشيخ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء۴۳، صفحه۱۰۷)(مناقب آل أبی طالبؑ- الحافظ ابن شهرآشوب مشير الدين أبی عبدالله محمد بن علی بن شهر اشوب ابن أبی نصر بن أبی حبيشی السروی المازندرانیؒ، المتوفی: سنة۵۸۸ھ، الجزء۲، صفحه۲۹)

کفو کا معیار

کفو ضروری ہے لیکن کفو سے مراد شخصیت کا ہمسر و ہم پلہ ہونا ہے۔امرِ ازدواج میں آپ فقط شخصیت کو دیکھیں۔اگر مرد ہے تو خاتون کی شخصیت دیکھے اور اگر خاتون ہے تو وہ مرد کی شخصیت دیکھے۔اگر ان کی شخصیت کے اندر برابری و ہمسری کا معیار پایا جاتا ہے تو یہ کفو ہیں اور اگر یہ معیار نہیں پایا جاتا تو کفو نہیں ہیں۔اگر ایک پاکیزہ خاتون سید گھرانے سے ہو اور ایک بے کردار لڑکا سید گھرانے سے تو یہ کفو نہیں ہیں، چونکہ دونوں کی شخصیت برابر نہیں ہے۔

پس بہت سارے لوگوں کے آپس میں رشتے ہو گئے ہیں لیکن ان کے درمیان ہمسری نہیں ہے۔ایک ہی قوم و خاندان سے ہونے کے باوجود کفو و ہمسر نہیں ہیں۔ہمسر یعنی جب دونوں کھڑے ہوں تو ایک کا سر نیچے اور ایک کا اوپر نہ ہو بلکہ دونوں ایک جیسے لگتے ہوں۔یہ ہمسری جسمانی وقد کاٹھ کے لحاظ سے نہیں بلکہ شخصیت کے لحاظ سے ہے۔یعنی جب دونوں شخصیتیں سامنے آئیں تو جو کمالات ایک شخصیت میں ہیں وہی کمالات دوسرے کی شخصیت میں پائے جاتے ہوں، جو پاکیزگی ایک کی شخصیت میں ہے وہی دوسرے کی شخصیت میں ہو۔ممکن ہے کہ ایک امیر خاندان سے ہو اور ایک فقیر خاندان سے لیکن شخصیت میں دونوں ایک دوسرے کے ہمسر ہوں۔یہ ہمسری صرف امیر المومنین علیہ السلام اور جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا میں نظر آتی ہے۔

کفویت کا قرآنی معیار

قرآنِ کریم کفو کا معیار بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَلْخَبِيْثَاتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ...... [1]

خبیث چیزیں خبیث لوگوں کے لئے ہیں اور خبیث افراد خبیث باتوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ

---

[1]......(سورۃالنور، آیہ ۲۶)

باتیں پاکیزہ لوگوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ افراد پاکیزہ باتوں کے لئے ہیں......

پاکیزہ کردار و پاکیزہ سیرتیں، پاکیزہ انسانوں کے لئے ہیں اور بدکردار بدکرداروں کے لئے ہیں لیکن ہم یہ معیار نہیں دیکھتے اور اسے خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ہم پاک کا رشتہ خبیث سے اور خبیث کا رشتہ پاک سے کر دیتے ہیں، پھر دلیل یہ دیتے ہیں کہ پاکیزہ خاتون کسی بڑے خاندان سے نہیں ہے، وہ ہمارے قبیلے، ہماری شاخ اور ہمارے سلسلے سے نہیں ہے۔ بہت سارے لوگ جب امرِ ازدواج کے متعلق یہ موضوع چھیڑتے ہیں تو ساتھ افسوسناک شرائط بھی ذکر کرتے ہیں کہ حتماً یہ شرائط ان کے اندر موجود ہونی چاہئیں۔

بہرکیف جس معنیٰ میں حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو کفوِ علی علیہ السلام کہا گیا ہے وہ فقط ازدواج کے اندر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ ہمسری اور ہم مرتبہ وہم پلہ ہونا شخصیت کے لحاظ سے ہے۔شخصیتِ علی علیہ السلام وشخصیتِ سیدہ سلام اللہ علیہا نہ صرف ازدواج کے لئے آپس میں موزوں ہیں بلکہ عالمِ بشریت میں کوئی بھی دو شخصیتیں اتنی قریب نظر نہیں آتیں جتنی امیرالمومنین علیہ السلام وحضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کی شخصیتوں میں قربت پائی جاتی ہے۔

قرآن واہل بیت علیہم السلام میں قربت

جس طرح حدیثِ ثقلین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن وعترت کا تعلق بیان فرمایا تو اس سے مراد فقط جسمانی تعلق نہیں ہے کہ اہلبیت علیہم السلام کے ہر فرد کے ہاتھ میں قرآن کی ایک جلد ہوگی بلکہ قرآن و اہلبیت علیہم السلام کا یہ تعلق و ارتباط اور عدمِ افتراق جمیع جہات سے ہے۔ یعنی جو پہلو قرآن کے ہیں وہی اہلبیت علیہم السلام کے ہیں، جو پہلو قرآن میں ہیں وہ سارے اہلبیت علیہم السلام میں موجود ہیں، جو ہدایت قرآن دے رہا ہے وہی اہلبیت علیہم السلام دے رہے ہیں، جن راہوں سے قرآن روک رہا ہے انہیں راہوں سے اہلبیت علیہم السلام روک رہے ہیں، جو شرائط قرآن سے تمسک کی ہیں وہی شرائط اہلبیت علیہم السلام کے ساتھ تمسک کی ہیں، جو چیز باعثِ مہجوریت قرآن بنتی ہے، وہی باعثِ مہجوریتِ اہلبیت علیہم السلام بھی بنتی ہے حتیٰ یہ مصائب میں بھی ایک ساتھ ہیں یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ مصائب میں اہلبیت علیہم السلام مظلوم واقع ہوئے ہوں اور قرآن نہ ہوا ہو۔ان میں اس حد

تک بھی جدائی ممکن نہیں ہے۔قرآن واہلبیت علیہم السلام میں جامع ارتباط موجود ہے۔

روایت میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے فاطمہؑ میرے پاس ابھی جبرئیلؑ نازل ہوئے ہیں اور کہا ہے کہ یا رسول اللہ آج فقط زہراءؑ کے لئے آیا ہوں، پروردگار نے فرمایا ہے کہ زہراءؑ سے پوچھو کیا مانگنا ہے؟ رب یہ وعدہ کرتا ہے کہ زہراءؑ جو بھی مانگے گی اسے پورا کروں گا۔

حضرتِ زہراء سلام اللہ علیہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تین چیزوں کی گزارش کی کہ جن میں سے ایک یہی تھی کہ مجھے تلاوتِ قرآن چاہئے۔ بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کو تلاوتِ قرآن سے بہت محبت تھی حتیٰ کہ جب آپؑ وصیت کر رہی تھیں تو امیر المومنین علیہ السلام سے کہہ رہی تھیں کہ اے علیؑ! جب مجھے دفن کر و تو ہر روز میری قبر پہ آکر قرآن ضرور پڑھنا۔دفن کے بعد بھی مجھے قرآن سنانا۔

پس چونکہ امیر المومنین علیہ السلام وجنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا دونوں شخصیات نے ایک ہی آغوش میں پرورش پائی، دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سائے میں پلے ہیں لہٰذا دونوں کی ایک جیسی شخصیت بنی ہے۔اس لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ سوائے سیدہ سلام اللہ علیہا کے کوئی ہمسرِ علیؑ اور سوائے علی علیہ السلام کے کوئی ہمسرِ زہراءؑ ہو۔ یہ شخصیتوں کا تناسب ہے۔

حضرت علی علیہ السلام وجنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے خطبات کے اندر دونوں شخصیات کے جلوے یکساں نظر آتے ہیں۔اسی لئے جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کے خطبات کے بارے میں بعض کو شک گزرا۔جب جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے یہ خطبہ مسجد نبوی میں بیان فرمایا تو وہیں پر کسی نے یہ کہا کہ یہ نسوانی تفکر نہیں ہے، یہ زنانہ باتیں نہیں ہیں بلکہ رات کو بیٹھ کر علی علیہ السلام نے سیدہ سلام اللہ علیہا کو یہ خطبہ تعلیم دیا ہے اور انہوں نے صبح آکر سنا دیا ہے۔ اب یہ شخص جو بھی تھا لیکن کسی حد تک مقامِ علویؑ سے آشنا تھا۔وہ ایسے خطبات کی علی علیہ السلام سے توقع رکھتا تھا لیکن سیدہ سلام اللہ علیہا سے اس کو یہ توقع نہیں تھی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ مقامِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے آشنا نہیں تھا اور جس طرح لوگ جنابِ سید سلام اللہ علیہا کے مقام ومرتبہ سے نابلد ہیں اسی طرح جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی عظیم ماں کے مقام و منزلت سے بھی ناآشنا ہیں۔

باکمال ماں کی باکمال بیٹی

حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا اس عظیم ماں کی بیٹی ہیں جو فضائل و کمالات میں سب امہات المومنین سے بڑھ کر تھیں۔ حضرتِ خدیجہ سلام اللہ علیہا کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؑ کو بہت یاد کیا کرتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر جنابِ خدیجہ سلام اللہ علیہا کا ذکر اپنی ازواج سے کیا کرتے تھے اور خصوصاً مدینہ آنے کے بعد ان کی بہت تعریفیں کرتے تھے۔ عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ تصور ہے کہ جنابِ خدیجہ سلام اللہ علیہا کے پاس چونکہ پیسے بہت تھے لہٰذا بہت باکمال تھیں۔ انہیں ہر پیسے والا بہت باکمال نظر آتا ہے اور سارا کمال اُس کے مال کے اندر ہے جبکہ مال اور کمال دو الگ چیزیں ہیں۔ حضرتِ خدیجہ سلام اللہ علیہا کی عظمت مال کی وجہ سے نہیں بلکہ کمال کی وجہ سے تھی اور وہ کمال لوگوں کو نہیں بلکہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کے مزاج مختلف تھے لہٰذا قرآنِ مجید نے بھی ازواجِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کئی لہجوں سے خطاب کیا اور اُنہیں اپنے مزاجی کاموں سے روکا۔ قرآن نے رہنمائی کی کہ آپ کو حریم رسالتؐ میں رہنے کا ادب سیکھنا چاہیے۔ ارشاد ہوا:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ...... [1]

اے نبیؐ کی بیویو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو......

اے اُمہاتِ مومنین آپ معمولی خواتین جیسی نہیں ہو، آپ حرمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو لہٰذا قرآن نے اُن کو آدابِ زندگی سکھائے کہ کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہے لیکن بعض اوقات اُن سے ایسی حرکتیں ہو جاتی تھیں جس پر بعض اوقات قرآن نے شدت دکھائی۔ ان کے عمل پر اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ردِعمل دکھایا کرتے تھے۔

تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب جنابِ خدیجہ سلام اللہ علیہا کی تعریف

---

[1] ......(سورۃ الاحزاب، آیہ ۳۲)

فرمارہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک زوجہ محترمہ نے بہت برا مانا۔آپ نے جوں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے حضرتِ خدیجہ سلام اللہ علیہا کا نام سنا تو دامنِ ادب کو چھوڑ کر ردِعمل دکھایا۔ کہنے لگیں کہ یارسول اللہؐ! آپ کب تک اس بڑھیا کو یاد کرتے رہیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت طیش وغضب آیا اور آپ ناراض و ناراحت ہوئے۔آپؐ نے انہیں جواب دیا کہ قسم بخدا! اُس سے بہتر زوجہ مجھے نہیں ملی۔ وہ مجھ پراس وقت ایمان لائی کہ جب کوئی بھی ایمان نہیں لایا تھا۔اس نے میرے دعوے کی اس وقت تصدیق کی جب اورلوگ تکذیب کررہے تھے۔اس نے اپنے مال میں مجھے شریک کیا کہ جب سب لوگوں نے مجھے محروم کردیا تھا۔خدانے اس سے مجھے اولاددی درآنحالیکہ میری کسی اورزوجہ سے اولادنہیں ہوئی۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیغامِ خدا کو مکہ میں عام کیا تو سب سے پہلی ہستی جسے پیغامِ خدا سمجھ آیا وہ جنابِ خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا ہیں۔حضرتِ خدیجہ سلام اللہ علیہا بصیرتِ اعلیٰ و عالیہ کی حامل ہیں کہ انہوں نے سب سے پہلے پیغامِ خدا کو سمجھا اور قبول کیا۔انہوں نے دینِ خدا کو قبول کرنے کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معجزہ طلب نہیں کیا۔حضرتِ خدیجہ سلام اللہ علیہا وہ عظیم ہستی ہیں کہ جب کوئی بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دینے والانہیں تھا آپ نے اُس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مال زیادہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ بصیرت و درایت ،فہم وشعور، جرأت، دلیری وشجاعتِ خدیجہؑ کی وجہ ہے ان کی تعظیم وتکریم کرتے تھے اور وہی صفات جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا میں تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک اہمیتِ مقامِ فاطمہ سلام اللہ علیہا

مقامِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آشنا تھے۔حقیقتِ فاطمیہؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کاملاً واضح وروشن تھی لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں ایک معمول جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی شخصیت کا تعارف قرار دیا تھا۔آپؐ ہر مناسبت سے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی شخصیت کو متعارف کرواتے تھے۔آپؐ بیٹی کو متعارف نہیں کروارہے تھے، یہ نہیں فرمارہے تھے کہ فاطمہ سلام اللہ علیہا میری بیٹی ہے کیونکہ یہ تو سب کو معلوم

تھا اور اس میں تو کسی کو شک و شبہ نہیں تھا لہٰذا اس کو بتلانے اور جتلانے کی ضرورت ہی نہیں تھی لیکن لوگوں کے لئے شخصیتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا ناشناختہ تھی اس لئے آپ حکمِ الٰہی سے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا تعارف کرواتے تھے چونکہ یہ قانون ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو بھی حکم فرماتے وہ حکمِ خدا سے ہی فرماتے ہیں۔

حتیٰ روایات میں ہے کہ بی بی سلام اللہ علیہا کا نام بھی حکم خدا سے ہی رکھا گیا ہے۔ جب آپ کی ولادت ہوئی تو حضرت جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبارک دی پھر فرمایا کہ اللہ نے اس کا نام ''فاطمہ'' تجویز کیا ہے۔ اس روز سے اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعے راہنمائی ہوتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی تربیت و پرورش بھی کرتے اور ہر مناسبت سے امت کو مقامِ فاطمہ سلام اللہ علیہا سے آگاہ بھی کرتے تھے۔ جب بی بی سلام اللہ علیہا تشریف لاتیں تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔

امام علی علیہ السلام کے نزدیک مقامِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ہمارے لئے اس عمل اور کیفیت کا ادراک اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت و مقام کو پہچانتے ہوں۔ ہم نے آپؐ کی ہستی کو بہت ہی سرسری لیا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ شخصیت کس عظمت کی مالک ہے۔

یہ وہ شخصیت ہیں جن کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام کا فرمانا ہے:

إِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ مِنْ عَبِيْدِ مُحَمَّدٍ...... [1]

بے شک علی ابن ابی طالبؑ، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلاموں میں سے ایک غلام ہے۔

علی علیہ السلام فخر کرتے تھے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش، سایہ اور آغوش نصیب ہوئی ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام کی شخصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کا ایک جلوہ و تجلی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

---

[1]...... (أصول الكافی - شیخ یعقوب کلینیؒ، متوفی ۳۲۹ھ، الجزء ۱، صفحہ ۹۰، ناشر: دار کتب اسلامیہ، تہران، ایران، طبعہ رابعہ، ۱۴۰۷ھ) (توحید - الصدوقؒ)

خُلِقْتُ أَنَا وَ عَلِيٌّ مِنْ نُوْرٍ وَاحِدٍ......[1]

میں اور علی ایک ہی نور سے خلق ہوئے ہیں......

أَنَا وَ عَلِيٌّ مِنْ شَجَرَةٍ وَاحِدَةٍ......[2]

میں اور علی ایک ہی شجر سے ہیں......

حضرتِ علی علیہ السلام شخصیتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک سایہ ہیں۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کی ایک جھلک علی علیہ السلام کی شخصیت کی صورت میں پروان چڑھی۔ بعض علمائے اہلِ سنت نے یہ اقرار کیا ہے کہ خدانخواستہ، العیاذ باللہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کے اثبات کے لئے کوئی اور معجزہ نہ ہوتا اور فقط علی علیہ السلام موجود ہوتے تو ہم ایمان لے آتے کہ یہ رسولِ خداؐ ہیں، چونکہ جس شخصیت کے زیرِ سایہ علی علیہ السلام جیسی شخصیت پروان چڑھتی ہے وہ کوئی معمولی انسان نہیں ہوسکتا۔

یہ ہستی کائنات کے اندر صفاتِ خدا کا مظہرِ جامع اور خلیفہ عالیٰ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے لیکن جب جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا اس کائنات میں تشریف لاتی ہیں تو آپؐ اس چھوٹی سی بچی کے احترام میں اٹھ کر کھڑے ہوجاتے تھے۔ آپؐ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو اٹھا لیتے، بوسہ لیتے اور سب کے سامنے تعظیم وتکریم کرتے تھے تاکہ امتکو معلوم ہوجائے کہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی عزت ومقام ایک بیٹی سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔

تعارفِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے باوجود کفرانِ مقامِ فاطمہ سلام اللہ علیہا

باوجود اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمر بھر امت کے سامنے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی عظمت بیان فرمائی لیکن مقامِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی طرف امت متوجہ نہیں ہوئی اور فاطمہ سلام اللہ علیہا ایک حقیقتِ ناشناختہ ہی رہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی مقامِ سیدہ سلام اللہ علیہا خود ایک مفصل موضوع ہے جس کیلئے ایک الگ فرصت

---

[1]......(الخصال۔ الصدوق أبی جعفر محمد بن علی بن الحسین بن بابویه القمی، المتوفی: ۳۸۱ھ ج ۱، ص: ۳۱)

[2]......(الخصال۔ الصدوق أبی جعفر محمد بن علی بن الحسین بن بابویه القمی، المتوفی: ۳۸۱ھ ج ۱، ص: ۲۱)

درکار ہے۔ مثلاً جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رویہ، فرامین، طور طریقے، سیرت، سنت وغیرہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تبلیغ، جنگ یا غزوے کیلئے مدینہ سے باہر جاتے تو واپسی پر سب سے پہلے درِ بتول پر حاضر ہوتے اور درود پڑھتے تھے، یہ آپؐ کا عام طریقہ تھا کہ در بتول پر حاضر ہو کر فرمایا کرتے تھے:

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْبَيْتِ ...... [1]

اے اہل بیت آپ پر سلام ہو......

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عمل میں بہت حکمت پوشیدہ تھی۔ خدا کا حکم تھا کہ اپنے گھر جانے سے پہلے حتیٰ مسجد میں جانے سے پہلے فاطمہ سلام اللہ علیہا کے گھر کے سامنے آ کر سلام پڑھیں۔ یہ صرف ایک باپ کے احساسات نہیں تھے بلکہ حکمِ خدا سے تجلی گاہِ نورِ خدا کے لئے ہادیِ امت کے رویے تھے۔ تاکہ اس سے لوگوں کو مقامِ فاطمہ سلام اللہ علیہا پتا چل جائے لیکن لوگوں نے دھیان نہیں دیا اور جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کا یہ مقامِ پوشیدہ رہا۔

حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کی عظمت و مقام سے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سی احادیث ذکر فرمائی ہیں جن میں سے چند ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں:

فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْهَا مَنْ اٰذَاهَا فَقَدْ اٰذَانِيْ وَمَنْ اٰذَانِيْ فَقَدْ اٰذَى اللّٰهَ وَمَنْ اٰذَاهَا بَعْدَ مَوْتِيْ كَانَ كَمَنْ اٰذَاهَا فِيْ حَيَاتِيْ وَمَنْ اٰذَاهَا فِيْ حَيَاتِيْ كَانَ كَمَنْ اٰذَاهَا بَعْدَ مَوْتِيْ...... [2]

فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے اور میں فاطمہؑ سے ہوں، پس جس نے فاطمہؑ کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے اللہ کو اذیت دی اور جس نے میری موت کے بعد اسے اذیت دی گویا اس نے میری حیات میں اسے اذیت دی اور جس نے میری حیات میں اسے اذیت دی گویا اس نے میری موت کے بعد اسے اذیت دی۔

فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّيْ مَنْ سَرَّهَا فَقَدْ سَرَّنِيْ وَمَنْ سَاءَهَا فَقَدْ سَاءَنِيْ ...... [3]

1...... (كشف الغمة - العلامة المحقق أبي الحسن علي بن عيسى بن أبي الفتح الإربلیؒ) (تلخيص المتشابه فی الرسم - أبو بكر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی الخطيب البغدادی، المتوفی: ۴۶۳ھ)

2...... (علل الشرايع - الشيخ الصدوقؒ، الجزء ۱، صفحه ۲۲۶)

3...... (الأمالی للمفيدؒ، الجزء ۱، صفحه ۱۶۴)

فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے، جس نے اسے خوش کیا اس نے مجھے خوش کیا اور جس نے اسے غمگین کیا اس نے مجھے غمگین کیا......

فَاطِمَةُ سَيِّدَةُ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ...... [1]

فاطمہؑ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں......

اِبْنَتِیْ فَاطِمَةُ فَاِنَّهَا سَيِّدَةُ نِسَاءِ الْعَالَمِيْنَ مِنَ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ...... [2]

میری بیٹی فاطمہؑ یقیناً تمام عالمین کی عورتوں کی سردار ہے چاہے وہ عورتیں اولین میں سے ہوں یا آخرین میں سے......

يَا فَاطِمَةُ، أَلَا تَرْضَيْنَ أَنْ تَكُوْنِیْ سَيِّدَةَ نِسَاءِ الْعَالَمِيْنَ وَ سَيِّدَةَ نِسَاءِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَ سَيِّدَةَ نِسَاءِ الْمُؤْمِنِيْنَ؟...... [3]

اے فاطمہؑ! کیا آپ اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ میں آپ کو عالمین کی عورتوں کی سردار، امت کی عورتوں کی سردار اور مومنین کی عورتوں کی سردار بناؤں؟

إِنَّمَا فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِّنِّیْ يُؤْذِيْنِیْ مَا اٰذَاهَا...... [4]

۱......(الخصال-الشيخ الجليل الاقدم الصدوق أبی جعفر محمد بن علی بن الحسين بن بابويه القمیؒ، المتوفی: ۳۸۱ھ) (صحيح البخاری-ابو عبد الله محمد بن إسماعيل بن إبراهيم بن المغيرة البخاری، باب: مناقب فاطمه عليها السلام، الجزء ۱۳، صفحه ۵۷)

۲......(بحار الأنوار-الشيخ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۲۸، صفحه ۳۸، والجزء ۴۳، صفحه ۱۷۲) (إرشاد القلوب-الحسن بن أبی الحسن محمد الدّيلمیؒ، من أعلام القرن الثّامن) (مستدرك سفينة البحار- الشيخ علي النمازي، بحواله: أمالي الصدوقؒ) (ميزان الحكمة-الريشهری، الجزء ۵، صفحه ۲۵۱) (فضائل-ابي الفضل سديد الدين القمیؒ) (تفسير نور الثقلين) (روضة الواعظين-الفتال النيسابوری، الشهيد فی سنة ۵۰۸ھ)

۳......(المستدرك على الصحيحين-أبو عبد اللّٰه الحاكم محمد بن عبد اللّٰه بن محمد بن حمدويه بن نعيم بن الحكم الضبی الطهمانی النيسابوری المعروف بابن البيع، المتوفی: ۴۰۵ھ، الجزء ۳، صفحه ۱۷۰)

۴......(صحيح مسلم-أبو الحسين مسلم بن الحجاج باب: فضائل فاطمه بنت النبی عَلَيْهِ السَّلام، الجزء ۷، صفحه ۱۴۱)

یقیناً فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے جس نے اسے اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی......

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآله سَلَّمَ لِفَاطِمَةَ: إِنَّ اللّٰهَ يَغْضَبُ لِغَضَبِكِ وَيَرْضٰى لِرِضَاكِ...... [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ سلام اللہ علیہا کے بارے میں فرمایا: یقیناً اللہ غضبناک ہوتا ہے تیرے غضبناک ہونے پر اور راضی ہوتا ہے تیری رضا پر......

إِنَّ اللّٰهَ يَغْضِبُ لِغَضَبِ فَاطِمَةَ، وَيَرْضٰى لِرِضَاهَا...... [2]

یقیناً اللہ تعالیٰ فاطمہؑ کے غضبناک ہونے پر غضبناک ہوتا ہے اور فاطمہؑ کی رضا پر راضی ہوتا ہے......

إِنَّمَا فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّيْ يُؤْذِيْنِيْ مَا اٰذَاهَا وَيُنْصِبُنِيْ مَا أَنْصَبَهَا...... [3]

بے شک فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے، جس نے اسے اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے اسے تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی......

فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّيْ، فَمَنْ أَغْضَبَهَا أَغْضَبَنِيْ...... [4]

فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے، جس نے اسے غضبناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا......

---

[1]...... (المستدرك على الصحيحين - أبو عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله بن محمد بن حمدويه بن نعيم بن الحكم الضبي الطهماني النيسابوري المعروف بابن البيع، المتوفى: ۴۰۵ھ، الجزء ۳، صفحه ۱۶۷) (المعجم الكبير - سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي الشامي، أبو القاسم الطبراني، المتوفى: ۳۶۰ھ، الجزء ۱، صفحه ۱۰۸) (كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال - علاء الدين علي بن حسام الدين المتقي الهندي البرهان فوري، المتوفى: ۹۷۵ھ، الجزء ۱۳، صفحه ۶۷۴)

[2]...... (عيون اخبار الرضاؑ - الشيخ الصدوقؒ) (بحار الانوار - علامه مجلسیؒ، الجزء ۲۱، صفحه ۲۷۹)

[3]...... (سنن الترمذي - الترمذي، أبو عيسى، المتوفى: ۲۷۹ھ)

[4]...... (صحيح البخاري - ابو عبد الله محمد بن إسماعيل بن إبراهيم بن المغيرة البخاري، الجزء ۹، صفحه ۲۱۰)

فَاطِمَةُ خِيرَةُ اللهِ...... ۱ے

فاطمہؑ اللہ کی پسندیدہ ہیں......

لیکن اس عظیم تعارفِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے باوجود امت کے ہاتھوں حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو وہ مظالم جھیلنے پڑے کہ خود جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو کہنا پڑا:

صُبَّتْ عَلَيَّ مَصَائِبُ لَوْ أَنَّهَا

صُبَّتْ عَلَى الْأَيَّامِ صِرْنَ لَيَالِيَا...... ۲ے

مجھ پر اتنی مصیبتیں پڑیں کہ اگر یہ مصیبتیں روشن دنوں پر آپڑتیں تو وہ سیاہ راتوں میں تبدیل ہوجاتے......

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، منبعِ علمِ علی علیہ السلام و فاطمہ سلام اللہ علیہا

منبعِ علمِ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا و علی علیہ السلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی تعلیمات تھیں۔ امیر المومنین علیہ السلام کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ہر روز ایک مخصوص کلاس ہوتی تھی جو صرف اور صرف علی علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان برقرار ہوتی تھی۔ سارا دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ و نومسلم لوگوں کو ہدایت و راہنمائی کرتے لیکن رات کا ایک مخصوص وقت تھا جس میں فقط امیر المومنین علیہ السلام کے ساتھ تنہائی میں خلوت کرتے۔ یہ نشست مختلف جگہوں پر منعقد ہوتی تھی۔ کبھی حجراتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہوتی چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ازواج کے مختلف حجرات تھے لہٰذا جب امیر المومنین علیہ السلام آتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ام المومنینؓ کو بھی حکم دیتے کہ آپ باہر چلی جائیں۔ ان کا بڑا اصرار ہوتا کہ ہم بھی اس محفل و نشست میں شریک ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے کہ

۱ے......(تاریخ بغداد-الخطیب البغدادی، المتوفی:۴۶۳ھ، الجزء ۱، صفحہ ۲۷۴)(الجواهر السنية في الأحاديث القدسية-الحر العاملیؒ)

۲ے......(بحار الانوار-علامہ مجلسیؒ، الجزء ۷۹، صفحہ ۱۰۶)(مناقب آل أبی طالبؑ-الحافظ ابن شهر آشوب، المازندرانیؒ، المتوفی:۵۸۸ھ، الجزء ۱، صفحہ ۲۵۰)

آپ کا مقام بڑا عظیم ہے لیکن یہ نشست فقط علی علیہ السلام کے ساتھ ہے۔ کبھی کبھار یہ نشست امیر المومنین علیہ السلام کے گھر جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کے حجرے میں ہوتی۔ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا ساتھ بیٹھتی تھیں اور اگر نہ ہوتیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلا لیتے کہ آپ بھی آ جائیں۔ پس منبع علم جناب سیدہؑ وہی ہے جو منبعِ علمِ علیؑ ہے۔ دونوں وحی کے علم سے سرشار و سیراب ہیں۔ ان ہستیوں کی پرورش وحی کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ مقامِ فاطمیؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے امت سنتی رہی لیکن اسے سمجھنے کیلئے کوئی توجہ نہیں کی لیکن آج وہی مقام، جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے خطبے میں ان کے سامنے جلوہ گر ہو رہا ہے۔ امام علی علیہ السلام کی ہمسری و کفویت جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے خطبے کے اندر اس قدر نمایاں ہے کہ لوگوں کو شک میں ڈال رہی ہے کہ آیا یہ علی علیہ السلام کا خطبہ ہے یا زہراء سلام اللہ علیہا کا؟ چونکہ جس باب سے علی علیہ السلام نے سیکھا اسی باب سے سیدہ سلام اللہ علیہا نے سیکھا ہے۔

جس طرح امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ

أَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِيٌّ بَابُهَا......[1]

میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔

تو دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے:

فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِّنِّیْ......

فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے......

یعنی فاطمہ سلام اللہ علیہا شہرِ علم اور مدینہ حکمت کا حصہ ہے۔ پس بابِ علمِ نبیؐ ہو یا پارہِ تن نبیؐ اگر ان کی زبانِ مبارک سے یہ معارف ادا ہوتے ہیں تو پھر لوگوں کو یہ سوچنے کا حق پہنچتا ہے کہ یہ علی علیہ السلام کا خطبہ ہے یا فاطمہ سلام اللہ علیہا کا؟ لوگ اگر مقامِ فاطمیہؑ سے آشنا ہوتے اور نہج البلاغہ کے خطبے بھی پڑھ لیتے تو انہیں یقین ہو جاتا۔

---

[1]......(تفسیر مجمع البیان-أبی علی الفضل بن الحسن الطبرسیؒ، الجزء ۲، صفحہ ۲۲) (مرآۃ العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ - العلامۃ المجلسیؒ، الجزء ۱، صفحہ ۴۵۲) (المستدرک علی الصحیحین - محمد بن عبداللہ أبو عبداللہ الحاکم النیسابوری، الجزء ۳، صفحہ ۱۳۳)

بندگی خدا، معیارِ کمال و مقامِ انسان

کفویت اور ہمسری کا ایک نمونہ مقامِ معرفت و بندگی ہے۔ انسان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو مقامِ بندگی و قربِ خدا ہے۔ اگر ہم شواہد کے ساتھ خطباتِ امیر المومنین علیہ السلام و خطباتِ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کا مطالعہ کریں تو یہ ہمسری صاف نظر آتی ہے۔

نہج البلاغہ میں پہلا خطبہ توحید، معرفتِ خدا و بندگیِ خداوند تبارک و تعالیٰ کے متعلق ہے۔ مقامِ بندگی و عبودیت انسانی کمالات و مقامات کا معیار ہے۔ درحقیقت خدا نے انسان کے کمال کا سارا راز بندگی و عبودیت کے اندر رکھ دیا ہے۔ جو مقامِ بندگی میں سب سے آگے ہوگا وہ کمال میں بھی سب سے آگے ہوگا اور جو مقامِ بندگی میں پیچھے ہے، وہ کمال میں بھی سب سے پیچھے ہے۔

مقامِ بندگیٔ علی علیہ السلام اور ابن ابی الحدید کا اعتراف

ابن ابی الحدید نے جو اہلِ سنت کے ایک بڑے جید عالم اور معروف شخصیت ہیں، انہوں نے نہج البلاغہ کی بہت ہی خوبصورت تفسیر لکھی ہے۔ اگرچہ یہ تفسیر اپنے مذہبی نظریات کے تناظر میں لکھی ہے یعنی ان سے یہ توقع نہیں ہونی چاہئے کہ انہوں نے غیر جانبدارانہ و یک طرفہ تفسیر لکھی ہے بلکہ بعض مقامات پر ان کے اپنے عقیدتی مسائل نمایاں ہوجاتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی کہا جاسکتا ہے کہ نہج البلاغہ کی بہترین تفسیروں میں سے ایک ابن ابی الحدید کی تفسیر ہے۔ اس تفسیر میں حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کی بارگاہ میں ابن ابی الحدید نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ابن ابی الحدید جالب شخصیت ہیں۔ آغازِ کتاب میں امیر المومنین علیہ السلام کے لئے لکھتے ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ......قَدَّمَ الْمَفْضُوْلَ عَلَی الْاَفْضَلِ...... [1]

حمد ہے اس خدا کی جس نے مفضول کو افضل پر ترجیح دی اور مقدم کیا......

---

[1]......(شرح نہج البلاغة - ابن ابي الحديد، المقدمة الكتاب)

یعنی بڑے فضیلت والے پر چھوٹے فضیلت والے کو ترجیح دی۔ان کا اشارہ خلافت کی طرف ہے چونکہ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ جو کچھ ہوا ہے وہ خدا نے ہی کیا ہے لہٰذا امیر المومنین علیہ السلام کی شان بھی بیان کر گئے اور اپنا عقیدہ بھی۔خطبہ اولِ نہج البلاغہ میں اقرار کرتے ہیں کہ کچھ میدان ایسے ہیں کہ جہاں امیر المومنین علیہ السلام بھی نظر آتے ہیں اور پیچھے کچھ فاصلے پر دوسرے بھی نظر آتے ہیں۔شجاعت کا تذکرہ بھی کیا کہ امیر المومنین علیہ السلام میدان شجاعت میں نظر آتے ہیں اور کچھ تھوڑے سے فاصلے پر پیچھے کچھ اور لوگ بھی نظر آتے ہیں۔تاریخ میں بڑے بڑے شجاع رہے ہیں۔اسی طرح سخاوت اور دیگر میدانوں کے بارے میں بھی کہا کہ ان میدانوں میں امیر المومنین علیہ السلام بھی نظر آتے ہیں اور پیچھے کچھ فاصلے پر دوسرے بھی لیکن ابن ابی الحدید کا کہنا ہے کہ ایک میدان ایسا ہے جس میں فقط علی علیہ السلام نظر آتے ہیں لیکن دور دور تک کوئی علی علیہ السلام کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔وہ کونسا میدان ہے؟!

فرماتے ہیں کہ جب معرفتِ خدا و بندگیٔ خدا کا میدان شروع ہوجاتا ہے تو اس میدان میں فقط علی علیہ السلام نظر آتے ہیں، علی علیہ السلام سے کوسوں دور تک کوئی اور نظر نہیں آتا۔اگر ابن ابی الحدید نے خطیبوں اور ذاکروں سے علی علیہ السلام سنا ہوتا تو پھر علی علیہ السلام کچھ اور نظر آتے لیکن ابن ابی الحدید نے کلامِ علیؑ میں علی علیہ السلام کو دیکھا۔جب خطباتِ علیؑ میں علی علیہ السلام کی جھلک دیکھیں تو میدانِ عبودیت میں علی علیہ السلام تنہا نظر آتے ہیں اور یہی راز کمال وفضیلت ہے۔اگر اس میدان میں بھی کوئی ہمسرِ علیؑ نظر آتا ہے تو وہ فقط ذاتِ گرامی جناب سیدہ سلام اللہ علیہا ہیں۔جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا اپنے خطبہ نورانی کے اندر اپنی معرفت وحقیقتِ بندگی کی ایک جھلک دکھارہی ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ لوگ ابھی تک معرفتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے ابتدائی مرحلہ سے بھی دور ہیں اور اس کی وجہ وہ تعارف ہے جو انہیں جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے متعلق کروایا گیا ہے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے متعلق ہمارا ذہنی تصور

ہمیں دو رسمی و روایتی انداز سے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا تعارف کروایا گیا ہے۔ایک یہ ہے کہ جنابِ زہراء سلام اللہ علیہا کو تمہارے آنسوؤں کی ضرورت ہے، جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی ضرورت ہم سے یہ پوری

ہوتی ہے کہ ہم اُن کے بیٹے کے لئے روتے ہیں چونکہ اُن کو رونے والا کوئی نہیں ملتا لہٰذا وہ گلی گلی، گھر گھر دیکھ رہی ہیں کہ کون میرے بیٹے کو رونے والا ہے، جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا اس کائنات میں اس کے علاوہ کوئی اور مطلوب ومقصود نہیں ہے کہ کسی سرزمین پر میرے بیٹے کو رونے والے پیدا ہوجائیں، بی بی سلام اللہ علیہا کی ساری حسرت یہ ہے کہ لوگ روئیں اور مجھے ان کے رونے سے تسلی مل جائے، چنانچہ جب کوئی روتا ہے تو بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا کی ساری آرزوئیں پوری ہوجاتی ہیں اور پھر وہ دعا دے کر چلی جاتی ہیں یعنی سب سے زیادہ کمی سیدہ سلام اللہ علیہا کو یہ محسوس ہورہی ہے کہ پوری کائنات میں نظام کوئی بھی ہو، امام کوئی بھی ہو، دین کچھ بھی ہو، جو ہورہا ہے ہوتا رہے بس تم میرے بیٹے کو روتے رہو، اگرچہ طاغوتوں کی حکومتوں میں بیٹھ کر، یزیدیوں کے سائے میں بیٹھ کر، یزیدیوں کے درباروں میں بیٹھ کر اور اُن سے رونے کے پروانے لے کر، رونے کی اجازت لے کر روؤ، اگرچہ اس رلانے کا بڑا معاوضہ لے کر بھی رلاؤ پھر بھی فاطمہ سلام اللہ علیہا خوش ہوجاتی ہیں۔ ہم نے اپنی طرف سے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی توقع مقرر کی ہے اور یہ توقع پوری کرکے پھر خوش بھی ہیں۔ گویا رونے والا مل گیا تو جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو اپنا ہدف مل گیا۔

دوسرا تعارف یہ پیش کیا گیا کہ آپ کو اپنی حاجتوں کیلئے زہراء سلام اللہ علیہا کی ضرورت ہے، چونکہ ہماری حاجتیں، خواہشیں وضروریاتِ زندگی بہت ہیں اور یہ ضرورتیں جنابِ سید سلام اللہ علیہا کے ذریعے ہی پوری ہوسکتی ہیں۔ وہ ہماری ضرورت ہیں اور ہم اُن کی، وہ ہماری شکرگزار ہیں اور ہم اُن کے۔

لہٰذا حق ادا کررہے ہیں اور بی بی سلام اللہ علیہا کو راضی کرنے کیلئے بیش بہا آنسو بہاتے ہیں لیکن آنسو بہا کر حاجتوں کی فہرست کھول کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ہم نے تو آپ کا مطالبہ پورا کردیا اب آپ ہمارا مطالبہ پورا کردیں۔ پھر مطمئن ہوجاتے ہیں کہ ہم نے زہراء سلام اللہ علیہا کا حق ادا کردیا اور زہراء سلام اللہ علیہا نے ہمارا حق ادا کردیا۔

کیا ہم نے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو یوں پہچانا ہے کہ بی بی سلام اللہ علیہا کو ایک جائیداد کے چھن جانے کی تکلیف اتنی سخت ناگوار گزری؟ کیا حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کا یہی مقام ہمارے ذہنوں میں آیا ہے؟ فدک کی جو حیثیت بی بی سلام اللہ علیہا کے ذہن میں تھی اور جو ہمارے اذہان میں ہے اس میں بہت فرق ہے۔ میں نے اکثر عرض کیا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی کربلا الگ ہے اور خطیبوں، ذاکروں و پیشہ وروں کی کربلا الگ ہے۔ حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کا

فدک اور ہے ہمارا فدک اور ہے۔ حضرتِ علی علیہ السلام کی زہرا ؑ اور ہے ہماری زہراء سلام اللہ علیہا اور ہے۔ اگر جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو جائیداد کے چھن جانے کی رنجش دُنیا سے لے گئی تو پھر تو معاذ اللہ وہ عورتیں بہتر نکلیں گی جس کے بڑے بڑے نقصان ہوجاتے ہیں، جن کی کئی مربع زمینیں لٹ جاتی ہیں لیکن وہ پھر بھی سنبھل جاتی ہیں اور اُن کو پھر بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ فدک کیا تھا؟ اسے امام ہفتم حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ہارون رشید کے پوچھنے پر بیان فرمایا ہے اور اسی پر بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کو رنجش تھی۔

لوگوں نے یہ سمجھا کہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا ذاتی رنجش کی وجہ سے ناراض تھیں۔ رنجش رکھنا تو انسان کا کمال نہیں ہے بلکہ خود جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی تعلیم ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جو تمہارے ساتھ زیادتی کرے تم اُسے معاف کردو۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

أَوْلَى النَّاسِ بِالْعَفْوِ أَقْدَرُهُمْ عَلَى الْعُقُوبَةِ......[1]

معاف کرنا سب سے زیادہ اسے جچتا ہے جو انتقام لے سکتا ہو۔

سب سے بہتر انسان وہ ہے جو اوجِ قدرت میں معاف کردیتا ہے، انتقام لے سکتا ہے لیکن نہیں لیتا۔ کس کا؟ ذاتی رنجشوں کا۔

یہ ہے اہلبیت علیہم السلام کی تعلیم۔ آیا ممکن ہے کہ علی علیہم السلام ہمیں تو یہ فرمارہے ہیں کہ اے میرے ماننے والو! اے مسلمانو! اے انسانو! معاف کردینا اللہ کی اعلیٰ قدر وصفت ہے، اللہ غفور ہے، معاف کردیتا ہے اور اللہ کا حکم بھی ہے کہ اگر تمہاری کسی کے ساتھ رنجش ہے تو رنجشیں معاف کردو، معافی مانگے تو بھی معاف کردو، نہ مانگے تو بھی معاف کردو لیکن اس موقع پر خود عمل پیرا نہ ہوں؟ ہم سمجھتے ہیں کہ لوگوں نے حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کی پراپرٹی چھین لی تو رنجش پیدا ہوگئی یعنی پلاٹ، باغ اور مال کی رنجش۔ فدک دُنیاوی مال ہے تو کیا بی بی سلام اللہ علیہا کے دل میں دُنیاوی مال کی رنجش پیدا ہوئی؟ پس ابھی حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو سمجھنا باقی ہے۔ جب سیدہ سلام اللہ علیہا کی ہستی ہمیں سمجھ آجائے تو اس وقت جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو اُسوہ بنانا ممکن ہوگا۔

1...... (نہج البلاغہ، حکمت ۵۲)

عفو و درگزر کرنے والے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا اس رسولؐ کی بیٹی ہیں کہ جنہیں مشرکین مکہ خصوصاً قریش اور قریش میں بھی ابوسفیان و آلِ ابی سفیان نے اتنا ستایا کہ مکہ میں رہنا ناممکن بنا دیا۔ ان کی اذیتوں کی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ چھوڑنا پڑا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں و ساتھیوں پر ظلم کیا گیا، اُن کے اموال چھین لئے گئے، کئی لوگوں کو مکہ میں شہید کر دیا گیا اور باقیوں کو ہجرت پر مجبور کیا گیا۔ جب یہ مہاجرین مدینہ پہنچے تو ان مشرکین نے تعاقب کیا اور لشکر لے کر مدینہ آ گئے۔ مدینہ میں حملے کر کے متعدد اعلیٰ ترین شخصیتوں کو شہید کیا جن میں ایک نمونہ سید الشہداء حضرت حمزہؑ کی ذات ہے۔ حضرت حمزہؑ کو شہید کر کے ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے خنجر سے آپ کا سینہ پھاڑ کر جگر نکالا اور اپنے دانتوں سے چبایا۔ پھر اُس نے چیخ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گستاخانہ انداز سے مخاطب کر کے کہا: میں نے بدر کے اپنے کشتگان کا انتقام لے لیا ہے۔

لیکن جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ فتح کر لیا تو مشرکین مکہ تسلیم ہو جاتے ہیں، جب انہیں جان کے لالے پڑ جاتے ہیں تو اب پناہ مانگتے ہیں۔ ہندہ، ابوسفیان اور آلِ ابوسفیان بھی اس وقت مکہ میں تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی ان مجرموں اور قاتلوں کے بارے میں کہتے ہیں:

اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَلْحَمَةِ اَلْیَوْمَ تُسْتَحَلُّ الْحُرْمَةُ اَلْیَوْمَ اَذَلَّ اللّٰهُ قُرَیْشًا......[1]

آج کا دن انتقام کا دن ہے، آج حرمتوں کی پائمالی کا دن ہے، آج کے دن اللہ نے قریش کو ذلیل کر دیا۔

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان کیا:

أَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَرْحَمَةِ، اَلْیَوْمَ أَعَزَّ اللّٰهُ فِیْهِ قُرَیْشًا......

آج عفو، معافی، رحم و بخشش کا دن ہے۔ آج کے دن اللہ نے قریش کو عزت دی ہے۔

انتقامی جذبوں اور ہدایت کے جذبوں میں یہی فرق ہے۔ رسُل انتقام کے لئے نہیں آتے اور انتقامی کاموں میں شامل نہیں ہوتے۔ انتقام لینا دین کا کام نہیں ہے۔ جہاد اللہ کی راہ کے بند راستے کھولنا ہے نہ کہ

---

[1]...... (المغازی-أبو عبد اللہ محمد بن عمر بن واقد الواقدی، المتوفی: ۲۰۷ھ)

انتقام لینا لہٰذا فرمایا کہ آج عمومی معافی ہے انتقام نہیں ہے چنانچہ ہندہ، ابوسفیان، آلِ ابوسفیان اور اسی طرح سارے مجرموں و دہشت گردوں کو معاف کر دیا۔

اسی قاتلوں کو معاف کر دینے والی ہستی کی بیٹی کا نام فاطمہ سلام اللہ علیہا ہے لیکن بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کچھ لوگوں کو معاف نہیں کرتیں اور اس دُنیا سے ناراض چلی جاتی ہیں۔ آپ کیا کہیں گے؟ کیا ذاتی رنجش تھی کہ حق چھیننے سے اتنی رنجش پیدا ہوئی کہ نہ عیادت کرنے دی، نہ تعزیت کرنے دی، نہ تسلیت کرنے دی، نہ تشیع جنازہ کرنے دی، نہ فاتحہ پڑھنے دی، نہ سوگ منانے دیا اور نہ عزا کرنے دی۔ انہیں ہر چیز سے محروم کر کے فاطمہ سلام اللہ علیہا اس دُنیا سے چلی گئیں۔ آئندہ فصلوں میں وضاحت کی جائے گی کہ بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کی یہ رنجش ذاتی رنجش نہیں تھی بلکہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نظامِ ولایت سے امت کے انحراف پر ناراحت و ناراض تھیں۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا وارثِ علمِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے بہت سے کلام منقول ہیں اور خود جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا راوی بھی ہیں۔ آپؑ نے بہت ساری احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سماعت فرمائیں اور انہیں بیان بھی کیا۔ اگرچہ امت و راویانِ حدیث نے یہ کام کیا کہ وہ دین جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اہلِ بیت علیہم السلام مخصوصاً جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی زبانی بیان ہوا اسے آگے نہیں بڑھایا۔ نہ جانے کن وجوہات کی بناء پر اسے سینسر و حذف کر دیا جبکہ ان لوگوں کی زبانی زیادہ مطالب نقل ہوئے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی خاص قرابت حاصل نہیں تھی یا کم از کم جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسرار معلوم نہیں تھے۔ ان احادیث کے علاوہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے خود اپنے فراوان کلام کتب کے اندر موجود ہیں۔

جنابِ جبریل علیہ السلام کا بارگاہِ سیدہ سلام اللہ علیہا میں حاضر ہونا

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا مُحَدَّثه......[1] ہیں۔ اصول کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا صرف پچھتر دن زندہ رہیں، آپ کو اپنے والد کے ارتحال کا بے حد صدمہ تھا، اسی وجہ سے جبرئیل علیہ السلام آپؑ کی خدمت میں آتے تھے اور تسلی دیتے تھے اور رحلتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کی ذریت پر ہونے والے حوادث کی خبر دیتے تھے، جبرئیل علیہ السلام جو کچھ کہتے تھے علی علیہ السلام انہیں لکھ لیتے تھے، انہی اقوال کے مجموعہ کو مصحفِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کہتے ہیں۔

حضرت امام خمینیؒ فرماتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام کا بارگاہِ جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا میں آنا اتنا بڑا مقام ہے کہ جسے انسان درک نہیں کرسکتا چونکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا آنا معاذ اللہ کسی ڈاکیے کی طرح آنا نہیں ہے۔ جبرئیل علیہ السلام ہر ایک کے پاس نہیں آتے، زمین پہ نہیں اترتے بلکہ انسانِ کامل کے قلبِ نورانی پہ اترتے ہیں۔ جبرئیلؑ کو اتارنے کی صلاحیت اس منبع میں ہونی چاہیے جس پر جبرئیلؑ اترتے ہیں۔ یہ عظمتِ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا ہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد روزِ شہادت تک ہر روز جنابِ جبرئیل کا نزول ہوتا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو اسرار و حقائق تعلیم فرماتے۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا انہیں تکرار کرتیں اور امیر المومنین علیہ السلام جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کے کلام سے نکلے ہوئے جملوں کی کتابت کرتے۔ یہ مسودہ میراثِ الٰہی کے طور پر ائمہ علیہم السلام کے پاس رہتا ہے۔ امامت کی ایک دلیل یہ ہے کہ امام وہ ہے جس کے پاس صحیفہ فاطمیہؑ ہوگا۔ ائمہ علیہم السلام کی متعدد اولادیں تھیں لیکن صحیفہ فاطمیہؑ ہر فرزند کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ صحیفہ فاطمیہؑ وصی کے پاس ہوتا ہے لیکن اس کے مضامین ہم پر زیادہ واضح وعیاں نہیں ہیں۔ روایات میں ہے کہ جب حضرت حجت (عج) تشریف لائیں گے تو جو چیزیں ان کے پاس روشن وواضح ہوں گی وہ صحیفہ مبارکہ فاطمیہؑ ہے۔ اس کے بعض مندرجات ائمہ اطہار علیہم السلام نے بیان فرمائے ہیں۔ ائمہ معصومین علیہم السلام سے احادیث منقول ہیں جن میں ائمہ علیہم السلام نے باقاعدہ حوالہ دیا ہے کہ یہ مطلب ہم صحیفہ فاطمیہؑ سے نقل کررہے ہیں۔

---

[1]......فرشتوں کی باتیں سننے والے کو مُحَدَّث کہتے ہیں۔

الغرض جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا علم سرچشمہ حکمتِ الٰہی سے سیراب ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ انسان مقام و عظمتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو درک کرنے سے عاجز و قاصر ہے اور اگر ہم مقامِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی ایک جھلک دیکھنا چاہیں تو وہ خطبہ فاطمیہؑ میں روشن وعیاں ہو رہی ہے۔

معرفتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا در آئینہ فاطمہ سلام اللہ علیہا

پس حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی معرفت خود کلامِ سیدہؑ، سیرتِ سیدہؑ و آئینہ فاطمہؑ سے حاصل کریں۔ ڈاکٹر شریعتی جو ایک قادر الکلام ادیب ہے، لفاظی بہت خوبصورت کرتے ہیں، اُن کی ایک کتاب کا نام ہے ''فاطمہؑ فاطمہؑ است''۔ اُس میں لکھتے ہیں کہ میں نے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو سمجھنے کے لئے ساری شخصیتوں کا ایک ایک کر کے مطالعہ کیا تا کہ دیکھوں کہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کس شخصیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ میں نے جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو سمجھنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کو دیکھا کہ آیا فاطمہ سلام اللہ علیہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں یا نہیں، پھر میں نے علی علیہ السلام کی شخصیت کو دیکھا کہ آیا فاطمہ سلام اللہ علیہا علیؑ ہیں یا نہیں؟ امام حسن علیہ السلام کو دیکھا کہ فاطمہ سلام اللہ علیہا حسنؑ ہیں یا نہیں؟ پھر میں نے امامِ حسین علیہ السلام کو دیکھا کہ فاطمہ سلام اللہ علیہا حسینؑ ہیں یا نہیں؟ اسی طرح بڑی بڑی شخصیات کا مطالعہ کیا کہ آیا فاطمہ سلام اللہ علیہا، ابراہیم علیہ السلام ہیں یا نہیں؟ نوح علیہ السلام ہیں یا نہیں؟ موسیٰ علیہ السلام ہیں یا نہیں؟ آخر کسی شخصیت سے ملا کر دیکھو تا کہ میں سمجھوں کہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کیا ہے؟ پھر کہا کہ جب میں نے فاطمہ سلام اللہ علیہا کو سب کے ساتھ ملا کر دیکھا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ فاطمہؑ، فاطمہؑ ہیں۔ جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو فاطمہ سلام اللہ علیہا کے آئینہ میں دیکھیں۔

ہم جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو رباعیوں، قصیدوں، تقریروں اور منبروں سے پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس میں اپنی عقیدت سے شخصیتِ جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا بیان کی جاتی ہے لیکن آپ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو خود ان کی سیرت، کلام، قیام، انقلاب، اعتراض، ناراضگی، خشم اور اُس غیر الٰہی عمل کے خلاف نفرت کے آئینہ میں دیکھیں جو حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے دلِ اقدس میں موجود ہے۔

فصل دوم:

نظامِ الٰہی سے امت کا انحراف
اور
قیامِ فاطمی کا آغاز

خطِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے احتراز پر جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کا اعتراض

عبداللہ ابن مسعودؓ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بزرگ اور فاضل صحابہ کو جو علم و دانش میں دوسروں سے برتر تھے اکٹھا کیا اور انہیں ایک الگ انداز سے اسلام سکھایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں ایک دائرے میں کھڑا کیا اور خود بیٹھ کر ریت کے اوپر انگلی سے ایک خط......۱ کھینچ کر کہا کہ یہ میرا خط ہے۔ پھر اس کے دائیں بائیں دو سیدھے متوازی (Parallel) خط کھینچ کر فرمایا کہ یہ دائیں بائیں میرے خطوط نہیں ہیں بلکہ خطوطِ شیطان و سبلِ شیطان ہیں جن پر شیطان بیٹھا ہوا ہے۔ یہ حدیث مختلف متون میں موجود ہے:

عَنْ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: خَطَّ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا، وَخَطَّ عَنْ يَمِيْنِ الْخَطِّ وَعَنْ شِمَالِهِ خُطَطًا ثُمَّ قَالَ: هٰذَا صِرَاطُ اللهِ مُسْتَقِيْمًا، وَهٰذِهِ السُّبُلُ عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُوْ إِلَيْهِ۔ ثُمَّ قَرَأَ{وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا......۲ }......۳

عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خط کھینچا اور اس خط کے دائیں اور بائیں بہت سارے خطوط کھینچے، پھر فرمایا: یہ اللہ کا سیدھا راستہ ہے۔ پھر (دوسرے خطوط کی طرف اشارہ کرکے) کہا: ان میں سے ہر راستے پر شیطان بیٹھا ہوا ہے جو ان راستوں کی طرف بلا رہا ہے۔ پھر آپؐ نے اس آیہ کی تلاوت فرمائی: اور بتحقیق یہی میرا سیدھا راستہ ہے......

۱......خط، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اصطلاح ہے۔ اُردو زبان میں خط لکھائی اور لکھی ہوئی چیز جبکہ عربی زبان میں لائن کو کہتے ہیں۔

۲......(سورۃ الأنعام، آیہ ۱۵۳)

۳......(السنن الکبری-النسائي، المتوفی:۳۰۳ھ) (المستدرك علی الصحیحین-أبو عبداللہ الحاکم، معروف بابن البیع، المتوفی:۴۰۵ھ)

ایک اور متنِ حدیث یہ ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ: خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا فَقَالَ: هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ، ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ فَقَالَ: هٰذِهٖ سُبُلٌ عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُوْ إِلَيْهِ، ثُمَّ تَلَا {وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا...... ۱ }...... ۲

عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک خط کھینچا اور کہا: یہ اللہ کا راستہ ہے۔ پھر اس خط کے دائیں جانب اور بائیں جانب خطوط کھینچے اور کہا: یہ وہ راستے ہیں کہ ان راستوں میں سے ہر راستہ پر شیطان بیٹھا ہوا ہے جو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے (پہلے خط کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) اس آیہ کی تلاوت فرمائی: اور بتحقیق یہی میرا سیدھا راستہ ہے......

یہ بہت ہی دقیق، ظریف اور لطیف نکتہ ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ توجہ رکھنا میرا خط سیدھا ہے لیکن میرے خط کے موازی بھی سیدھے خطوط کھینچے جائیں گے جو ظاہراً دیکھنے میں تو سیدھے ہوں گے لیکن وہ میرے خط سے جدا ہوں گے، فاصلے پر ہوں گے، وہ میرا خط نہیں ہوگا، تمہیں میرے خط پہ قائم رہنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ میری راہ کے مشابہ، موازی، متوازی و پیرالل (Parallel) بہت سارے راستے بنا دیئے جائیں گے اور اُمت کو یہ کہہ کر ان راہوں پر ڈال دیا جائے گا کہ یہ راستے بھی وہیں جا رہے ہیں جدھر خطِ رسولؐ جا رہا ہے۔ جو بصیرت سے محروم ہوں گے وہ متوازی راستوں میں خط رسولؐ کو گم کر بیٹھیں گے۔ دلیل یہ دیں گے کہ یہ راستہ بھی ادھر ہی جا رہا ہے، سب راستوں کا رخ ایک طرف ہے پس یہ سب راہِ رسولؐ ہیں۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اُن صحابہ کو متوجہ کیا کہ ان متوازی راہوں میں ایک راستہ میرا ہے جبکہ دائیں بائیں شیطانی راستے ہیں۔

راہیں مخالف خطوط کی وجہ سے نہیں بلکہ موازی و متوازی خطوط کی وجہ سے گم ہو جاتی ہیں۔ بصیرت

۱...... (سورۃ الأنعام، آیہ ۱۵۳)

۲...... (مسند أبي داود الطيالسي - أبو داود الطيالسي البصري، المتوفى: ۲۰۴ھ)

مخالف خطوط میں سے خط مستقیم کو تشخیص دینے کا نام نہیں بلکہ متوازی خطوط میں سے خط رسولؐ کو تشخیص دینے کا نام ہے۔

خطِ رسولؐ سے پہلا انحراف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد شروع ہوا جو بہت واضح وکھلا انحراف تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانِ غدیر کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ اس صریح انحراف پر خواص نے مصلحت کوشی اور عوام نے خاموشی سے کام لیا لیکن فقط ہستی وذاتِ جنابِ فاطمہ تھی جس نے مصلحت کوشی سے گریز کیا، خاموشی کو توڑا اور قیام کی رِدا اوڑھ کر میدان میں آئیں۔ آپ نے بانگِ دہل فرمایا کہ یہ خطِ رسول نہیں ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نظام نہیں ہے۔

متوازی خطوط آج بھی موجود

آج ہماری مشکل مخالف خطوط نہیں ہیں، مسلمین مخالف خطوط کی وجہ سے گمراہ نہیں ہو رہے بلکہ موازی خطوط کی وجہ سے گمراہ ہو رہے ہیں۔ وہ خطوط جو خطِ رسولؐ کے متوازی بنا دیئے گئے اور اتنے زیادہ بنا دیئے گئے کہ ہم جس خط کو بھی دیکھیں تو سمجھتے ہیں یہی سیدھا خط ہے، یہ ادھر ہی تو جا رہا ہے جدھر خطِ رسولؐ جا رہا ہے لیکن متوازی خط چونکہ اس خط سے الگ ہوتا ہے، فاصلے پہ جا رہا ہوتا ہے، اس کی ابتداء وانتہاء اور ہوتی ہے لہٰذا یہ انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے جبکہ خطِ رسولؐ انسان کو کسی اور جگہ پہنچاتا ہے۔

حضرتِ زہراء سلام اللہ علیہا محافظِ خطِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تاریخِ اسلام میں انحراف کی اصلاح کا پہلا قدم بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا نے اٹھایا ہے۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا قیام نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی طرف توجہ دلانے کیلئے تھا جو متوازی راہوں میں گم ہو رہا تھا۔ جب جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا حق حکومتی فرمان کے ذریعے لے لیا گیا تو جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو بہانہ وموقع مل گیا۔ آپ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور وہ حکومت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے نام پر، پارٹیوں کے اجتماع اور

ووٹوں سے بنی تھی اُس حکومت کے خلاف قیام کیا۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے عوام سے نہیں بلکہ حکمرانوں سے خطاب کیا اوراس طرح لوگوں کو متوجہ کیا کہ اُمت کو خطِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہٹایا جا رہا ہے۔ پس قیامِ فاطمیؑ اُمت کو دوبارہ خطِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لانے کیلئے تھا۔

اقدامِ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا تاریخ کے اوراق میں مصلحت کوشی، تعصب، رسومات اور عقیدتوں کے جذبوں تلے گم ہو گیا۔ اسی طرح جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد خطِ رسولؐ متوازی راہوں میں گم ہو گیا تھا۔ اسلام فاطمیؑ وہی اسلام علویؑ ہے۔ ہمارے بعض بزرگ اساتید کا فرمانا ہے کہ اگر جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا یہ خطبہ نہ ہوتا، یہ اقدام نہ ہوتا، یہ مبارزہ نہ ہوتا، اگر سیدہ سلام اللہ علیہا اس میدان میں نہ اترتیں تو آج میں اور آپ شرفِ تشیع سے مشرف نہ ہوتے۔ ایک عجیب گول مول سا اسلام ہوتا جو کسی کے پلے نہ پڑتا، جس میں سب کے سب ایک ہی جیسے ہوتے لیکن جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے آ کر خطِ رسولؐ سے ان متوازی خطوط کو جدا کر دیا۔ اور ساتھ ہی اپنے اقدام سے بتا دیا کہ اپنے مفادات کے حصول کیلئے اسلام کو جتنے بھی لبادے اڑھاؤ لیکن خطِ رسولؐ ہمیشہ واضح و روشن رہے گا اور جو اس خط پر چلے گا وہی حقیقی اسلام پر گامزن ہے۔

اسلام کے بھیس میں مختلف چہرے

امام خمینیؒ نے فرمایا تھا کہ آج اسلام کے کئی چہرے موجود ہیں۔ آپؒ نے دو معروف چہرے ذکر کئے:

۱۔ اسلام امریکائی یعنی امریکی چہرہ

۲۔ اسلامِ نابِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی خالص اسلامِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

یہ امام راحلؒ کی اصطلاحات تھیں۔ امریکی چہرے سے مراد یہ نہیں ہے کہ جو چہرہ امریکہ میں بنا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو امریکہ کو زیادہ پسند ہے۔ ایک اسلام امریکہ یعنی دشمنانِ دین کو بہت زیادہ پسند ہے کہ یہ اسلام بہترین اسلام ہے، اسلام ایسا ہی ہونا چاہیے اور وہ اس اسلام کے حامی ہیں جو ان کے کام

آتا ہے۔اس کے مقابلے میں ایک اسلام ناب، اسلامِ محمدیؐ، اسلامِ علویؑ، اسلامِ فاطمیؑ، اسلامِ حسینیؑ و اسلامِ جعفریؑ ہے جو کہ اسلامِ حقیقی ہے۔اس کے مقابلے میں تاریخ میں مختلف نام رہے ہیں مثلاً اسلامِ اموی، اسلامِ عباسی، اسلام شہنشاہی، بادشاہوں کا اسلام، حکمرانوں کا اسلام، ملوک کا اسلام، آمریت کا اسلام، راجوں کا اسلام، مہاراجوں کا اسلام، نوابوں کا اسلام، حکومتوں کا اسلام، سرکاری اسلام۔تاریخ میں اسلام کی مختلف شکلیں موجود رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔ان سب کا نام اسلام ہے لیکن سب کی حقیقتیں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ فاطمیؑ اسلام وہی محمدیؐ اسلام ہے۔ ہر زمانے میں اس کا ایک نام رکھا گیا ہے۔کیوں رکھا گیا ہے؟ اس لئے کہ جس شخصیت نے اس کو زندہ کیا ہے اسی کے نام سے وہ معروف ہوجاتا ہے۔یہ محمدیؐ اسلام تھا لیکن سید الشہداء علیہ السلام نے اس کو زندہ کیا تو یہی اسلام، حسینیؑ اسلام ہوگیا۔بعض علماء کے بقول اسلام پیدائش میں محمدیؐ ہے اور بقاء میں حسینیؑ ہے۔ہمیں آج وہ اسلام ڈھونڈنا ہے جو محمدیؐ، فاطمیؑ، علویؑ و حسینیؑ اسلام ہے۔

جس طرح اسلام کی کئی شکلیں ہیں اسی طرح تشیع کے بھی کئی چہرے ہیں۔تشیع کا ایک چہرہ محمدی تشیع، علوی تشیع، فاطمی تشیع، عاشورائی تشیع، حسینی تشیع، جعفری تشیع و مہدوی تشیع ہے۔اس کے متبادل تشیع کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً سرکاری تشیع، شاہ کا تشیع، شہنشاہوں کا تشیع، راجوں کا تشیع، مہاراجوں کا تشیع، نوابوں کا تشیع، پیشہ وروں کا تشیع اور خانقاہوں کا تشیع۔

رحلتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد گروہوں کا وجود میں آنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو جو نظام دیا تھا بہرکیف کچھ وجوہات کی بناء پر امت اس سے دور ہوگئی۔ان میں سے ایک وجہ یہی حزبی و پارٹی نظام تھا۔ایک پارٹی انصار اور ایک مہاجرین کی تھی کہ جن میں نہ سارے انصار شامل تھے اور نہ سارے مہاجرین۔مہاجرین و انصار میں بہت ہی عظیم المرتبہ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی موجود تھے۔ہم بعض اوقات ان عظیم ہستیوں کا حق ادا نہیں کرتے جبکہ نہج البلاغہ میں ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے اصحاب کے درمیان خطبہ پڑھا اور حسرت سے فرمایا:

لَقَدْ رَأَيْتُ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ ...... [1]

''میں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاص اصحاب دیکھے ہیں، مجھے تو تم میں سے ایک بھی ایسا نظر نہیں آتا جو ان کے مثل ہو۔ وہ اس عالم میں صبح کرتے تھے کہ ان کے بال بکھرے ہوئے اور چہرے خاک سے اٹے ہوتے تھے جبکہ رات کو وہ سجود و قیام میں کاٹ چکے ہوتے تھے، اس عالم میں کہ کبھی پیشانیاں سجدے میں رکھتے تھے اور کبھی رخسار۔ اور حشر کی یاد سے اس طرح بے چین رہتے تھے جیسے انگاروں پر ٹھہرے ہوئے ہوں اور لمبے سجدوں کی وجہ سے ان کی آنکھوں کے درمیان (پیشانیوں پر) بکری کے گھٹنوں جیسے گٹے پڑے ہوئے تھے۔ جب بھی ان کے سامنے اللہ کا ذکر آجاتا تھا تو ان کی آنکھیں برس پڑتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کے گریبانوں کو بھگو دیتی تھیں۔ وہ اس طرح کانپتے رہتے تھے جس طرح تیز جھکڑ والے دن درخت تھرتھراتے ہیں، سزا کے خوف اور ثواب کی امید میں''۔

قرآن نے ان کے فضائل ذکر کئے ہیں لیکن بعد میں ہوا یہ کہ مہاجرین و انصار میں غیر محسوس طور پر حزب وجود میں آگئی۔ آج احزاب کی رائج اصطلاح قرآنی اصطلاح نہیں ہے۔ قرآن نے حزب کا لفظ اور معنوں میں استعمال کیا ہے لیکن آج لفظ حزب اس انسانی گروہ و مجموعے کو کہتے ہیں جو اقتدار کے حصول کے لئے آپس میں مل بیٹھے۔ چاہے وہ سیاسی، دینی، اجتماعی، اقتصادی، مالی یا بالآخر کسی بھی شعبے کا اقتدار حاصل کرنے کے لئے ہو۔ یہ سیکولرازم کا تحفہ ہے۔ جمہوریت کے ساتھ حزب بھی پیدا ہوئی ہے۔ جمہوریت اپنے بچے ساتھ لائی ہے۔ نکتہ مشترک اقتدار کا حصول ہے لیکن اگر کوئی اور مقصد ہے تو اسے حزب نہیں کہیں گے۔ عملی طور پر احزاب بہت ہی قدیم زمانوں میں وجود میں آئی تھیں چونکہ اقتدار کے حصول کے لئے کچھ اقتدار طلب، اقتدار پسند و اقتدار خواہ لوگ ہمیشہ سے رہے ہیں۔ ممکن ہے وہ اپنے محلے کا اقتدار چاہتے ہوں، اپنی برادری کا اقتدار چاہتے ہوں، اپنی کمیونٹی کا اقتدار چاہتے ہوں، اپنے مذہب کا اقتدار چاہتے ہوں، اپنے کسی دینی مرکز کا اقتدار چاہتے ہوں، اپنی کسی مارکیٹ کا اقتدار چاہتے ہوں یا کسی ملک کا اقتدار چاہتے ہوں۔

[1]...... (نہج البلاغہ، خطبہ ۹۵)

اقتدار یعنی حاملِ قدرت رہیں، امور کو چلانے والی پاور ان کے پاس ہو، ہر چیز ان کے حکم سے ہو، ہر چیز ان کے زیرِ نظر ہو اور سب کچھ ان کے ماتحت ہو۔

ساتھ ہی ایسے لوگ بھی رہے ہیں جنہیں اقتدار سے سرے سے کوئی غرض نہیں ہوتی بلکہ انہیں دوسرے مفادات چاہیے ہوتے ہیں۔ بہت سارے لوگ ایسے موجود ہیں کہ اگر آج انہیں آفر (Offer) بھی کریں کہ آپ اقتدار میں آجائیں تو وہ نہیں آتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو بس کاروبار چاہیے۔ اور کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں نہ کاروبار چاہیے اور نہ ہی اقتدار بلکہ انہیں کسی اور چیز سے سروکار ہے۔ اقتدار حاصل کرنے کیلئے بعض لوگ انتظار میں تھے چونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ ......[1]

(اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) یقیناً آپ کو بھی انتقال کرنا ہے اور انہیں بھی یقیناً مرنا ہے۔

سب کے ذہن میں تھا کہ جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلے جائیں گے تو پیچھے کیا ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو بتا گئے کہ پیچھے کیا ہوگا؟ لیکن جنہیں اقتدار چاہیے وہ پہلے سے ہی اس فکر میں لگے ہوئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد انصار و مہاجرین کی ان حزبوں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا کیونکہ انہیں تیسری حزب کا خوف تھا۔ اس حزب سے سبقت لینے کے لئے یہ دونوں حزبیں پیش قدم ہوئیں اور انہوں نے اقتدار کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ایک تاریخی داستان ہے کہ جو کتابوں کے اندر موجود ہے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جا رہا لیکن یہ کام ہوا کہ ان دو حزبوں میں پہلے اختلاف ہوا لیکن بعد میں فوراً ہی بعض مؤثر افراد کی مداخلت سے ان دونوں کا آپس میں اتفاق ہو گیا اور دونوں نے وہاں پر متفقہ فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ امت کا نہیں تھا بلکہ دو ایسی حزبوں کا تھا کہ جن کی رکنیت بہت کم تھی۔ ان دونوں پارٹیوں نے فیصلہ کر کے عوام و امت کے سامنے اپنا فیصلہ پیش کیا۔ عوام نے اس فیصلے کی تائید کر دی چونکہ حزبی فیصلوں کو عوام قبول کرتے ہیں، لوگ حزب کے پیچھے زیادہ چلتے ہیں۔ یہ امت بن کر امام کی طرف نہیں گئے۔

[1]...... (سورۃ الزمر، آیہ ۳۰)

اب جناب سیدہ سلام اللہ علیہا نے دیکھا کہ یہ کوئی سادہ و معمولی کام نہیں ہوا ہے بلکہ یہ غیر معمولی کام، غیر معمولی فیصلہ و غیر معمولی اقدام ہوا ہے اور دوسروں کا اس اقدام کو قبول کر لینا اور بعض کا خاموش رہ جانا بھی غیر معمولی ہے۔ چونکہ ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسدِ مبارک دفن بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ فیصلہ ہو گیا اور اس کا اعلان بھی ہو گیا۔ دفن کے بعد تیسرے دن یہ اقدام شروع ہوئے اور جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے فوراً ردِ عمل دکھایا۔

اقتدار جمانے کے اوچھے ہتھکنڈے

اس حکومت میں جو لوگ برسر اقتدار آئے انہوں نے ہر ایک کو اپنے اقتدار کا اثر دکھانے کے لئے اقدامات شروع کئے تا کہ سب کو پتا چل جائے کہ اقتدار ہمارے پاس آچکا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے اقتدار کا استعمال اس طرح شروع کیا کہ اس نخلستان و باغ پر قبضہ کر لیا جو مدینہ سے تقریباً سو کلومیٹر باہر خیبر کے علاقے میں قلعہ خیبر کے نزدیک ہے۔

حالانکہ نئی حکومتیں عموماً غیر اہم مسائل کی بجائے زیادہ ترجیح والے بحرانوں کو پہلے حل و کنٹرول کرتی ہیں مثلاً جب امیر المومنین علیہ السلام حاکم بنے تو فوراً پہلے نوٹیفیکیشن میں شام کے امیر کو برخواست کر دیا کہ یہ میری حکومت میں نہیں چلے گا۔ جتنے ناپسندیدہ لوگ تھے اُن کو براخواست و معزول کر دیا چونکہ اس چیز کی اہمیت تھی۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جو حکومت بنی اس نے پہلا فیصلہ یہ کیا کہ فدک جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے لے لیا جائے۔ حالانکہ بہت سارے دیگر کیس و اقدامات تھے جو کرنے تھے مثلاً سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ جو لشکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسامہ کی سربراہی میں تیار کروایا تھا اُسے روانہ کیا جاتا۔ ساری ہمت اُس پر صرف ہونی چاہیے تھی لیکن ایسا فوری دستور صادر کرنے کی اپنی وجوہات ہیں کہ کیوں وہ باغ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے لے لیا گیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارک میں جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو دے دیا تھا۔ وہ باغ میراث و وراثت نہیں تھا بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس باغ کو بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کو ہبہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وئی کام حکمِ خدا کے بغیر انجام نہیں دیتے تھے۔ یہ ہبہ بھی حکمِ الٰہی سے کیا تھا اور اسی موقع کے

لئے آیہ قرآن بھی موجود ہے۔

یہود نے جان بچانے کے لئے خیبر اور خیبر کے اردگرد کی زمینیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و دے دی تھیں کہ آپ ہمیں معاف کردیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مقدار معین کی کہ آپ اپنی گزر بسر کا اتنا سامان لے لو اور باقی سب سے دستبردار ہو جاؤ۔ وہ لوگ اس بات پر قائل ہو گئے اور انہوں نے اپنے لئے ایک ایک اونٹ کا سامان الگ کرلیا اور باقی سب کا سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے کردیا۔ چونکہ انہوں نے اسلام کے خلاف سازش کی تھی اور اس جنگ میں شکست کھانے کے قریب ہوئے تو قتل سے بچنے کے لئے انہوں نے یہ پیشکش کی۔اس میں جو زمینیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیار میں آئیں تو وہیں پر آیت اتری کہ یہ مال جو رسول اللہ ؐ کے اختیار میں آیا ہے اس پر اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حق ہے۔

وَمَآ أَفَاءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنۡھُمۡ فَمَآ أَوۡجَفۡتُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ خَیۡلٍ وَّلَا رِکَابٍ وَّلٰکِنَّ اللّٰہَ یُسَلِّطُ رُسُلَہٗ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۱

اور جس مال (غنیمت) کو اللہ نے اپنے رسولؐ کی آمدنی قرار دیا ہے (اس میں تمہارا کوئی حق نہیں) کیونکہ اس کے لئے نہ تو تم نے گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ، لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جن پر چاہتا ہے غالب کر دیتا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔

مَآ أَفَاءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنۡ أَھۡلِ الۡقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡأَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡہُ وَمَا نَھٰکُمۡ عَنۡہُ فَانۡتَھُوۡا وَاتَّقُوا اللّٰہَ إِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ۝ ۲

اللہ نے ان بستی والوں کے مال سے جو کچھ بھی اپنے رسول کی آمدنی قرار دیا ہے وہ اللہ اور رسولؐ اور قریب ترین رشتہ داروں اور یتیموں اور مساکین اور مسافروں کے لئے ہے تاکہ وہ مال تمہارے دولتمندوں

۱...... (سورۃ الحشر، آیہ ۶)

۲...... (سورۃ الحشر، آیہ ۷)

کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے اور رسولؐ جو تمہیں دے دیں وہ لے لو اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ اور اللہ کا خوف کرو۔ اللہ یقیناً شدید عذاب دینے والا ہے۔

اور جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و یہ حکم ہوا:

وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ...... ۱؎

قریبی رشتہ داروں کو ان کا حق دیا کرو......

جوں ہی ذوی القربیٰ کی آیت نازل ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً فدک حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے حوالے کر دیا۔ آپ نے لوگوں کو بتا دیا کہ آیتِ قرآن نازل ہوئی ہے اور آیتِ قرآن کی عملی تفسیر بھی سب کے سامنے پیش کر دی کہ یہ سب کچھ حکمِ الٰہی سے ہوا ہے۔

اقتدار جمانے کے اوچھے ہتھکنڈے

اقتدار پر بیٹھے لوگوں نے مختلف طریقوں کا استعمال شروع کیا۔ ایک طریقہ یہ استعمال کیا کہ لوگوں سے کہا گیا کہ سب آئیں اور آ کر بیعت کریں اور جو نہیں کر رہا اسے زبردستی لایا جائے۔ اس کام کے لئے باقاعدہ گروپ بنائے گئے اور انہوں نے لوگوں کو زبردستی بیعت کرانا شروع کی۔ تاریخ کے اندر باقاعدہ نام موجود ہیں کہ کون کون ان گروہوں میں شامل تھے؟ کس کس کو لائے؟ کس انداز سے لائے؟ کس نے بیعت کی؟ اور کس نے نہیں کی؟ یہ سب تاریخ کے حقائق ہیں لیکن چونکہ خصوصاً امیر المومنین علیہ السلام و جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو یہ بتانا و تاثر دینا مقصود تھا کہ اس وقت اقتدار قائم ہو چکا ہے لہٰذا پہلا حکومتی حکم نامہ یہ صادر ہوا کہ فدک جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے واپس لے لیا جائے اور کہا جائے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بعنوانِ حاکم موجود تھا اور اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جو حاکم ہے اس کے اختیار میں ہے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے اس باغ کے لئے جو متولی وقف کیا ہوا تھا اس کو ہٹا کر نیا متولی قائم کر دیا گیا اور اس سے کہا گیا کہ اس کی ساری درآمد اب حکومتِ وقت کو دی جائے۔ اب جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا یہاں اپنا ردِعمل دکھاتی ہیں۔ ساری امت خاموشی سے دیکھ رہی ہے حتیٰ کہ اصحاب، خواص اور جید لوگ بھی خاموش ہیں۔

۱؎......(سورۃ الاسراء، آیہ ۲۶)

فدک، دفاعِ نظامِ الٰہی کیلئے بہانہ

یہ بات ذہن نشین رہے کہ خطبہ فاطمیہؑ یا خطبہ فدکیہ جس ماحول میں بیان فرمایا گیا وہ فقط ایک بہانہ تھا، آپ نے فدک کو دفاعِ نظامِ الٰہی کیلئے ایک بہانہ قرار دیا۔ اس خطبہ میں جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے بتائے ہوئے حقائق قیامت تک کیلئے راہ کشا ہیں۔ یہ بصیرتِ فاطمیؑ کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا کہ حکومت کی ایک حرکت وغلطی کو بڑے انحراف کی اصلاح کیلئے ایک بہانہ قرار دیا۔

پہلے بھی فدک کی درآمد کا کوئی حصہ بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا اپنے گھر میں نہیں آنے دیتی تھی بلکہ پہلے سے فقراء، مساکین، بیوائیں اور یتیم مشخص تھے کہ فدک کی ساری درآمدان کے پاس جاتی تھی۔ جب یہ باغ آپؑ کے پاس تھا تو بھی گھر کی حالت وہی تھی جو تاریخوں میں لکھی ہوئی ہے کہ نانِ جو ہی کھاتے تھے اور اس باغ کی درآمد راہِ خدا میں خرچ ہوتی تھی۔ اگر یہ لوگ فدک بی بی سلام اللہ علیہا سے نہ لیتے تو اس کی درآمد پھر بھی ادھر ہی جانی تھی۔ یوں نہیں تھا کہ جائیداد کا مسئلہ ہے اگر نہیں ملتی تو اس کو چھوڑ دوں، پہلے بھی تو میں اس سے تھوڑا استفادہ کر رہی تھی، پہلے بھی فقیروں کو مل رہا تھا۔ اگر بات اتنی ہوتی تو بی بیؑ چپ ہو جاتیں لیکن بات اس سے بڑی تھی۔ جب جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے دیکھا کہ رسولِ اللہؐ کے بتائے ہوئے نظامِ الٰہی سے اجتناب کیا جا رہا ہے تو آپؑ فدک کو بہانہ قرار دے کر میدان میں آئیں۔

امام علیہ السلام کی زبانی فدکِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی وضاحت

فدک رنجِ فاطمہؑ ہے لیکن فدک ہے کیا؟ یہ امام ہفتم سے پوچھیں۔ امامِ موسیٰ کاظم علیہ السلام نے رنجِ فاطمہؑ، دردِ فاطمہؑ و زخمِ فاطمہؑ کی تشریح ہارون رشید کے سامنے بیان فرمائی ہے۔ ہارون الرشید مکار، ظالم و ستمگر طاغوت تھا لیکن عوام میں اپنا چہرہ مقبول بنانا چاہتا تھا۔ چونکہ ستمگر حکمرانوں کی ایک روش یہ ہے کہ وہ ہر حربہ استعمال کر کے لوگوں کے اندر محبوب بننا اور اپنا احترام پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہارون الرشید نے اعلان کیا کہ بنواُمیہ کے دور میں جس جس کا نقصان کیا گیا، جو سامان لوٹا و چھینا گیا وہ لسٹ میں اپنا نام لکھوائیں، ہم اُن کا

سارا نقصان پورا کریں گے۔

سب لوگوں نے آ کر اپنا نام لکھوایا اور معاوضہ لے گئے۔ کسی نے کہا میرا درخت کاٹ دیا، کسی نے کہا میرا کھیت تباہ کر دیا، کسی نے کہا میری گائے اُٹھا کر لے گئے، کسی نے کہا میری بکری لے گئے، کسی نے کہا میری دیوار گرا دی، کسی نے کہا میرا افلاں رشتہ دار قتل کر دیا۔ جس طرح آج نقصان ہوتا ہے اور حکومت کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ انہیں معاوضہ دیا جائے گا تو خاندانِ شہداء کو لے کر کچھ بیوپاری بھی چلے جاتے ہیں اور حکومتی دفتروں کے سامنے کھڑے ہو کر بتاتے ہیں کہ اس دھماکے میں ہمارا اتنا نقصان ہوا ہے۔ ہارون الرشید نے یہی کام کیا کہ بنواُمیہ کے زمانے میں جس کا جو سامان لوٹا گیا تھا اسے تھیلیاں بھر بھر کر معاوضہ دیا گیا۔

امام ہفتمؑ یہ سب دیکھ رہے تھے۔ ہارون، امامؑ سے کہنے لگا کہ کہاں ہے آپ کا وہ باغِ فدک؟ میں ابھی شاہی نوٹیفکیشن جاری کرتا ہوں کہ یہ پراپرٹی آپ کو لوٹائی جائے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

اِنَّ هَارُوْنَ الرَّشِيْدَ كَانَ يَقُوْلُ لِمُوْسَى بْنِ جَعْفَرٍ: خُذْ فَدَكًا حَتّٰى أَرُدَّهَا إِلَيْكَ، فَيَأْبٰى حَتّٰى اَلَحَّ عَلَيْهِ، فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَا اٰخُذُهَا إِلَّا بِحُدُوْدِهَا قَالَ: وَمَا حُدُوْدُهَا؟ قَالَ: إِنْ حَدَّدْتُهَا لَمْ تَرُدَّهَا قَالَ: بِحَقِّ جَدِّكَ إِلَّا فَعَلْتَ؟

قَالَ: أَمَّا الْحَدُّ الْاَوَّلُ فَعَدَنُ، فَتَغَيَّرَ وَجْهُ الرَّشِيْدِ وَقَالَ: اَيُّهَا، قَالَ: وَالْحَدُّ الثَّانِيْ سَمَرْقَنْدُ، فَارْبَدَ وَجْهُهُ قَالَ: وَالْحَدُّ الثَّالِثُ اَفْرِيْقِيَةُ فَاسْوَدَ وَجْهُهُ وَقَالَ: هِيْهِ، قَالَ: وَالرَّابِعُ سِيْفُ الْبَحْرِ مِمَّا يَلِى الْجُزُرَ وَاَرْمِيْنِيَةُ۔

قَالَ الرَّشِيْدُ: فَلَمْ يَبْقَ لَنَا شَيْءٌ، فَتَحَوَّلَ إِلٰى مَجْلِسِيْ، قَالَ مُوْسٰى (ع): قَدْ أَعْلَمْتُكَ أَنَّنِيْ إِنْ حَدَّدْتُهَا لَمْ تَرُدَّهَا۔ فَعِنْدَ ذٰلِكَ عَزَمَ عَلٰى قَتْلِهِ...... [1]

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مخاطب ہو کر ہارون رشید کہتا ہے:

---

[1]...... (مناقب آل أبی طالبؑ - ابن شهر آشوب، المازندرانیؒ، المتوفی: سنة ۵۸۸ھ، الجزء ۴، صفحه ۳۲۱-۳۲۰)
(بحار الأنوار - الشیخ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۲۹، صفحه ۲۰۱-۲۰۰، والجزء ۴۸، صفحه ۱۴۴)

فدک لے لیجئے، میں اسے آپ کو واپس لوٹانا چاہتا ہوں۔

امامؑ نے انکار کیا تو ہارون نے آپؑ سے اس پر اصرار کیا۔

آپؑ نے فرمایا: میں اسے نہیں لوں گا مگر اس کی تمام حدود کے ساتھ۔

ہارون نے کہا: اس کی حدود کیا ہیں؟!

امامؑ نے فرمایا: اگر میں اس کی حدود بیان کروں تو تم مجھے نہیں لوٹاؤ گے۔

ہارون نے کہا: آپ کے جد کے حق کا واسطہ، بیان فرمائیں۔

امامؑ نے فرمایا: جہاں تک اس کی پہلی حد کا تعلق ہے تو وہ عدَن ہے۔

پس ہارون کا چہرہ متغیر ہو گیا اور اس نے کہا: یہ کیا؟!

پھر امامؑ نے فرمایا: اس کی دوسری حد سمرقند ہے۔

پس ہارون کا چہرہ خاکستر ہو گیا۔

امامؑ نے فرمایا: اس کی تیسری حد افریقہ ہے۔

پس ہارون کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ تعجب سے کہنے لگا: اوہ!

امامؑ نے فرمایا: اس کی چوتھی حد سیف البحر ہے جو جزائر اور ارمینیہ کے بعد آتی ہے۔

ہارون نے کہا: پس ہمارے لئے تو کچھ بھی نہیں بچا، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ میری جگہ بیٹھ جائیں۔

امامؑ نے فرمایا: میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اگر میں نے اس کی حدود بیان کیں تو تم اسے نہیں لوٹاؤ گے!

پس اسی دوران ہارون نے امامؑ کے قتل کا ارادہ کر لیا۔

ہارون تیز تھا لہٰذا سمجھ گیا تھا کہ یہ تو میری ساری سلطنت و حکومت ہے۔

یہ ہے فدک کی تفسیر۔ رنجِ زہراؑ یہ تھا اور جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو اس دن آرام ملے گا جس دن سیدہ سلام اللہ علیہا کا یہ فدک لوٹ کر آ جائے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا حکومت مخالف قیام

اسلامِ فاطمیؑ و اسلامِ حسینیؑ کیا چیز تھی اور ہم نے اسے کیا بنا دیا؟ اور ابھی تک ہم تک پہنچا کیا؟ اس حکومت نے ایک قدم اٹھایا جو بطورِ واضح تعلیماتِ اسلام کے مطابق نہیں تھا لہٰذا جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا حکومت کے مقابلے میں آ گئیں۔ یہ کوئی فردی جنگ نہیں تھی بلکہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا یہ بتانے کیلئے حکومت کے مقابلے میں آئیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو اسلام سکھایا تھا اس کے اندر یہ پہلو بھی موجود ہے، یہ فرائض و وظائف بھی موجود ہیں جو امت کو سرانجام دینے ہیں۔

آپؑ نے اپنے قیام سے یہ ثابت کیا کہ جو دینی معیارات ہیں انہیں ہر حال میں پورا کرنا چاہئے۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے یہاں علی علیہ السلام کی امامت کے حق میں حوالے بھی دیئے۔ آپ نے حکومت کے مقابلے میں آ کر مناظرہ نہیں بلکہ مبارزہ کیا۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے امت کو بتا دیا کہ اگر تم حکومت کے اندر انحراف دیکھ رہے ہو تو تمہارے اوپر واجب ہو جاتا ہے کہ اس حکومت کے خلاف نکل آؤ۔ حاکم کے مقابلے میں آ کر امت کو بتایا کہ یہ تمہارا فریضہ و وظیفہ بنتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حیاتِ مبارک میں بتا گئے تھے کہ تمہیں ایسے حکمرانوں کے ساتھ کیسے رہنا ہے؟ ایسی حکومتوں کے ساتھ تمہارا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟ آیا ان کی ہر بات پر تمہیں تسلیم رہنا ہے؟ ان کی ہر بات پر سر جھکا کے رہنا ہے؟ بعد میں تعلیماتِ دین ایسی بنا دی گئیں کہ حاکم چاہے فاسق و فاجر، غلط و صحیح یا جیسا بھی ہو وہ اولی الامر ہوتا ہے اور اس کے خلاف بات کرنے والا خارجی ہے۔

قیامِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو نمونہ عمل بننے سے روکنا

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے اقدام کو روکنے اور اسے لوگوں کیلئے سیرت و سنت نہ بنانے کے لئے جعلی حدیثیں بنائی گئیں کہ حاکم جو بھی ہو اور جیسا بھی ہو وہ اولی الامر ہے لہٰذا سید الشہداء علیہ السلام نے جب حکومت کے خلاف قیام کیا تو انہی جعلی حدیثوں کے مطابق فتویٰ دیا گیا کہ اسلام کے اندر حاکمِ وقت کے خلاف قیام کرنا اسلام سے خارج ہو جانا ہے اور جو اسلام سے خارج ہو جائے اور حاکمِ وقت کے خلاف قیام کرے اس کا قتل

واجب ہے۔ قاضی شریح نے یہ فتویٰ باقاعدہ لکھ کر دیا کہ امام حسین علیہ السلام حاکمِ وقت کے خلاف نکلے ہیں اور حاکمِ وقت جیسا بھی ہو اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے، حاکمِ وقت کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ بے شک یزید شرابی ہو، کبابی ہو، فاسق و فاجر ہو، زانی ہو، قاتل ہو لیکن اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ چھوڑ دو، تم فقط اس کی اطاعت کرتے جاؤ، وہ اگر تمہیں غلط بھی کہتا ہے تو تم اس کی بات کو مانتے جاؤ۔ اس کو باقاعدہ دین بنا دیا گیا۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے بتایا کہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ یہ دین نہیں ہے بلکہ جہاں بھی دیکھو کہ حاکم کا فلاں عمل اسلام کے برخلاف ہے تو آپ اس کے سامنے آ کر باقاعدہ اظہارِ وجود کرو۔

انقلابِ فاطمیؑ، راہِ امام خمینیؒ

انقلاب اسی چیز کا نام ہے جو جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے تعلیم دیا اور عمل کر کے دکھایا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ امام خمینیؒ نے پہلی دفعہ اسلام میں انقلاب داخل کر دیا ہے۔ بہت ساری ایسی چیزیں ہیں جو ہم نے نادانی، لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے اپنائی ہوئی ہیں مثلاً ہم میں سے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ولایت فقیہ تو تشیع کا حصہ نہیں ہے یہ تو امام خمینیؒ نے آ کر اسلام میں داخل کر دی ہے۔ البتہ اس کی ساری تفاصیل مل جائیں گی۔ ہر سال ان لوگوں کا واشنگٹن میں اجلاس ہوتا ہے۔ یہ اس میں شریک ہوتے ہیں اور اس میں انہیں یہ دستور دیا گیا ہے کہ تم نے تشیع سے خمینیات کو نکالنا ہے۔ خمینیات کیا ہیں؟ کہا کہ خمینیؒ نے تشیع کو سیاست سے ملا دیا ہے، سیاست کو مذہب میں لے آئے ہیں۔ تم نے تشیع کو اس سے جدا کرنا ہے، سیاست کو باہر نکالنا ہے اور مذہب کو خالص کر کے پیش کرو۔ اس کام کیلئے بجٹ و پیسہ ہم دیں گے۔ اب یہ علماء و لوگ مذہب کو اپنے تئیں خالص بنانے یعنی مذہب کو سیاست سے پاک کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

امام خمینیؒ چند شخصیات کی سیرتوں سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ انہوں نے اپنی فقہ، اجتہاد، سیر و سلوک اور نہضت میں جن معصومینؑ کو اپنے لیے اسوہ بنایا ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، امیر المومنین علیہ السلام، سید الشہداء علیہ السلام اور خصوصیت کے ساتھ جناب زہراء سلام اللہ علیہا کی

سیرت شامل تھی۔امام خمینیؒ نے کہا کہ ان سیرتوں سے میں نے یہ دین سیکھا ہے۔میں نے سیرتِ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا سے انقلاب سیکھا ہے۔ تاریخِ اسلام میں پہلی انقلابی سیرت جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی تھی۔انقلاب کا باب حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا نے کھولا ہے۔کچھ فتوحات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک سے ہوئیں جنہیں قرآن مجید نے ان الفاظ میں ذکر کیا:

اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًاۙ ......[1]

(اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے آپ کو فتح دی، ایک نمایاں فتح۔

یعنی امت کے اوپر کچھ در، کچھ راستے آپؐ کے ذریعے سے کھولے ہیں۔

وہ فتوحات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیں پھر مشکلات کا شکار ہوگئی لہٰذا ان فتوح مبین کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے حضرتِ زہراء سلام اللہ علیہا میدان میں آئیں۔

......اصطلاحِ دینی اور معنٰی ہندی

عربی زبان میں فتح کھولنے کو کہتے ہیں، غلبہ وکٹری (Victory) پانے کو نہیں کہتے۔ہم دین کی اصطلاح عربی سے لیتے ہیں لیکن اسے ہندی لباسِ معنٰی پہنا دیتے ہیں۔لفظ قرآنی ہوتا ہے جبکہ معنٰی ہندی ہوتا ہے۔اقبالؒ کے بقول لے حجازی ہوتی ہے نغمہ ہندی ہوتا ہے۔اسی لئے یہ دین بن گیا ہے جو ابھی ہمارے پاس موجود ہے۔یہ ہمارے پاس الفاظ میں حجازی، عربی، اسلامی ومحمدیؐ ہے لیکن روح کے لحاظ سے ہندی ہے۔ جیسے عربی زبان میں دعوت خدا کی طرف بلانے کو کہتے ہیں۔دعوتِ الی اللہ یعنی اللہ کی طرف بلانا۔کھانا کھلانے کو دعوت نہیں بلکہ ضیافت کہتے ہیں۔

پس عربی زبان میں بند راہ کے کھلنے کو فتح کہتے ہیں۔جب بند ابواب کو کھول دیا جائے تو آپ نے فتح الباب کیا ہے مثلاً مسجد کا دروازہ بند تھا لیکن متولیِ مسجد نے کھول دیا تو یہ فتحِ باب کیا ہے یہاں کوئی وکٹری نہیں

---

[1]......(سورۃ الفتح، آیہ ۱)

ہوئی ہے۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے بند راستے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے کھولے۔ پس:

إِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِيْنًا

ہم نے آپ کے ذریعے سے بہت عظیم راہیں کھول دی ہیں۔

قیامِ سیدہ سلام اللہ علیہا اور فتحِ مبین

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد یہ راہیں فوراً بند کر دی گئیں لہٰذا جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے پھر ایک فتحِ مبین انجام دی۔ آپؑ نے امت کے لئے راستہ کھولا یعنی امت کو فریضہ و وظیفہ بتایا، دین بتایا، اسلام سمجھایا اور تمام انبیاء علیہم السلام کی نعمت کا نچوڑ بتایا کہ اسلام اس چیز کا نام نہیں ہے کہ تو اپنے گھر میں بیٹھ کے مصلیٰ بچھا کے اپنی نماز پڑھ، اپنی جنت کی فکر میں رہ، تجھے اس سے کوئی سروکار نہ ہو کہ تو اس وقت کس حکومت کے سائے میں زندگی بسر کر رہا ہے اور یہ حکومت کیا کر رہی ہے؟

حکومت کے خلاف آواز اٹھانا، حکومت کی غلط پالیسیوں پر اعتراض کرنا، حکومت کے آرڈیننس پہ اعتراض کرنا، حکومت کے نوٹیفکیشن پہ اعتراض کرنا، اس کو چیلنج کرنا اور غلط ثابت کرنا آج کل بھی سیاسی عمل کہلاتا ہے؟ پس یہ کوئی جائیداد کا جھگڑا نہیں تھا بلکہ فدک کے بہانے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا پورے نظام کو زیرِ سوال لے آئیں۔ آپؑ نے امت کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ غور کرو یہ تمہارے ساتھ کیا ہوا؟ حزبوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں کیا بتا کر گئے تھے اور تم کن راہوں پہ چل نکلے؟

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے اپنے اقدام پر لبیک کہلوانے کیلئے مدینے میں ہر دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کوئی بھی حاضر نہیں ہوا۔ اسلام کو سمجھنے والے، حافظِ قرآن، حافظِ حدیث، معلمِ قرآن، معلمِ حدیث، نمازی، تہجد گزار اور بڑے پاکیزہ لوگوں نے کہا کہ آپ عجیب بات کرتے ہیں کہ ہم حکومت کے مقابلے میں آجائیں، حکومت کی بات پر ہم اعتراض کریں، جو کر دیا، کر دیا، جو ہو گیا سو ہو گیا پس آپ بھی خاموش رہیں۔ انہوں نے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی آواز پہ لبیک نہیں کہی، ہم فکر نہیں ہوئے، ہم راہ نہیں ہوئے لیکن سیدہ سلام اللہ علیہا تنہا ہونے

قیامِ سیدہ سلام اللہ علیہا اور فتحِ مبین

کے باوجود خاموش نہیں بیٹھیں۔آپ ہر اس فرد سے ناراض ہوگئیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نظامِ ولایت سے انحراف پر راضی اور خاموش رہا۔

ناراضگی، انقلاب کا آغاز

آپ انقلابی نظریات پڑھیں کہ انقلاب شروع کہاں سے ہوتا ہے۔دُنیا کے تمام ماہرین سوشیالوجی کا اتفاق ہے کہ انقلاب ناراضگی و ناراحتی سے شروع ہوتا ہے۔ جو ناراض نہ ہو وہ کبھی انقلابی نہیں ہوسکتا۔ جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا بانی انقلاب ہیں۔درحقیقت اصولِ انقلاب جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا نے رقم کئے ہیں۔

لوگوں کو گوسفندی مذہب میں سکھایا جاتا ہے کہ جہاں ہو راضی رہو۔ جہاں ناراض ہونا چاہئے وہاں رضامندی اور جہاں راضی ہونا چاہئے وہاں ناراضگی۔ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا مطہرہ ہیں کہ جن کی طہارت کی گواہی قرآن و معصومین علیہم السلام دے رہے ہیں اُس بی بی سلام اللہ علیہا کے بارے میں کہنا کہ وہ پراپرٹی کے رنج میں مبتلا تھیں یہ بی بیؑ کی عصمت کے ساتھ سازگار نہیں ہے چونکہ ذاتی رنج فضیلت نہیں بلکہ عیب ہوتا ہے اور جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا ہر عیب سے مبرہ و منزہ ہیں۔

حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا مظہرِ رضا و غضبِ خدا

اللہ کی خاطر ناراض ہونا، اللہ کے غضب پر غضبناک ہونا اور اللہ کی رِضا پر راضی ہونا کمال کی علامت ہے۔اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی ناراضگی فاطمہؑ کی ناراضگی ہے۔ فاطمہؑ کہاں ناراض ہوتی ہیں؟ جہاں اللہ ناراض ہوتا ہے، اللہ کہاں ناراض ہوتا ہے؟ جہاں پر حدِ خدا جاری نہ ہورہی ہو، جہاں اللہ کا نظام قائم نہ ہو۔ فاطمہؑ مظہرِ سخطِ خدا ہیں لہٰذا فاطمہ سلام اللہ علیہا کی ناراضگی وہیں ہے جہاں اللہ کی ناراضگی ہے۔ جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا ان لوگوں کو پسند نہیں کرتیں جو امامت و ولایت سے دور ہوگئے اور انہیں بھول گئے۔

ہم مدعی ہیں کہ ہم دُعائے فاطمہؑ ہیں اور دُعائے فاطمہؑ لے رہے ہیں۔اے دُعائے فاطمہؑ کے دعویدار!

پہلے یہ دیکھ لے کہ تو فاطمہؑ کی دُعا ہے یا فاطمہؑ تجھ سے ناراض ہے، پہلے اپنا عمل تو دیکھ کہ تو کھڑا ہوا کہاں ہے۔ جس دکھ کو فاطمہؑ لے کر اس دُنیا سے رنجور چلی گئیں وہی عمل آج میرا بھی ہے اور میں کہتا ہوں کہ میں دُعائے فاطمہؑ ہوں۔ مجھ میں اور اُس میں کیا فرق ہے جو اُس وقت نظامِ ولایت سے دور تھا اور جو آج نظامِ ولایت سے دور ہو۔ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے درد کو سمجھئے۔ جنابِ سیدہؑ کا یہ خطبہ پراپرٹی کیس کیلئے نہیں بلکہ حماسی خطبہ ہے۔ یہ غیر الٰہی نظام پر فاطمہؑ کا حملہ ہے۔ یہ الٰہی نظام کی خاطر قیامِ فاطمہؑ ہے اور آج زمانے کو قیامِ جنابِ سیدہؑ کی اشد ضرورت ہے۔

اللہ جب کسی کو اپنی رضا کا مظہر قرار دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ راضی بھی خدا کے لئے ہے اور ناراض بھی خدا کے لئے ہے۔ جو حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی ناراضگی میں اپنی ناراضگی نہیں ملا سکتا وہ پیروکارِ فاطمہ زہراءؑ نہیں ہے۔ پہلے یہ دیکھیں کہ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کس بات پر ناراض ہیں اور کس کس سے ناراض ہیں؟

انصار سے خطاب

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا صرف چند شخصیات سے ناراض نہیں تھیں بلکہ آپؑ ان لوگوں سے بھی ناراض تھیں جو سب کچھ ہوتا دیکھ رہے تھے لیکن کچھ بول نہیں رہے تھے۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے پہلے حکمرانوں کو مخاطب کیا پھر انصار کے مردوں کو مخاطب کیا اور پھر انصار کی عورتوں کو۔

آپ اسی خطبہ فاطمیہؑ میں ایک جگہ ان لوگوں کو خطاب کر کے فرماتی ہیں:

أَيُّهَا النَّاسُ، اِعْلَمُوْا اَنِّیْ فَاطِمَةُ وَ أَبِیْ مُحَمَّدٌ......

اے لوگو! مجھے پہچانتے ہو؟ میں فاطمہؑ ہوں۔ میں اُسی رسولؐ کی بیٹی ہوں جس کی رسالت کی گواہی دے کر مسلمان ہوئے ہو۔ وہی محمدؐ جس کے تم ہمراہ تھے، جس کی وجہ سے تم نے اتنا شرف پایا ہے۔ وہی محمدؐ جس کا جنازہ چھوڑ کر تم چلے گئے تھے میں اُسی کی بیٹی ہوں۔ آپ کس درد و سوگ کے ساتھ ان لوگوں کے سامنے یہ جملے بیان فرما رہی تھیں۔

بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا نے مسجد میں انصار کی طرف رُخ کر کے فرمایا: اے انصار، میرے بابا کے ناصرو!

انصار سے خطاب

میرے بابا کے مددگارو! میں اُسی محمدؐ کی بیٹی ہوں کیا تم دیکھتے نہیں ہو میری میراث لٹ رہی ہے۔ تم وہی انصار ہو جو میرے بابا کے ساتھ مل کر شمشیر چلایا کرتے تھے؟ اے بنی قیلہ! مجھے تو پتا ہے تم بڑے دلیر و شجاع ہو، تم نے بڑی جنگوں میں بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں، تم نے مشرکین کے قدم اُکھاڑ دیئے تھے، میں اُن جنگوں میں دیکھتی رہی ہوں لیکن اے بنی قیلہ! میں وہی فاطمہؑ ہوں، اُسی رسولؐ کی بیٹی ہوں اور آج میں کچھ بتا رہی ہوں تو تم زبان بھی نہیں کھولتے، ہاتھ بھی نہیں ہلاتے، تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ بی بی سیدہؑ نے بہت دردناک جملہ بیان فرمایا:

أَيُّهَا الْمُسْلِمُوْنَ أُغْلَبُ عَلٰى إِرْثِيْ......[1]

اے مسلمانو! کیا نہیں دیکھتے کہ میں یہاں مغلوب ہوگئی ہوں، کیا نہیں دیکھتے یہاں میری بات سنی نہیں جا رہی اور تم کھڑے دیکھ رہے ہو۔ فرمایا کہ میں تم سے ناراض ہوں اور تمہارا عمل و رویہ بھی پسند نہیں کرتی۔

انصار کی عورتوں سے خطاب

اسی طرح بعض عورتیں روز جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے گھر کے باہر آکر واپس چلی جاتی تھیں اور روتی وتمنا کرتی تھیں کہ ہم کیوں جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی زیارت سے محروم ہوگئی ہیں۔ اب جبکہ وہ بیمار بھی ہیں تو ہمیں عیادت بھی نہیں کرنے دی جا رہی، وہ بار بار اصرار کرتیں، سفارشیں بھیجتیں اور وفد بھیجتیں۔ جنابِ سیدہؑ نے آخر کار اُن کا آنا قبول کیا اور فرمایا کہ صرف انصار کی خواتین آسکتی ہیں۔ عورتوں نے پوچھا:

يَا بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ كَيْفَ أَصْبَحْتِ مِنْ عِلَّتِكِ؟

اے رسول اللہؐ کی بیٹی! آپ نے صبح کیسی گزاری ہے؟ اور آپ بیماری کی حالت میں کیسی ہیں؟ یہاں حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے اُن کے سامنے گفتگو فرمائی۔ پہلے آپؑ نے حمدِ خدا کی اور رسولؐ پر درود و سلام بھیجا۔ اس خطبے کا انداز اور لب ولہجہ کچھ اور ہے جس کے چند الفاظ یہ ہیں:

---

[1]...... (الإحتجاج-أبي منصور أحمد بن علي بن أبي طالب الطبرسیؒ)

أَصۡبَحۡتُ وَ اللهِ عَائِفَةً لِدُنۡیَاکُنَّ قَالِیَةً لِرِ جَالِکُنَّ لَفَظۡتُھُمۡ بَعۡدَ أَنۡ عَجَمۡتُھُمۡ وَ سَئَمۡتُھُمۡ بَعۡدَ أَنۡ سَبَرۡتُھُمۡ فَقُبۡحًا لِفُلُوۡلِ الۡحَدِّ وَ اللَّعۡبِ بَعۡدَ الۡجِدِّ وَ قُرۡعِ الصِّفَاتِ وَ صَدۡعِ الۡقَنَاةِ وَ خَتَلِ الۡاٰرَاءِ وَ زُلَلِ الۡأَھۡوَاءِ وَ بِئۡسَ {مَا قَدَّمَتۡ لَھُمۡ أَنۡفُسُھُمۡ أَنۡ سَخِطَ اللهُ عَلَیۡھِمۡ وَ فِی الۡعَذَابِ ھُمۡ خَالِدُوۡنَ ...... ۱} ۲

میں نے صبح اس حالت میں کی کہ خدا کی قسم! تمہاری دنیا سے مجھے محبت نہیں ہے۔ اور تمہارے مردوں سے بیزار ہوں۔ اور ان کے ناموں کو اپنے منہ سے دور پھینک دیا ہے۔ میں انہیں پوری طرح جانچ کر ان پر غضبناک ہوئی ہوں۔ کتنا برا عیب ہے تلواروں کا کند ہو جانا، سخت کوشش کے بعد لہو ولعب میں مبتلا ہو جانا، صفات کا ختم ہو جانا، نیزوں کا ٹوٹ جانا، آراء کا باطل و فاسد ہو جانا اور خواہشات کی پیروی میں گمراہ ہو جانا۔ اور اپنے لئے کتنا برا ذخیرہ آگے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر غضب فرمایا اور عذابِ الٰہی میں ہمیشہ رہیں گے۔

یہ دن میں نے اس حالت میں شروع کیا کہ میں تمہاری زندگی، تمہاری دُنیا، تمہارے طور طریقوں سے سخت نفرت دل میں رکھتی ہوں، میں نے تمہاری دنیا سے نفرت کی حالت میں دن شروع کیا ہے۔

اس وقت غاصبین سامنے نہیں بیٹھے ہوئے تھے بلکہ انصار کی عورتیں بیٹھی تھیں جنہوں نے فدک غصب نہیں کیا تھا، پراپرٹی کے غصب میں اُن کا کوئی دخل نہیں تھا۔ انہیں جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا بتا رہی ہیں کہ میں تم سے اور تمہاری دُنیا پر بہت غضبناک ہوں۔ میں تمہارے مردوں سے بھی بہت متنفر ہوں، میرا دل تمہارے مردوں کی نسبت غضب و ناراضگی سے بھرا ہوا ہے۔......لَفَظۡتُھُمۡ بَعۡدَ أَنۡ عَجَمۡتُھُمۡ......میں نے تمہارے مردوں کو آزمایا ہے لیکن وہ امتحان میں ناکام ہوئے اور میں نے اُنہیں دور پھینک دیا ہے، اس طرح دور پھینک دیا ہے کہ اب کبھی دوبارہ اُنہیں نہیں اُٹھاؤں گی۔ ......وَ سَئَمۡتُھُمۡ بَعۡدَ أَنۡ سَبَرۡتُھُمۡ......میں نے تجربہ کیا ہے نہ کہ میں ان پر ایسے ہی غضب ناک ہوں، اُس تجربے کے بعد اب میرے دل میں ان کی نفرت بھر گئی ہے۔ اب میں تمہارے مردوں کو دیکھنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔

۱......(سورۃ المائدہ، آیہ ۸۰)

۲......(الاحتجاج-أبی منصور أحمد بن علی بن أبی طالب الطبرسیؒ)

کیا آپؑ کی صرف دو یا چند شخصیتوں سے ذاتاً ناراضگی تھی ؟ آپؑ فرما رہی ہیں کہ اے انصار کی عورتو! میں تم سے، تمہارے مردوں، تمہارے زندگی اور تمہاری دُنیا ہر چیز سے بیزار ہوچکی ہوں، میں نے تمہیں اس طرح چھوڑ دیا ہے کہ اب دوبارہ کبھی بھی تمہارا رُخ نہیں کروں گی۔

لفظ کو لفظ اس لئے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ منہ سے نکلتا ہے تو دوبارہ منہ میں واپس نہیں آتا۔ ملفوظ اُس پھینکی ہوئی چیز کو کہتے ہیں جو دوبارہ واپس نہ آسکے۔ حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا نے فرمایا:...... **لَفَظْتُهُم**...... میں نے تمہیں چھوڑ دیا ہے، اس طرح چھوڑا ہے کہ اب کبھی تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گی۔

پھر اُس کے بعد حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا نے اُن کو شرم دلانا شروع کی...... **فَقُبْحًا**...... ننگ ہو تمہارے اس عمل پر، ننگ ہو تمہارے رویوں پر، ننگ ہو تمہاری سوچوں پر، مردہ باد تم، مردہ باد تمہارے رویئے، مردہ باد تمہارے عمل، مردہ باد تمہارے ردِ عمل۔ مردہ باد اظہارِ ناراضگی ہے۔ مردہ باد کہنا مذہبِ فاطمہؑ ہے۔ مردہ باد پہلی دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد فاطمہ سلام اللہ علیہا کی زبان سے نکلا ہے۔ آپ نے کن کو مردہ باد کہا؟ اُن کو کہا جو نظامِ ولایت کو چھوڑ کر کسی اور طرف چلے گئے ہیں، جنہوں نے صرف باغ نہیں بلکہ نظامِ خدا کو فراموش کر دیا ہے، جنہوں نے ولی کو تنہا چھوڑ دیا، اُن عورتوں کو بھی کہا کہ تم بھی مردہ باد، تمہاری دُنیا پر بھی ویل ہو۔ تمہاری سب چیزوں پر ویل ہو۔ پھر آپؑ نے سورۂ مائدہ کی آیہ ۸۰ سے انہیں عذابِ خدا کی خبر سنائی۔

پس جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی ناراضگی صرف چند شخصیات سے نہیں تھی بلکہ ہر اس فرد سے تھی جو امت کو نظامِ الٰہی سے منحرف ہوتا دیکھ رہا تھا لیکن خاموش تھا۔ لوگوں کے اس مجرمانہ سکوت کو توڑنے اور انہیں راہِ رسول پر لانے کیلئے آپؑ نے دو قسم کے مبارزے انجام دیئے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا مثبت و منفی مبارزہ

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے پہلے مثبت مبارزہ شروع کیا یعنی قیام، اقدام و حرکت شروع کر کے حکمران پارٹی، اُن کے حامیوں، خواص اور عام لوگوں کو جھنجوڑا کہ شاید متوجہ ہوجائیں۔ قیام کے پہلے مرحلہ میں عظیم،

انقلابی وحماسی خطبہ ارشاد فرمایا اور راہِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن کے سامنے زندہ کیا لیکن جب دیکھا کہ یہ پھر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے تو اُس وقت جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے مثبت مُعارَضہ کو منفی معارضہ میں بدل دیا۔ منفی و مثبت معارضہ و مبارزہ سیاسی دُنیا کی اصطلاح ہے۔ پہلے مثبت مبارزہ اور پھر منفی مبارزہ دونوں جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی سنت حسنہ ہیں۔ البتہ پاکستانی سیاست و ذہنیت کی اصطلاح میں توڑ پھوڑ، دہشت گردی اور قتل و غارت کرنا منفی مبارزہ و منفی سیاست کہلاتا ہے۔ لیکن دُنیائے سیاست، علمِ سیاست و میدانِ سیاست میں کسی بھی ظلم کے خلاف مبارزے اور مقابلے کے دو راستے ہوتے ہیں۔

مثبت مبارزہ سے مراد

......مثبت مبارزہ سے مراد

مثبت مبارزہ سے مراد ایسی انقلابی حرکت و قیام ہے کہ جس میں آپ حاکم طبقے کے خلاف سامنے آکر باقاعدہ نزاع کریں، مورچہ بنا کر اُس کے مقابلے میں آجائیں، اُس کے ہر اقدام کو چیلنج کریں اور اُس کے خلاف آواز اُٹھائیں۔ جس میں ایک طرف حکومت اقدام کرتی ہے اور حکومت کے اقدام کو ناکام و بے اثر کرنے کیلئے اُس کے مقابلے اقدامات کئے جاتے ہیں۔ جلسے کرنا، احتجاجی جلوس نکالنا، اجتماعات کرنا، حکومت کی مذمت کرنا، اُمت کو آگاہ و بیدار کرنا، اُن کو حکومت کے مقابلے میں لے آنا اور حکومت کے اقدامات کو ناکام و بے اثر کرنے کیلئے عوام کو میدان میں اُتار دینا مثبت جنگ اور مثبت مبارزہ و معارضہ کہلاتا ہے۔

......منفی مبارزہ سے مراد

سیاست کی دُنیا میں منفی مبارزہ، ناراضگی، رنجش، بائیکاٹ اور سول نافرمانی کو کہتے ہیں یعنی آپ احتجاج، قیام و مبارزہ نہ کریں، ٹکرائیں نہیں، مقابلے میں نہ آئیں، میدان میں نہ اُتریں بلکہ نافرمانی شروع کردیں، حکومت کے فرامین ماننے سے انکار کردیں، اُس کی حاکمیت کا انکار کردیں، اُس کو قبول کرنے اور اور اُس کی تائید کرنے سے انکار کردیں۔ جنابِ سیدہ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کی اصطلاح میں اس کو رنجش و ناراضگی کہتے ہیں۔

غصبی حکومت کے جواز کا انکار

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے اس حکومت کا بائیکاٹ کیا۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے پہلے مثبت مبارزہ شروع کیا یعنی حکومت کے مقابلے میں آئیں۔ حاکم طبقے کے مقابلے میں آنے کو خانقاہیت، ذکر، ورد، رسم اور حاجتیں مانگنا نہیں بلکہ سیاست کہتے ہیں۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا اس حکومت کے جواز کو قبول نہیں فرمارہی تھیں۔ آپ لوگوں کو بتانا چاہتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حکومت رکن دین، اساسِ دین، محورِ دین اور مدارِ دین ہے۔

کھجوروں کے باغ کی کیا حیثیت

جائیداد کے لئے اتنا بڑا قیام شروع نہیں ہوتا کہ ہر چیز لے کر میدان میں آجائیں۔ جس طرح سیدالشہداء علیہ السلام وآلِ رسول علیہم السلام کا سارا سرمایہ ومیراث لے کر میدان میں اُترے اسی طرح جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا تمام ہستی لے کر میدان میں اُتریں۔ کھجوروں کے ایک باغ کی اتنی قیمت نہیں ہے کہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا اپنی ہستی، شخصیت، عظمت، مقام، منزلت، عفت وعصمت لے کر میدان میں آگئی ہوں۔ کیوں سب کچھ لے کر میدان میں آئیں؟ اس لئے کہ سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا اور سب کچھ بچانے کا وقت تھا نہ کہ چند کھجوریں بچانے کا۔ اس وقت زحمتِ رسولؐ ونظامِ الٰہی کو بچانا تھا ورنہ کھجوروں کا باغ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کیلئے کیا حیثیت رکھتا ہے۔

مثبت مبارزہ کو منفی مبارزہ میں بدلنا

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے پہلے مثبت اقدام کے طور پر صریح اعلانِ مخالفت کیا اور پورے نظام کو زیرِ سوال لے آئیں۔ جب آپؑ نے مسجد میں خطبہ دیا تو مدینہ میں کوئی بھی آپؑ کی حمایت کیلئے نہیں اُٹھا۔ مثبت مبارزہ عوام کی حمایت سے ہوتا ہے لیکن یہ میدان میں نہیں آئے حالانکہ روئے اور افسوس بھی کیا لیکن پھر بھی

حکومتی اقدامات کے ساتھ رہے لہٰذا جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا خطبہ دے کر مسجد سے واپس آئیں اور آ کر روش بدل دی۔ آپؑ نے حکمرانوں، حکومتی طبقے اور ان کے حامیوں کا مکمل بائیکاٹ کر دیا۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے کہا کہ کوئی مجھ سے ملنے نہ آئے، یہ نظام مجھے قبول نہیں ہے، میں اس نظام سے راضی نہیں ہوں، میں ان تماشائیوں اور خاموش لوگوں سے ناراض ہوں۔

ناراضگی کی شدت

سوال پیدا ہوتا ہے کہ باغ تو ساری ملت نے نہیں لیا تھا بلکہ وہ حکومتی فرمان تھا جس میں ایک دو آدمی شامل تھے تو پھر باقی سب سے کیوں ناراض ہو گئیں؟ حتیٰ اس حد تک ناراض ہوئیں کہ حضرت علی علیہ السلام کو وصیت کی کہ کوئی میرے جنازے میں بھی نہ آئے، نہ مرد آئیں نہ عورتیں، میری قبر کا نشان بھی مٹا دو، میرے مزار پر بھی کوئی نہ آئے۔ آج تک مبارزۂ فاطمہؑ جاری ہے۔ جب بھی کوئی جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی قبر کی طرف جائے گا اور نہیں ملے گی تو پوچھے گا کہ سب کی قبروں کے نشان ہیں لیکن جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی قبر کا نشان کیوں نہیں ہے؟ تاریخ جواب دے، ملت یہ جواب تلاش کرے کہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی قبر کا نشان تک کیوں موجود نہیں ہے؟ آپؑ نے کیوں کہا کہ اے علیؑ! کوئی بھی میرے جنازے میں نہ آئے؟ یہاں بھی امیر المومنین علیہ السلام کا خیال رکھتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ یا علیؑ! میں ایک بہت دشوار وصیت کرنے والی ہوں جس پر عمل کرنا بہت سخت ہے۔ فرماتی ہیں کہ آپؑ کی صورتحال مجھے معلوم ہے، آپؑ کی مجبوری کا مجھے علم ہے، آپؑ دیکھ لیں اگر میرے وصی بن سکتے ہیں، میری وصیت پر عمل کر سکتے ہیں تو میں آپؑ کو وصی بناتی ہوں اور اگر آپؑ کیلئے ممکن نہ ہو تو مجھے آپؑ کی مجبوری کا احساس ہے لہٰذا میں کسی دوسرے کو اپنا وصی بناتی ہوں کہ وہ میری وصیت پر عمل کرے چونکہ اُس پر یہ اعتراض نہیں ہوگا جو آپؑ پر ہو سکتا ہے۔ وصیت یہ ہے کہ جب میں اس دُنیا سے جاؤں تو کسی کو اطلاع نہیں دینا، مجھے رات کو غسل دینا، رات کو کفن دینا، رات کو دفن کرنا، میری تشیع جنازہ میں کسی کو شریک نہ ہونے دینا اور میری قبر کا نشان مٹا دینا۔

مبارزہ فاطمہ سلام اللہ علیہا آج بھی جاری

سوال یہ ہے کہ اگر ذاتی رنجش تھی تو چند افراد سے تھی لیکن بائیکاٹ سب کا کیوں کر رہی ہیں؟ منع سب کو کیوں کر رہی ہیں؟ عوام، اُمت، خواص وحکومت سب کو محروم کیوں کر رہی ہیں؟ بی بی سلام اللہ علیہا کے اختیار میں یہی تھا کہ اب جبکہ میں نے خطبہ دے دیا لیکن تمہیں سمجھ نہیں آیا تو فاطمہؑ اس نظام سے راضی نہیں ہے اور اس دنیا سے ناراض جارہی ہے، نہ صرف آج اس حکومت اور افراد سے ناراض بلکہ قیامت تک جب تک نظامِ ولایت کسی سرزمین پر برپا نہیں ہوتا اُس سرزمین کے حکمرانوں سے بھی ناراض، اُن حکومتوں کے ساتھ تعاون کرنے والوں سے بھی ناراض اور اُن حکومتوں پر خاموش بیٹھنے والوں سے بھی ناراض ہوں۔ اتنی ناراض ہوں کہ نہ وہ میرے کفن میں آئیں، نہ میرے دفن میں آئیں، نہ میرے جنازے میں آئیں، نہ میری قبر پہ آئیں اور نہ میری مجلس میں آئیں۔

صرف آنسوؤں سے راضی کرنا ممکن نہیں

حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو راضی کرنا آسان نہیں ہے اس لئے خدا نے اپنی رِضا فاطمہ سلام اللہ علیہا کی رِضا میں رکھی ہے۔ اگر فاطمہ سلام اللہ علیہا دو آنسوؤں سے راضی ہوتیں تو وہ روتے ہوئے جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے پاس آرہے تھے لیکن فاطمہؑ راضی نہیں ہوئیں، ان لوگوں کا اصرار تھا کہ ہمیں ہمدردی کیلئے، زہراء سلام اللہ علیہا کو راضی کرنے کیلئے آنے کی اجازت دو، ہم عیادت کرنا چاہتے ہیں، ہم بیمار پرسی کرنا چاہتے ہیں، جب حضرت علی علیہ السلام نے پیغام پہنچادیا کہ حکمران آپ کی عیادت کیلئے آنا چاہتے ہیں تو فرمایا کہ نہیں آسکتے۔ دوسرے دن دوسرے لوگ آئے اور کہا کچھ خواص عیادت کیلئے آنا چاہتے ہیں تو بی بی سلام اللہ علیہا نے فرمایا نہیں آسکتے۔ پھر عام لوگوں نے عیادت کیلئے آنا چاہا تو فرمایا نہیں آسکتے۔ حتیٰ عورتیں عیادت کیلئے آنا چاہتی تھیں لیکن آپؑ نے فرمایا کہ نہیں آسکتیں۔ صرف ایک دفعہ انصار کی عورتوں کو آنے کی اجازت دی اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ کوئی مہاجر عورت میرے گھر میں قدم نہ رکھے۔ بی بی سلام اللہ علیہا نے انصار کی عورتوں کو بلا کر اس المیے کی طرف متوجہ

کیا۔ روایت میں لکھا ہے کہ بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا نے ان عورتوں کے سامنے ایک خطبہ دیا اور جب وہ عورتیں بی بی سلام اللہ علیہا کے گھر سے جا رہی تھیں تو کہرام مچا ہوا تھا، وہ اپنے مردوں کو لعنت ونفرین کر رہی تھیں کہ تم نے فاطمہؑ کا اتنا دل دکھایا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کا اصرار تھا کہ ہم جنازے میں آنا چاہتے ہیں، دو آنسوں بہالیں گے، قبر پر درود وسلام پڑھیں گے، سوگواری وعزا کریں گے، پرسہ دیں گے لیکن زہراء سلام اللہ علیہا کو یہ آنسو، درود وسلام، سوگواری، عزا اور پرسہ قبول نہیں ہے کیونکہ وہ تمہارے نظام، رویئے، خاموشی، تماشائی پن اور تفکر سے ناراض ہیں۔

صرف آنسوؤں سے راضی کرنا ممکن نہیں

دو آنسو بہا کر اگر جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو راضی کرنا ممکن ہوتا تو ثانی زہراء سلام اللہ علیہا کوفہ میں سب سے زیادہ کوفیوں سے راضی ہو جاتیں لیکن نہیں ہوئیں۔ بنت زہراء سلام اللہ علیہا جب کوفہ میں خطبہ دے رہی تھیں تو لوگ رو رہے تھے لیکن اُن کے آنسو دیکھ کر ثانی زہراء سلام اللہ علیہا کو بڑا غضب چڑھا۔ جنابِ زینب سلام اللہ علیہا نے اُن کو تنبیہ کی اور ثانی زہراء سلام اللہ علیہا نے انہیں ڈانٹا کہ

یَا أَهْلَ الْكُوْفَةِ یَا أَهْلَ الْخَتْلِ وَ الْغَدْرِ وَ الْجَدَلِ... اَتَبْكُوْنَ (عَلٰى أَخِیْ)؟ (اِیْ) أَجَلْ وَ اللهِ فَابْكُوْا، فَإِنَّكُمْ وَ اللهِ أَحَقُّ بِالْبُكَاءِ، فَابْكُوْا كَثِیْرًا وَ اضْحَكُوْا قَلِیْلًا......[1]

اے اہل کوفہ! اے دھوکا ومکر وفریب کے پجاریو! اور جھگڑا کرنے والو!......کیا تم (میرے بھائی پر) گریہ کرتے ہو؟ ہاں ہاں! خدا کی قسم روؤ کیونکہ خدا کی قسم تم ہی رونے کے قابل ہو، پس تم زیادہ روؤ اور کم ہنسو......

یَا أَهْلَ الْكُوْفَةِ یَا أَهْلَ الْخَتْلِ وَ الْغَدْرِ أَتَبْكُوْنَ؟... أَتَبْكُوْنَ وَ تَنْتَحِبُوْنَ؟! إِیْ وَ اللهِ فَأَبْكُوْا كَثِیْرًا، وَ اضْحَكُوْا قَلِیْلًا......[2]

اے اہل کوفہ! اے دھوکا ومکر وفریب کے پجاریو! تم گریہ کر رہے ہو؟!......تم رو رہے ہو؟! اور بلند آواز سے رو رہے ہو؟! ہاں! خدا کی قسم! زیادہ روؤ اور کم ہنسو......

---

[1]......(العوالم، الامام الحسین (ع)-الشیخ عبداللہ البحرانی)

[2]......(الملهوف علی قتلی الطفوف-علی بن موسٰی بن جعفر بن طاووسؒ، المتوفی: سنة ۶۶۴ھ)

يَاأَهْلَ الْكُوْفَةِ يَاأَهْلَ الْخَتَلِ وَ الْغَدَرِ وَ الْخَذَلِ . . . فَابْكُوْا فَإِنَّكُمْ اَحْرِيَاءُ بِالْبُكَاءِ...... [1]

اے اہل کوفہ! اے دھوکا و فریب کے پجاریو! اور رُسواؤں ......روؤ، بتحقیق تم رونے ہی کے قابل ہو......

ثانی زہراء سلام اللہ علیہا کو وہ آنسو اچھے نہیں لگے جو کوفی بہا رہے تھے۔

آنسو چاہئیں کیونکہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا خود رو رہی تھیں، جنابِ فاطمہؑ باکین میں سے تھیں اور سب سے زیادہ رونے والی ہستی ہیں۔ لیکن جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا سیدہ سلام اللہ علیہا کا رونا کہاں اور جو فقط حاجتوں کیلئے روکر جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو راضی کرتے ہیں اُن کا رونا کہاں؟ ثانی زہراء سلام اللہ علیہا کا رونا کہاں اور اہل کوفہ کا رونا، تماشائیوں کا رونا و لاتعلق لوگوں کا رونا کہاں؟ کیا آج خشمِ فاطمہ سلام اللہ علیہا ٹھنڈا ہو گیا ہے؟ کیا آج جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو تسلی مل گئی ہے کہ میرے بیٹے کو رونے والے بہت ہیں؟ یعنی کربلا تک فاطمہؑ دکھیہ تھی پھر فرزندِ فاطمہؑ شہید ہو گیا اور رونے والی قوم پیدا ہو گئی تو کیا فاطمہ سلام اللہ علیہا کے سارے غصے ٹھنڈے ہو گئے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ہر روز جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا دیکھتی ہیں کہ اُس وقت میرا ایک ولی تنہا تھا لیکن اب تو فاطمہؑ کے بارہ ولی تنہا ہیں۔ کیا آج جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا راضی ہیں؟ ہرگز راضی نہیں ہیں۔ کسی سے راضی نہیں ہیں سوائے اُس کے جو جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے درد و رنج کا راز سمجھ گیا ہے اور انقلابِ فاطمیؑ کے راستہ پر گامزن ہے۔

انحراف کے مقابل سکوت پر ردِعمل

حضرت زہراء سلام اللہ علیہا نے یہ قیامِ حکومت، حکمرانوں اور اُن خواص و عوام کے خلاف کیا جو اس عمل کا مشاہدہ کر رہے تھے لیکن عکس العمل نہیں دکھا رہے تھے۔ اگرچہ بظاہر بہانہ فدک قرار دیا لیکن مدعا فدک نہیں رکھا بلکہ اُس مدعا میں ہر وہ چیز بیان کر دی جو آپؑ کے نزدیک اُمت اور بالخصوص حکمران طبقے کے انحراف کا باعث بن رہی تھی۔ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے جب مشاہدہ کیا کہ اب جبکہ اس قدر کھل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

[1] ......(حماسہ حسینیؑ - شہید مرتضیٰ مطہریؒ)

کی راہ وفرمان کے خلاف قدم اُٹھایا گیا ہے لیکن کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہو رہا تو اس سکوت کو توڑا اور مسجدِ نبوی تشریف لاکر خطبہ ارشاد فرمایا۔

عوام کی تماشا بینی اور جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی سکوت شکنی

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا میدان میں آکر سنتِ حسنہ قائم کرتی ہیں کہ جب امت نظامِ خدا سے دور ہوجائے، جب ولی مسلمین، ولی خدا، امیرالمومنین علیہ السلام کا حق چھین لیاجائے اور لوگ ولایت وولی سے دور ہوجائیں تو اُس وقت فریضۂ اُمت میدانِ عمل میں اترنا، قیام کرنا، سکوت توڑنا اور لوگوں کو نظامِ خدا سمجھانا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد جب بعض لوگوں نے اپنا کام کر دکھایا اور عام مسلمان حکومت سے لاتعلق رہے تو جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے لوگوں کی اس تماشا بینی پر ردِعمل ظاہر کیا۔ عوام انہی کو کہتے ہیں کہ جو ہوگیا سو ہوگیا لیکن اب اُنہیں سوچنا نہیں ہے کہ جو ہوا غلط ہوا یا صحیح۔ جیسے پاکستان میں عوام کی دلچسپی صرف اتنی ہے کہ کون حکومت بنائے گا لیکن یہ حکومت جو بنے گی غلط ہے یا صحیح اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ صرف اتنی دلچسپی ہے کہ کون سامنے آتا ہے۔ اُس وقت بھی عوام میں یہی دلچسپی تھی کہ کون سامنے آتا ہے اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعلان فراموش کر دیا گیا، دین کا ضابطہ فراموش کر دیا گیا، اُمت خاموش ہوگئی اور مہاجرین و انصار کی دو سیاسی پارٹیاں میدان میں اُتر گئیں۔ انہوں نے مل بیٹھ کر حالات سے فائدہ اُٹھایا اور فوراً پارٹی میٹنگ کال کی۔ اُمت نہیں آئی، نہ انصار آئے نہ مہاجرین اور نہ اہلِ حلّ وعَقد آئے بلکہ دو پارٹیاں آئیں جو پہلے سے بنی ہوئی تھیں لیکن مخفی تھیں۔ وہ صرف اسی دن یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دُنیا سے جانے کی منتظر تھیں۔ پھر انہوں نے اپنا فیصلہ منظور کروا کر عوام میں اعلان کر دیا۔ جب عوام میں اعلان ہوا تو عوام نے کوئی ردِعمل نہیں دکھایا۔ کہا ٹھیک ہے جو ہونا تھا ہوگیا، بس ہمیں یہ دلچسپی (Interest) و سسپنس (Suspense) تھا کہ کون آتا ہے۔ مدینہ، مدینہ کے گرد ونواح اور مکہ میں سکوت تھا، خواص کی طرف سے خاموشی تھی اور عوام کی طرف سے فراموشی۔ اس سکوت کو جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے توڑا اور انقلاب کا پہلا قدم اُٹھایا کیونکہ ایسا سکوت تائید ہے۔

سکوت تائید ہے

فِقْہ......[1] میں ایک قاعدہ یہ ہے کہ خاموشی وسکوت علامت رِضا ہے۔خصوصاً جب شادی ہورہی ہوتی ہے اور شادی میں دلہن کے پاس اجازت لینے کے لئے وکیل جاتا ہے کہ آیا میں تیری طرف سے وکیل ہوں، میں لڑکی کا نکاح فلاں ہونے والے شوہر سے پڑھ دوں؟ عموماً آج کل تو پوچھنے سے پہلے ہی ہاں کر دیتی ہیں لیکن پہلے زمانے میں ذرا شرمیلی قسم کی دلہنیں ہوتی تھیں۔لہٰذا کئی دفعہ پوچھیں تو بھی شرم کے مارے جواب نہیں دیتی تھیں کہ بڑے بیٹھے ہوئے ہیں، ماں باپ بیٹھے ہوئے ہیں میں اُن کے سامنے کیسے جواب دوں۔ چونکہ اُس وقت دولہا دلہن شادی کے بعد ہی ایک دوسرے کو دیکھتے تھے، اُس سے پہلے دیکھنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی تھی اور اس وقت تو آدھی زندگی بسر کر کے پھر نکاح کرتے ہیں اس لئے انہیں کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ پرانی دلہنیں نہیں بولتی تھیں بلکہ چپ رہتی تھیں لیکن اُن کو تنگ بھی نہیں کرتے تھے کہ جب تک بولتی نہیں میں کھڑا رہوں گا۔اس سے ایک یا دو دفعہ پوچھتے تھے اور وہ دونوں دفعہ نہیں بولتی تھی تو پھر چپ کر کے آجاتے تھے اور نکاح پڑھ دیتے تھے۔اُس نے نہ ہاں کی اور نہ نا کی، کیوں؟ اس لئے کہ قانون، روایات، فقہ اور شریعت وغیرہ میں ہے کہ دلہن کی خاموشی علامت رِضا ہے۔ یہ راضی ہے اس لئے چپ ہے اور اجتماعیت میں بھی ایسا ہی ہے کہ سکوت علامتِ رِضا ہے۔کربلا پہ جتنے ساکت تھے وہ راضی ہیں۔قاتلِ حسینؑ ہونے کے لئے عمر سعد کے لشکر میں ہونا ضروری نہیں ہے۔

جوظلم پر راضی ہے وہ ظالم ہے اور خاموشی علامتِ رضا ہے لہٰذا جوظلم کے اوپر چپ ہے وہ ظلم پر راضی ہے۔اس سیاسی فیصلے پر جو راضی تھے وہ سب کے سب فیصلے میں شامل تھے۔اگر حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا قیام نہ کرتیں تو یہ سکوت دین بن جاتا، یہ خاموشی اسلام بن جاتی۔پس امامت وولایت رہین قیامِ فاطمیؑ ہے۔

---

[1]...... پاکستان میں فِقْہ کو فِقہ کہتے ہیں، جس طرح فَتْح کو فَتَح اور فَقَطْ کو فَقْط کہتے ہیں۔خصوصاً جب بعض دوستان نعرہ لگاتے ہیں تو ''حزب فَقَطْ حزبِ الٰہی'' کہتے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام راہی راہِ فاطمہ سلام اللہ علیہا

درحقیقت ائمہ اطہار علیہم السلام نے بعد میں جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کا کھولا ہوا راستہ جاری رکھا۔ سب سے پہلے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا حکومت کے مقابلے میں آ کر کھڑی ہوئیں اور حاکم کے اقدام کو چیلنج کیا۔ حضرت سید الشہداء علیہ السلام نے آ کر وہی راہ اپنائی جبکہ امت خاموش تماشائی بنی بیٹھی تھی ۔ آپ نے دنیا کو سکھایا کہ اسلام اس چیز کا نام ہے۔ حضرتِ سید الشہداء علیہ السلام یہ کہہ سکتے تھے کہ میں بھی تمہاری طرح امن کی نمازیں، خاموشی کی نمازیں اور عافیت کی نمازیں پڑھ سکتا ہوں، میں بھی تمہاری طرح ثواب کمانے کیلئے حج کر سکتا ہوں اور لوگوں کو بھی حیرت تھی کہ جب آپ امن کے ساتھ سب کچھ کر سکتے ہیں تو جان بوجھ کر کیوں ایشو (Issue) بناتے ہیں؟ حکومت کی مخالفت کیوں مول لیتے ہیں؟ حکومت کے خلاف کیوں قیام کرتے ہیں؟ اس لئے قیام کرتے ہیں چونکہ یہ فریضۂ دین ہے اور یہی اسلام ہے، یہی فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا کی سیرت ہے اور یہی روحِ اسلام ہے۔ اسی کو بچانے کے لئے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے یہ قدم اٹھایا۔ اس لئے بزرگ علماء کا فرمان ہے کہ اگر جناب سیدہ سلام اللہ علیہا نہ ہوتیں تو تشیع گم ہو چکا ہوتا۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا، بہترین دین و خدا شناس

آپؑ نے ان لوگوں کی دینداری، خاموشی اور ان تمام رویوں کو زیرِ سوال قرار دیا اور بتا دیا کہ تمہارے نبیؐ کی بیٹی سے بہتر اسلام و قرآن کوئی بھی نہیں سمجھتا۔ بی بی سلام اللہ علیہا نے صرف دعویٰ نہیں کیا بلکہ خطبہ دے کر یہ ثابت بھی کر دیا کہ تم بھی رسولؐ کے ساتھ بیٹھے ہو اور میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہی ہوں، میں توحید بیان کرتی ہوں، تم بھی توحید بیان کرو، معلوم ہو جائے گا کہ تم خدا شناس ہو یا فاطمہؑ خدا شناس ہے؟

اس خطبے کے اندر وہ اعلیٰ علمی نکات موجود ہیں جو ڈیڑھ ہزار سال سے حکماء و فلاسفہ کے اذہان کے لئے معمہ بنے ہوئے تھے۔ ہستی شناسی کے معمہ کو جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے بہت ہی سادہ ترین طریقے سے یہاں حل کر دیا۔ بی بی سلام اللہ علیہا نے خطبہ دے کر یہ ثابت کیا کہ اگر مجھ جتنا کوئی دین کو سمجھتا ہے تو ابھی آ کر بولے، مجھ جیسا

کوئی اسلام سمجھتا ہے تو آ کر بولے، میری طرح توحید بیان کرے، میری طرح رسالت بیان کرے، میری طرح قیامت بیان کرے، میری طرح قرآن بیان کرے، میری طرح فلسفہ دین بیان کرے، میری طرح مقصدِ دین بیان کرے، میری طرح روحِ اسلام بیان کرے۔ اگر نہیں بیان کر سکتے تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں اسے تسلیم کرو۔

بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا نے اس خطبے کے اندر قرآن کی آیات کو خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا اور ایک سے بڑھ کر ایک آیتِ قرآن تسلسل کے ساتھ پڑھتی گئیں، استدلال کرتی گئیں اور انہیں دین بتاتی گئیں۔ ایک ایک جملے میں وضاحت وتشریح کرتی گئیں کہ آؤ تمہیں میں دین سکھاتی ہوں۔

جنابِ فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا ہمیں حکومت وحکمران کے سامنے خطبہ دے کر، حکومت کو چیلنج کر کے، حکومتی اقدام کے اوپر اعتراض کر کے انقلاب سکھا رہی ہیں۔ اگر ہم نے دین فاطمیؑ سیکھا ہوتا تو پیروانِ فاطمیؑ کو آج اس ملک میں رہنے کا ڈھنگ آ جاتا۔

آگاہانہ قیامِ فاطمی سلام اللہ علیہا

قیامِ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا ایک بہت ہی سوچا سمجھا اور نپا تلا اقدام تھا جس کے اہداف بہت بلند و عالی تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ بی بی سلام اللہ علیہا کو معلوم نہیں تھا کہ میں جس راہ پہ نکلی ہوں اس کا انجام کیا ہوگا۔ آپؑ نے پہلے سے ہی امیر المومنین علیہ السلام کو بتایا ہوا تھا کہ میں یہ اقدام کر رہی ہوں اور مجھے پتا ہے کہ انجام کیا ہوگا۔ جب معلوم تھا تو پھر خطبہ کیوں دیا؟ جس طرح سے سید الشہداء علیہ السلام مدینہ میں یہ اعلان کر کے گئے کہ میں جو اقدام کر رہا ہوں اس کا انجام میری شہادت ہے۔ حضرتِ سید الشہداء علیہ السلام نے بنو ہاشم کو ایک جملے کا خط لکھا کہ اے بنو ہاشم میں جا رہا ہوں جو ہمارے ساتھ آئے گا وہ شہید ہو جائے گا اور جو بچ جائے گا وہ کبھی آسودہ دن نہیں دیکھے گا۔ یعنی اپنا انجام بتا کے جا رہے ہیں کہ اے بنو ہاشم! میں اس راہ پہ جا رہا ہوں جس کا انجام شہادت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپؑ کو یہ معلوم ہے کہ انجام شہادت ہے تو پھر کیوں جا رہے ہیں؟ اس لئے کہ اگر انجام کے بارے میں آگاہی ہو جائے تو اس سے فریضہ ساقط نہیں ہو جاتا۔ بے شک انجام معلوم ہو جائے

لیکن آپ کا فریضہ اس راہ پہ چلنا اور اس راہ کو طے کرنا ہے۔

مولا علی علیہ السلام نے یہ قیام خود کیوں نہ کیا؟

اب سوال بھی پیدا ہوتا ہے اور لوگ یہ سوال کرتے بھی ہیں کہ جو قیام جناب سیدہ سلام اللہ علیہا نے کیا وہ امیر المومنین علیہ السلام نے خود کیوں انجام نہیں کیا؟ بے شک امیر المومنین علیہ السلام یہ فریضہ انجام دے سکتے تھے لیکن اگر امیر المومنینؑ یہ فریضہ انجام دیتے تو اس کا رخ کہیں اور موڑ دیا جاتا۔

امیر المومنینؑ مدعیِ حکومت تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بتا کے گئے تھے کہ علی علیہ السلام تمہارا حاکم ہے لہٰذا اب اگر امیر المومنین علیہ السلام اس میدان میں آتے تو رنگ کچھ اور ہو جاتا، بلکہ کوشش بھی یہی تھی کہ علی علیہ السلام مقابلے میں آئیں اور اس کا رخ اقتدار کی رسہ کشی کی طرف ہو جائے۔ وہ چاہ رہے تھے کہ اس کو محض جاہلیت کی سیاست کا رنگ دے دیں لیکن جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا نے علی علیہ السلام کو گھر میں بٹھا کے اور خود میدان میں آ کر اس کو الٰہی سیاست کا رنگ دے دیا۔

......امت کی بے حسی اور امام علی علیہ السلام کی کیفیت و مجبوری

اُس وقت ولی خدا، وصی رسولؐ، ولی امر المومنین و مسلمین جنابِ امیر المومنین علی علیہ السلام ایک ایسی صورتحال سے دو چار ہوئے جو قابلِ تحمل بھی نہیں تھی اور جس سے چشم پوشی بھی نہیں کر سکتے، جو ہضم بھی نہیں ہو سکتی تھی اور اُس سے دست بردار بھی نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ نہج البلاغہ میں امیر المومنین علی علیہ السلام نے اپنا کرب، تکلیف اور درد ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا:

فِی الْعَیْنِ قَذًی وَ فِی الْحَلْقِ شَجًا......[1]

---

[1]......(نہج البلاغہ، خطبہ ۳، خطبۃ الشقشقیہ)

جیسے آنکھ میں کانٹا ہو اور گلے میں کوئی چیز پھنسی ہوئی ہو جو نہ نیچے جاتی ہو اور نہ باہر آتی ہو۔

آنکھ میں کانٹا آجائے تو نہ آنکھ بند ہونے دیتا ہے نہ کھلنے دیتا ہے اسی طرح گلے میں پھنسی چیز انتہائی کرب کا باعث بنتی ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اُفق اُمت پر نمودار ہونے والے سیاسی منظر نامہ پر اپنی یہ کیفیت بیان فرما رہے ہیں جس میں اللہ کا ولی و حاکم الٰہی عجیب صورتحال سے دوچار ہے کہ نہ اقدام کرسکتا ہے نہ چپ رہ سکتا ہے۔ اپنے حق کے حصول و نظامِ الٰہی کو برپا کرنے کیلئے کیوں اقدام نہیں کرسکتا؟ اس لئے کہ موقع و محل اور صورتحال ایسی ہے جو مسلحانہ اقدام کی اجازت نہیں دیتی۔ ابھی نظامِ اسلامی نو بنیاد ہے اور اُس نظامِ دینی کے ساتھ ایک المیہ یہ رونما ہوا ہے کہ نظامِ دینی کے رکن، ستون و سہارا اس دُنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔

دوسری طرف معاشرہ کا بہت بڑا طبقہ نومسلم و تازہ مسلمان ہوا ہے اور اسلام کا پیغام جو عالمین و ہر زمانے کیلئے ہے ابھی فقط چند کلومیٹر کے اندر محدود ہے۔ اسلام کا عالمی نظام قیامت تک رہنا ہے لیکن اگر اس وقت ایسا معرکہ شروع ہو جائے کہ جس کا ظاہری عنوان اقتدار کا حصول ہو تو ان نومسلموں کو مایوس کرسکتا ہے جو ابھی ظواہر دیکھ کر دین کی طرف آئے ہیں اور ابھی دین کی بنیادوں کو درست نہیں سمجھتے۔ پس جس دین کو ابھی عالمین کو تسخیر کرنا باقی ہے اگر پہلے قدم پر ہی رہبر الٰہی کی وفات کے بعد وارثانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان اقتدار کا جھگڑا شروع ہو جاتا تو نومسلم تجزیہ و تحلیل، سیاسی سوجھ بوجھ اور سیاسی بصیرت کے لحاظ سے اس قابل نہیں تھے کہ حقیقت کو صحیح تشخیص دے سکتے۔

......اکثریت صحیح تجزیہ و تحلیل سے عاری

آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے چودہ سو سال بعد بھی اُمت کے اندر وہ بصیرت بعض اوقات نظر نہیں آتی جو حالات کا صحیح طریقے سے تجزیہ کرسکے۔ آیا اس وقت اُمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ حصہ جو پاکستان میں رہ رہا ہے اس وقت پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا تجزیہ کرسکتا ہے؟ کیا انہیں معلوم ہے کہ

پاکستان میں کیا ہورہا ہے؟ یہ چودہ سو سال بعد اس ملک کے اندر رونما ہونے والے مسائل کا تجزیہ کرنے کے قابل نہیں ہیں اور وہی کچھ زبانوں سے جاری کرتے ہیں جو خناس میڈیا، مداری وشعبدہ باز اور قوم کی بے شعوری سے فائدہ اُٹھانے والے سیاستدان وسیاست باز بیان کرتے ہیں۔آج چودہ سو سال بعد بھی مشکل وہیں پر ہے کہ نظامِ اسلامی آج بھی غریب ہے۔

پس اُس وقت جو اُمت تازہ تشکیل پائی تھی، وہ نظام جو ابھی چند روز ہوئے تشکیل پایا تھا اور لوگ آہستہ آہستہ کفر وشرک، الحادی نظریوں، شیطانوں کی عبادت، بتوں کی پرستش اور جاہلیت کی رسمیں چھوڑ کر ہدایت کی طرف دھیرے دھیرے آرہے تھے اگر انہی ابتدائی ایام میں اقتدار کی کشمکش سے مواجع ہوتے کہ وارثانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط اقتدار کی جنگ کررہے ہیں تو یہ نومسلم جو حالات کے تجزیئے پر قدرت نہیں رکھتے تھے جو فقط ظواہر کو دیکھ کر فیصلے کرتے تھے بہت جلد مایوس، ناامید وبرگشتہ ہوجاتے اور اسلام کا بڑھتا ہوا عمل وہیں پر رُک جاتا۔اگر علی علیہ السلام اُس وقت قیام کرتے تو دینِ خدا اُسی شہر اور چند قبیلوں کے اندر محدود ہوجاتا اور یہ جنگ تاریخ میں اقتدار کی جنگ لکھ دی جاتی۔علی علیہ السلام بول کیوں نہیں سکتے؟ اس لئے کہ اگر قیام کریں، اقدام کریں تو لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ علی علیہ السلام کے اقدام کو سمجھ سکیں اور ساتھ دے سکیں۔علی علیہ السلام خاموش کیوں نہیں بیٹھ سکتے؟ اس لئے کہ امام ہیں، وصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، ولی مومنین ومسلمین ہیں، اللہ کی طرف سے حاکم ہیں، محافظ دین ہیں، پاسدار و پاسبانِ دین ہیں، رہنما و زمام دارِ اُمت ہیں اور زمام دار لاتعلق اور غیر جانبدار رہ کر چپ نہیں سادھ سکتا۔

اکثریت حق تجزیہ و تحلیل سے عاری

روزمرہ کے مسائل میں بھی انسان ایسی صورتحال سے دوچار ہوجاتا ہے کرب کے باعث نہ بول سکتا ہے نہ چپ رہ سکتا ہے۔بعض لوگوں کا گھریلو مسائل میں بھی تجربہ ہوتا ہے کہ جب گھر کے اندر بہو اور ساس میں ٹھن جاتی ہے تو اب اگر شوہر بیگم کیلئے بولے تو ماں جاتی ہے اور ماں کیلئے بولے تو بیگم جاتی ہے اور نہ بولے تو دونوں جاتے ہیں یا خود باہر جانا پڑتا ہے۔ایسی صورتحال میں آپ اس کشمکش میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ نہ چپ رہتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں۔ایسے حالات بہت اہم ہوتے ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اگر بعنوانِ ولی قدم اُٹھائیں تو اُس کا معنیٰ کچھ اور لیا جائے گا۔بعد میں

بھی لوگوں نے امیر المومنینؑ کے اقدامات کو درست نہیں سمجھا۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مجھے ایک ایسی قوم ملی ہے کہ جو نہ میری خاموشی کا معنیٰ سمجھتی ہے نہ میرے اقدام کا معنیٰ سمجھتی ہے۔

فَاِنْ اَقُلْ یَقُوْلُوْا: حَرَصَ عَلَی الْمُلْکِ، وَاِنْ اَسْکُتْ یَقُوْلُوْا: جَزَعَ مِنَ الْمُوْتِ!

اگر بولتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ دنیوی سلطنت پر مٹے ہوئے ہیں اور اقتدار و حکومت کے لالچی ہیں اور اگر میں چپ رہتا ہوں تو یہ مجھے متہم کرتے ہیں کہ موت سے ڈرتا ہے۔

حالانکہ یہ بخوبی جانتے ہیں کہ میں موت سے نہیں ڈرتا بلکہ موت کی تمنا کرتا ہوں اور موت کی تلاش میں رہتا ہوں۔

وَاللّٰہِ لَابْنُ أَبِیْ طَالِبٍ اٰنَسُ بِالْمَوْتِ مِنَ الطِّفْلِ بِثَدْیِ أُمِّہٖ......[1]

خدا کی قسم ابوطالبؑ کا بیٹا موت سے اتنا مانوس ہے کہ ایک شیر خوار بچہ ماں کے دودھ سے اتنا مانوس نہیں ہوتا......

......میراثِ علی علیہ السلام پر قدغن اور عوام کا عوامی پن

اُمت تماشائی محض تھی یعنی وہی کر رہی تھی جو عام طور پر عوام کرتی ہے۔ حکیم سنائی غزنوی کے بقول عوام و مردم کا کام ''خری یا خرخری'' ہوتا ہے۔

زیئے رد و قبول عامہ خود را خر مساز
زان کار عامہ بنود جز خری یا خرخری......[2]

عوام پیغمبری کو نہیں سمجھتے۔ خری یا خرخری اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو سوچے بغیر کام کریں، جو جھنڈا اُٹھا ہوا دیکھیں اُس کے پیچھے چل پڑیں، جو سیٹی بجتی ہوئی دیکھیں اُس کے پیچھے چل پڑیں۔

---

[1]......(نہج البلاغہ، خطبہ ۵)

[2]......(دیوان حکیم سنائی غزنوی، قصیدہ شمارہ ۱۸۵)

امیرالمومنین علیہ السلام نے یہی فرمایا ہے کہ عوام "هَمَجٌ رَعَاع" ......[1] ہوتے ہیں یعنی ہر چلتی ہوئی ہوا کے اوپر چل پڑتے ہیں، ہر اُٹھتی ہوئی آواز و نعرے کے ساتھ ہم صدا ہوجاتے ہیں اور ہر چڑھتے سورج کے پجاری ہوجاتے ہیں۔ یہ سوچتے سمجھتے نہیں ہیں اور نہ دلیل کے ذریعے کسی راستے کو اپناتے و ترک کرتے ہیں۔

عوام کے سامنے فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نظر انداز کیا گیا تو بھی ان پر کوئی اثر نہیں پڑا، کیوں؟ اس لئے کہ سب نے نظر انداز کیا ہے اور اگر سب مل کر نظر انداز کر دیتے ہیں تو عوام قانع ہوجاتے ہیں کہ یہ ٹھیک کام ہوا ہے چونکہ سب نے مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان نظر انداز کیا ہے۔ اگر سب سیاسی پارٹیاں مل کر موقع و محل سے فائدہ اُٹھا کر ایک فیصلہ کرلیں اور عوام میں اعلان کر دیں تو عوام کا ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ چونکہ اب تو اعلان ہو چکا ہے لہٰذا اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اب اس اعلان کو ماننا پڑے گا۔ مانے بغیر چارہ نہیں ہے۔ عجب کہ اعلانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ٹھکرا دیا جائے لیکن عوام کوئی ردِعمل نہیں دکھاتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمانِ ولایتِ علی علیہ السلام اگر فراموش ہوجائے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن سیاسی جماعت کے فیصلے کا فرمان نظر انداز ہوگیا تو اُمت میں نزاع و تفرقہ پڑ جائے گا۔ اگرچہ خواص متوجہ تھے کہ یہ کیا ہوا ہے لیکن مصلحت کوشی سے کام لے رہے تھے۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط دن دیہاڑے واضح و کھلم کھلا چھوڑ دیا گیا۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی میراث لٹتے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے لیکن بول بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ بولنے سے جو ردِعمل ہونا تھا وہ امیرالمومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں دو یا تین جگہ بہت واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔

......امیرالمومنین علی علیہ السلام اپنے حق سے دستبردار نہیں

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَ اللهِ لَقَدْ تَقَمَّصَهَا فُلَانٌ، وَ إِنَّهُ لَيَعْلَمُ أَنَّ مَحَلِّيَ مِنْهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحَى......[2]

خدا کی قسم! فلاں شخص جو حاکم بن گیا اُس کو بخوبی معلوم ہے کہ یہ میرا حق تھا، یہ میرا مقام تھا۔ کیوں؟

[1]......(نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۷)

[2]......(نہج البلاغہ، خطبہ ۳، خطبہ شقشقیہ)

اس لئے کہ میرا مقام دین کے اندر وہی ہے جو چکی کے پاٹ کے مرکز کا ہوتا ہے، جس کے گرد سارا نظام گھومتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ میرا مقام وہی ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام اپنے حق سے ہرگز دستبردار نہیں ہیں لیکن صورتحال ایسی ہے کہ آواز نہیں اُٹھا سکتے۔ چونکہ اہل ہوس کے نزدیک امیر المومنین علیہ السلام کے آواز اُٹھانے کا مطلب کچھ اور ہو جاتا ہے۔ اہل ہوس ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہر اقدام کا غلط معنیٰ و تفسیر کرتے ہیں۔ بقول شاعر:

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہل ہوس

مدحِ زلف ولب و رخسار کروں یا نہ کروں......[1]

اور یہی ہوا کہ اہل ہوس نے امیر المومنین علیہ السلام کے سکوت کا غلط معنیٰ کیا۔ اسی طرح اہل ہوس امیر المومنین علیہ السلام کی گفتگو اور اقدام کا بھی غلط معنیٰ کرتے ہیں۔

......ولی کی مجبوری پر ناصرین کا کردار

جب ولی اس قسم کی صورتحال سے دوچار ہو جائے تو اُس وقت اسے ناصرین کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ولی خود نہ بول سکتا ہو تو اُس وقت اُسے لسان و ترجمان کی ضرورت ہوتی ہے، اُس وقت اُس کو عمارِ زمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے امیر المومنین علیہ السلام کوفہ کے میدان میں کھڑے ہو کر ندا دے رہے تھے:

أَيْنَ عَمَّارٌ......[2]

آج عمارؓ کی ضرورت ہے۔ حضرتِ عمارؓ مولا علی علیہ السلام کے بوڑھے، نڈر و بیباک صحابی ہیں جن کی زبان مالک اشترؓ کی تلوار سے زیادہ تیز تھی۔ اُس وقت امیر المومنین علیہ السلام کو مالکؓ کی کمی کا بھی احساس ہوا لیکن مالکؓ سے زیادہ عمارؓ کی کمی کا احساس ہوا۔ الٰہی رہبران کبھی اس صورتحال سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ جس طرح

[1]......(نذر سودا، فیض احمد فیض)

[2]......(نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہا ان حالات کے گرداب میں آئے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ خندق میں اعلان کیا کہ کون ہے جو اس کتے کی زبان بند کرے تو کوئی اُٹھ کر کہہ سکتا تھا کہ یا رسول اللہؐ! آپ خود اُٹھ کر بند کردیں لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ جب رسولوں کو کوئی للکارتا ہے تو اُس وقت اوصیاء اُن کی مدد کرتے ہیں اور جب اوصیاء کو کوئی للکارتا ہے تو اُس کے پیروکار میدان میں اُترتے ہیں۔ حضرتِ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کی سنت یہ ہے کہ جب ولی کسی مشکل کی وجہ سے اپنے حق کا اظہار نہ کرسکے تو پیروکارِ ولی کو وہاں پر سکوت توڑنا چاہیئے، نہ کہ ولی بن جانا چاہیئے۔

آج آپ دیکھیں کہ ولی امر مسلمین، ولی فقیہ حضرتِ آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی بارہا اس صورتحال سے دوچار ہوتے ہیں۔ مثلاً بحرین میں کیا ہورہا ہے، آج کی عالمی سیاست و عالمی تناظر میں ولی امرالمسلمین اظہار نہیں کرسکتے۔ آج پاکستان میں قتل و غارت گری ہورہی ہے اور بعض فوراً کہتے ہیں کہ کیوں ولی امرالمسلمین اقدام نہیں کرتے؟ کیوں کوئی پیغام نہیں دیتے؟ کیوں یہ نہیں کرتے؟ کیوں وہ نہیں کرتے؟ اگر سیرتِ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کو سمجھا ہوتا تو معلوم ہوجاتا کہ ولیوں کی مجبوریاں کیا ہوتی ہیں اور اُس وقت میدان میں کن لوگوں کو اُترنا ہوتا ہے۔

خطبہ سیدہؑ، عکاسِ مقصدِ سیدہ سلام اللہ علیہا

یہ خطبہ حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے قیام کی ضرورت و مقاصد کو بھی بیان کررہا ہے اور اُس قیامِ مقدس کی نوعیت کو بھی متعین کررہا ہے۔ وہ قیام جسے نہ تاریخ صحیح طریقے سے بیان کرسکی اور نہ پیروان صحیح طریقے سے درک کرسکے کہ انقلابِ فاطمیؑ و قیامِ حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا کس طرح آغاز ہوا؟ اور کیوں جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے اس قدر شدید ردِعمل دکھایا؟ چنانچہ ضرورت ہے کہ حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے اس نورانی و انقلابی خطبہ کی تفسیر پیش کی جائے۔

معرفتِ خدا، اساسِ خطبہ فاطمیہؑ وعلویہؑ

یہ خطبہ نورانی جو جناب سیدہ سلام اللہ علیہا نے پیش کیا اس کے ایک ایک جملے کی اساس خدا کی ذات و معرفتِ توحید پر ہے۔ درحقیقت یہ خطبہ نصاب تشیعِ فاطمیؑ، نصابِ تشیعِ محمدیؐ و نصابِ تشیعِ علویؑ ہے۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے متوجہ کیا کہ دین کی اساس معرفتِ خدا ہے۔ جس طرح نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے تشیعِ علویؑ، تشیعِ محمدیؐ و تشیعِ توحیدی پیش کیا۔ یہ دو شخصیات ایک ہی حقیقت کے دو رخ تھے۔

یہ شاہکار سید رضیؒ نے بھی کیا کہ مولا علی علیہ السلام کے خطبہ توحید کو پہلا خطبہ قرار دیا۔ واقعاً اس خطبہ کے لئے جچتا ہے کہ یہ کلامِ علویؑ میں پہلا خطبہ قرار پائے۔ اس میں امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

أَوَّلُ الدِّیْنِ مَعْرِفَتُهُ...... [1]

اے لوگو! جان لو کہ دین کی بنیاد و اساس معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے۔ دین ہے ہی وہی جو خدا کی معرفت سے شروع اور خدا کی معرفت پہ ختم ہو۔ جس میں کل معرفتِ خدا ہو۔

پورے عالم میں توحیدی ترین مکتب تشیع ہے۔ جتنی پختہ، گہری وعمیق توحید تشیع کے اندر موجود ہے اتنی کسی اور مکتب کے اندر موجود نہیں ہے۔ آپ اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ توحید کو اگر سمجھنا چاہیں تو تشیع کے باب میں سمجھیں۔ جناب زہراء سلام اللہ علیہا کے کلام میں توحید کا مشاہدہ کریں۔ بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا نے معارفِ توحیدی سے خطبے کا آغاز کیا پھر مقامِ رسالت، مقامِ امامت، فلسفہ دین وحقیقتِ قرآن بیان کی۔

کلامِ فاطمہ سلام اللہ علیہا، معراجِ بلاغت

ایک بزرگوار نے جو ابن طیفور کے نام سے معروف ہیں عربی زبان میں بلاغات النساء نامی کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے پوری تاریخ میں موجود خواتین کے بہترین کلام، شعر، نثر یا تقریر کی صورت میں جمع کئے ہیں۔

---

[1]......(نہج البلاغہ، خطبہ ۱)

تاریخ میں اہلِ علم، اہل فضل، اہلِ کرامت، اہلِ شرف، اعلیٰ علمی مقامات اورتقویٰ وعرفان کے اعلیٰ مقامات پر فائز متعدد خواتین گزری ہیں۔اس بزرگوار نے ان خواتین کا منتخب کلام جو بلاغت وفصاحت میں نہایت اعلیٰ درجے کا تھا اکٹھا کیا ہے۔اس کتاب کا آغاز ہی بی بی سلام اللہ علیہا کے اس خطبہ فاطمیہؑ سے ہوتا ہے۔دراصل سب سے ابلغ وافصح کلام جو تاریخ میں کسی خاتون کی زبان سے ادا ہوا وہ حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا خطبہ ہے۔

......ہر دور کی اعلیٰ شخصیات، بارگاہِ سیدہ سلام اللہ علیہا میں خاضع

ہر زمانے کی اعلیٰ ترین شخصیت جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے سامنے تسلیم ہونے پر مجبور ہے۔علامہ مجلسیؒ نے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے اس خطبہ کے ضمن میں ایک بہت خوبصورت نکتہ نقل کیا ہے کہ جب یہ خطبہ اہلِ ادب واہل فصاحت وبلاغت علماء کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے اس طرح اپنے ہاتھ کاٹنے شروع کئے جس طرح مصر کی خواتین نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹنے شروع کئے تھے۔

بڑے بڑے ادیب گزرے ہیں کہ بعض چیزیں اُن کی نظروں سے اوجھل رہی ہیں۔جس طرح علامہ شیخ محمد عبدہ اقرار کرتے ہیں کہ میں نے اتنی عمر گزاری لیکن نہج البلاغہ سے نا آشنا رہا۔اسی طرح کچھ عرصہ قبل اہلسنت کی ایک بہت جید شخصیت نے مجھے اپنی کتاب بھیجی جو اہل بیت علیہم السلام کی شان میں لکھی گئی ہے اور کتاب کی تقریظ بھی ایک بہت بڑی مشہور شخصیت نے لکھی ہے۔دونوں عالم دیوبندی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں اور دونوں کے بہت خوبصورت الفاظ ہیں۔تقریظ میں اس بزرگوار نے ایک ایسا عظیم جملہ لکھا ہے کہ میں نے جتنی دفعہ پڑھا ہر بار بہت لطف آیا اور ابھی تک اُس جملے کی لذت کم نہیں ہورہی۔کہتے ہیں کہ جب میں مدرسہ میں پڑھتا تھا تو ہمارے نصاب میں مناقبِ اہلبیت علیہم السلام شامل نہیں تھے۔ہم نے زمانہ طالبعلمی میں جب دین پڑھا تو جاہلیت کے شعر پڑھے مثلاً حماسہ پڑھا، متنبی پڑھا، حریری پڑھا، فلاں پڑھا۔چونکہ طالبعلموں کو دین کے نام پر بہت الابلا پڑھایا جاتا ہے۔عربی ادب کے نام پر جاہلیت پڑھائی جاتی ہے۔غرضیکہ وہ لکھتے ہیں ہمیں مختلف علوم پڑھائے گئے لیکن اگر نہیں پڑھائی گی تو شانِ اہل بیت علیہم السلام نہیں پڑھائی

گئی۔ پھر جب طالب علمی سے فارغ ہو کر عملی زندگی میں آ گیا تو اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ میری فہمِ دینی میں بہت بڑا خلا رہ گیا ہے اور وہ مناقبِ اہلبیت وفضائل اہلبیت علیہم السلام ہیں۔ اُس کے بعد میں نے خدا کی بارگاہ میں توبہ واستغفار کی کہ اے پروردگار! یہ اتنے سال طالبعلمی میں مَیں نے جو معصیت کی ہے کہ اہلبیت علیہم السلام کے مناقب سے محروم رہا ہوں میرا یہ گناہ معاف فرما۔

پھر انہوں نے چند بڑی کتابوں کے نام لئے کہ میں نے انہیں تفصیل سے پڑھا اور عہد کیا کہ اپنی ہر گفتگو کا ایک حصہ اہلبیت علیہم السلام کے لئے ضرور پیش کروں۔ عملاً بھی ہم نے دیکھا ہے کہ وہ اُس عہد پر قائم ہیں اور اپنے خاص نظام وسوچ کے تحت اہلبیت علیہم السلام کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ پھر اُس کے بعد انہوں نے مصنف کا شکریہ ادا کیا کہ جو کمی محسوس ہو رہی تھی وہ آپ نے پوری کی۔ انہوں نے خوبصورتی کے ساتھ اہلبیت علیہم السلام کے مناقب بیان کئے ہیں البتہ اہل سنت کے مبانی کے مطابق۔ ظاہر ہے کہ شیعہ ذوق الگ ہوتا ہے اور سنی ذائقہ الگ۔ شیعہ نعت پڑھے تو وہ اس طرح کی نہیں پڑھ سکتا جس طرح سنی نعت پڑھتا ہے اور جس طرح شیعہ قصیدہ پڑھتا ہے اس طرح سنی قصیدہ نہیں پڑھتا۔ بالآخر پتا چل جاتا ہے کہ یہ نعت خوان شیعہ ہے یا سنی۔ سنی جب نعت پڑھتا ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ مدینے کا ذکر کرتا ہے اور شیعہ جب نعت پڑھتا ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ اہلبیت علیہم السلام کا ذکر کرتا ہے۔ صاف رنگ نظر آ جاتا ہے کہ یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھول جاتے ہیں۔ بہر کیف ہر عہد کے منصف نے اپنی بساط و ظرفیت کے مطابق بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کی بارگاہ میں اپنا ہدیہ پیش کیا ہے۔

......زنانِ مصر کے متاثر ہونے کی وجہ

آپ کو معلوم ہے کہ زنانِ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو چھریاں سیب کاٹنے کے بجائے اپنے ہاتھوں پر چلا دیں۔ یہاں عموماً ہمیں یہ سمجھایا جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا اتنا حسین وخوبصورت چہرہ دیکھ کر وہ عورتیں مشتعل وبیخود ہوگئیں۔ لیکن ماجرا یہ ہے کہ نہ عورتوں کا وہ عمل شہوانی تھا اور نہ حضرتِ یوسف علیہ السلام

شہوت انگیز حُسن کے مالک تھے۔حضرتِ یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر معاذ اللہ لوگوں کی شہوت نہیں اُبھرتی تھی بلکہ وہ فکر، احساس، فطرت وعقل کو اُبھارتے تھے۔ دراصل حسنِ سیرتِ یوسفؑ نے لوگوں کو تسلیم ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

آج اگر کسی مولانا کے پیچھے چند عورتیں لگ جائیں تو کیا لوگ یہ کہیں گے کہ یہ یوسف ہے مثلاً اگر مولانا گلی میں جائیں اور پیچھے عورتوں کا لشکر جا رہا ہو تو اس کو کوئی نہیں کہے گا کہ یہ یوسف ہے بلکہ کہیں گے کہ یہ کیسا شہوانی آدمی ہے جو عورتوں کی محبوب شخصیت ہے۔

بچپن میں انسان زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کو جب عورتوں نے دیکھا تو داڑھی آ چکی تھی اور داڑھی و مونچھ آئے تو مرد کا حسن کم ہو جاتا ہے۔حضرتِ یوسف علیہ السلام جب کنعان میں تھے تو ساری عورتیں دیکھتی تھیں، بھائی و سوتیلی مائیں دیکھتی تھیں لیکن نہ صرف ہاتھ نہیں کاٹتی تھیں بلکہ اُلٹا نفرت و حَسد کرتی تھیں۔اسی طرح جب یوسفؑ کو کنوئیں میں پھینک دیا اور لوگوں نے آ کر کنوئیں سے نکالا تو اُن میں سے کوئی بھی بیہوش نہیں ہوا، نہ ہاتھ کاٹے، نہ ڈول سر میں مارا، نہ کنوئیں میں چھلانگ ماری اور نہ وجد میں آیا، سب بالکل نارمل تھے اور کسی کا بلیڈ پریشر ہائی نہیں ہوا۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام کو بازارِ مصر میں ایک اونچی جگہ پر مچان بنا کر کھڑا کیا تو بولیاں لگتی تھیں لیکن کوئی خریدنے کیلئے تیار نہیں تھا کیونکہ وہ غلاموں کا بازار تھا۔غلام اس لئے خریدے جاتے ہیں کہ گھر کا کام کریں۔انہوں نے دیکھا کہ یہ بچہ کوئی شہزادہ ہی لگتا ہے یعنی کسی ایسے خاندان کا لگتا ہے جو کام کرنا نہیں جانتا، نازک بچہ ہے لیکن ہم اس سے نہ کھیتی باڑی کروا سکتے ہیں، نہ گھر کے کام اور نہ کنسٹرکشن کے کام۔ یہ تو کسی کام کا نہیں ہے، ہمیں تو ایسا غلام چاہیے جو یہ سارے کام کرے۔ اصلاً کوئی خریدنے کیلئے تیار نہیں تھا۔آخر کار عزیزِ مصر اور اُس کی بیوی نے مشغلے کے طور پر ایسے ہی تفریحاً خرید لیا کہ کام کا تو نہیں ہے لیکن چلیں دیکھیں بعد میں شاید بیٹا ہی بنا لیں۔عورت نے کہا اس کو خرید لیں تو مرد نے کہا کہ یہ بیچارہ کیا کام کرے گا، یہ تو خود محتاج ہے کہ کوئی اس کا خیال رکھے، ہم ایسا غلام خریدیں جو ہمارے گھر کا کام کرے۔آخر میں کوڑیوں کے مول انہوں نے خرید لیا۔

شاعر کے بقول:

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہل مصر وضع تکلف تو دیکھئے

انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے......[1]

یعنی تہمتیں لگانے سے پہلے ایک دفعہ دامن تو دیکھ لو کہ پھٹا ہوا کدھر سے ہے۔

بچپن ولڑکپن میں جب بچہ زیادہ خوبصورت ہوتا ہے اس وقت کوئی بیہوش نہیں ہوا۔ جب زلیخا نے عورتیں بٹھائیں تو وہ دراصل حسنِ سیرتِ یوسفؑ سے متاثر ہوئیں۔

فَلَمَّارَأَيْنَهٗٓ أَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًاإِنْ هٰذَآإِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ٥......[2]

یعنی جب عورتوں نے انہیں دیکھا تو انہیں بڑا ''عظیم'' پایا اور وہ اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور کہہ اٹھیں: پاک ہے اللہ، یہ بشر نہیں، یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔

پس انہوں نے یوسف علیہ السلام کو بہت ''عظیم'' قرار دیا یعنی کتنا عالی صفت انسان ہے کیونکہ اتنا خوبرو جوان جس کے پاس دعوتِ گناہ ومعصیت موجود ہے اور وہ بھی تمام شرائط کے ساتھ لیکن پھر بھی گناہ نہ کرے۔ یہ ہمیں انسان نہیں بلکہ فرشتہ لگتا ہے لہٰذا انہوں نے سیرتِ یوسفؑ دیکھ کر ہاتھ کاٹ لئے۔

اسی طرح جب ان فصحاء نے جب یوسفِ فاطمہؑ خطبۂ فاطمہؑ وکلامِ فاطمہؑ پہلی مرتبہ سنا تو اپنے ہاتھوں کو کاٹنے لگے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ آپؑ کا خطبہ کس اوج وعروج پہ پہنچا ہوا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ ہم عربی نہیں جانتے لہٰذا ہم اس سے لذت نہیں اُٹھا سکتے، ہم ہاتھ نہیں کاٹ سکتے چونکہ ہمیں شیکسپیئر کی زبان آتی ہے لیکن جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی زبان نہیں آتی۔

---

[1]......(دامنِ یوسف، فیض احمد فیض)

[2]......(سورۃ یوسف، آیہ ۳۱)

......اقبالؒ کا بارگاہِ سیدہ سلام اللہ علیہا میں خراجِ عقیدت

خدا علامہ اقبالؒ پر رحمت کرے کہ حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی بارگاہ میں کس قدر عظیم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اقبالؒ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے بہت معتقد ہیں، فرماتے ہیں:

رشتۂ آئین حق زنجیر پاست

پاس فرمان جناب مصطفی است

ورنہ گرد تربتش گردیدمی

سجدہ ھا بر خاک او پاشیدمی......[1]

اللہ کا آئین، اللہ کا دین اقبالؒ کی راہ میں مانع بن رہا ہے، جنابِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان مجھے روک رہا ہے، ورنہ اقبالؒ کا ایک ہی کام ہوتا کہ ساری زندگی فاطمہؑ کی قبر کا طواف کرتا رہتا، ساری زندگی تربتِ فاطمہؑ پہ سجدے کرتا رہتا اور اسی طرح جان دے دیتا۔

خطبہ فاطمیہ سلام اللہ علیہا کی جامعیت

اہلِ سخن و اہلِ منبر نے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے اس خطبہ کا عنوان خطبہ فدکیہ قرار دیا ہے لیکن اس کا مناسب ترین عنوان خطبہ فاطمیہؑ و خطبہ اسلامیہ ہے۔ چونکہ جب خطبہ فدکیہ کہتے ہیں تو فقط اس خطبہ کا ایک موضوع سامنے آتا ہے جبکہ اس خطبہ کے اندر بہت جامعیت موجود ہے۔ یہ خطبہ توحیدیہ، خطبہ عدلیہ، خطبہ رسالتیہ، خطبہ امامتیہ، خطبہ معادیہ، خطبہ شرعیہ، خطبہ کلامیہ، خطبہ فلسفیہ و خطبہ عرفانیہ بھی ہے۔ یہ خطبہ پوری بشریت کیلئے مشعلِ راہ ہے۔ بی بی سلام اللہ علیہا کسی خاص طبقہ سے نہیں بلکہ تمام اہلِ اسلام سے خطاب کر رہی ہیں اور انہیں بتا رہی ہیں کہ اسلام ہے کیا؟ حقیقتِ دین ہے کیا؟ یہاں بی بیؑ نے وہ سارے راز بیان کر دیئے

---

[1]......(اسرار بیخودی- علامہ اقبالؒ، در معنی این کہ سیدۃ النساء فاطمۃ زہراء علیہا السلام اسوہ کاملہ است)

جنہیں سمجھنا اہلِ اسلام کیلئے ضروری تھا۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے اس عظیم قیام کو جائیداد کا جھگڑا قرار دینا محدود ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

خطبہ فاطمیہ سلام اللہ علیہا کی سند

روایات کے مطابق خطبہ فاطمیہؑ مستند خطبہ ہے اور بہت سارے موثق راویوں نے اسے نقل کیا ہے۔ ائمہ اطہار علیہم السلام نے یہ خطبہ بیان فرمایا ہے اور اگر کسی روایت کی سند معصومؑ تک درست ہے تو اس سے آگے اسے پرکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعض علماء نے خطبہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی سند کے بارے میں ایک مستقبل کتاب بھی لکھی ہے چونکہ بعض نے اس خطبہ کے بارے میں شک کیا۔ جس طرح نہج البلاغہ کے خطبات کے بارے میں بعض نے شبہات ڈالے ہیں اور خناسیت کی ہے کہ نہج البلاغہ کے خطبے علی علیہ السلام کے خطبے نہیں ہیں۔ وجہ یہ بیان کی کہ چونکہ یہ خطبے بہت اعلیٰ اور بلند ہیں۔

خطبات کی بلندی باعثِ تشویش

کسی نے یہ شبہ ظاہر کیا کہ اس زمانے میں مدینہ یا کوفہ کے لوگ اس قابل ہی نہیں تھی کہ اتنے علمی خطبے ان کے سامنے پیش کیے جاتے۔ مثلاً آج اگر یہ خطبے امیر المومنین علیہ السلام کسی علمی حوزے مثلاً نجف یا قم کے اندر پڑھیں تو انگشت شمار لوگ ہوں گے کہ جنہیں علی علیہ السلام کا خطبہ سمجھ میں آئے گا۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ خطبات اس وقت ان بدوؤں کے سامنے پڑھے گئے جو اونٹ و بکریاں چرانے والے لوگ تھے۔ ان کا یہ شبہ بے جا ہے چونکہ جب قرآن نازل ہوا تو اس وقت ایسے کتنے لوگ تھے جو قرآن کو سمجھنے والے تھے۔ وہ چیز جو بشریت کی ہدایت کے لئے بیان کی جاتی ہے اس میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ سامنے کون بیٹھا ہوا ہے بلکہ اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ قیامت تک اس کا مخاطب کون ہے؟ امیر المومنین علیہ السلام نے وہ خطبے فقط ان عربوں کے لئے بیان نہیں کئے بلکہ قیامت تک آنے والی انسانیت کے لئے منشور کی حیثیت سے بیان کئے۔ امیر المومنین علیہ السلام

اس سے آگاہ تھے کہ اگر آج نہیں تو کل میرے خطبے سمجھنے والے آجائیں گے۔

......اقبالؒ، شاعرِ فردا

جس زمانے میں علامہ اقبالؒ نے اپنے اشعار لکھے تھے اس وقت انہیں سمجھنے والا کوئی نہ تھا حتیٰ علامہ اقبالؒ کے بیٹے کو آج تک آپ کا ایک شعر سمجھ نہ آسکا۔ حالانکہ جاوید نامہ میں جاوید کو خطاب کر کے اشعار لکھے۔ آج ساری دنیا سمجھ گئی لیکن وہ اس قدر نالائق ہے کہ ابھی تک نہیں سمجھا۔ علامہ اقبالؒ نے خود فرمایا تھا کہ میں آج کا شاعر نہیں ہوں۔ جو نسل مجھے سمجھنے والی ہے وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی چنانچہ فرماتے ہیں:

نغمہ ام، از زخمہ بی پرواستم

من نوای شاعرِ فرداستم

عصرِ من دانندۂ اسرار نیست

یوسفِ من بہرِ این بازار نیست......[1]

ساز بجانے والے کی انگلی کے ساتھ ایک ٹِک سا لگا ہوتا ہے جسے وہ تاروں کے اوپر مارتا ہے یا بسا اوقات ہاتھ میں کوئی ایسی چیز لے لیتا ہے جس سے ساز کی تاروں کو چھیڑتا ہے اسے زخمہ کہتے ہیں۔ تاروں سے نغمے اس وقت نکلتے ہیں جب ان تاروں کے اوپر وہ زخمہ لگایا جائے۔ اقبالؒ فرما رہے ہیں کہ میں وہ نغمہ ہوں جس کو چھیڑنے کے لئے زخمہ نہیں چاہیئے۔ میں آج کا شاعر نہیں ہوں بلکہ کل کے شاعر کی صدا ہوں اور پھر خود اقبالؒ نے فرمادیا کہ میں آج جو کچھ کہہ رہا ہوں تو ضروری نہیں ہے کہ حاضرین میں سے کوئی ایسا بیٹھا ہوا ہو جو میری بات سمجھ جائے یعنی میرے زمانے کے لوگ اسرار کے پیچھے نہیں ہیں بلکہ یہ روٹیوں کے پیچھے ہیں لہٰذا میرا یوسف اس زمانے کیلئے نہیں ہے۔

یوسف یعنی گرانقدر متاع، گراں بہا پیغام و ہدایت۔ کبھی یہ یوسف ایسے بازار میں پیش کیا جاتا ہے

[1]......(اسرار خودی، علامہ اقبالؒ)

جہاں اس کا کوئی خریدار نہ ہو۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام بازارِ مصر میں کوڑیوں کے مول لیا گیا لیکن علی علیہ السلام کا یوسف اتنی کوڑیوں میں بھی کسی نے نہیں خریدا۔ بالآخر علی علیہ السلام کو کنویں جا کر بات کرنی پڑی۔ یہ خطبے یوسفِ علیؑ ہیں لیکن کیا ہم اس پیغامِ علیؑ، دردِ علیؑ اور سوزِ علیؑ کے خریدار بنے ہیں؟ ہم نے تو کبھی اس کا بھاؤ تک نہیں پوچھا!

آئندہ نسلوں کا پیغام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب خطبہ غدیر دیا تو ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اے سننے والوں اسے لکھو، سمجھو، حفظ کرو اور پھر دوسروں تک پہنچاؤ۔ چونکہ شاید میری بات سمجھنے والا تم میں کوئی بھی نہ ہو۔ اور تاریخ نے بھی ثابت کر دیا کہ ایسا ہی تھا۔ حتیٰ حسان ابن ثابت کہ جس نے سب سے پہلے مدحِ ولایت میں اشعار پڑھے وہ بھی پیغامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں سمجھ سکا۔ اس نے عقیدتوں بھرا قصیدہ وہیں پر فی الفور وفی البدیہہ پڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے داد حاصل کی لیکن خود حقیقت کو نہیں سمجھ سکا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلَى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ......[1]

بہت سے فقہ بتانے والے اس کو بتاتے ہیں جو ان سے زیادہ جاننے والا ہوتا ہے......

یہ جو کچھ سن رہے ہو اس کو لکھ لو اور دوسروں تک نقل کرو کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک نقل کرنے والا، آگے پہنچانے والا خود نہیں سمجھتا لیکن جس تک پہنچاتا ہے وہ بہت بہتر سمجھتا ہے۔ پس اسی قانون کے تحت ان حقیقتوں کا اظہار کیا گیا ہے۔

---

[1]......(بحار الانوار-علامہ مجلسیؒ، الجزء ۷۴، صفحہ ۱۴۶)(مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل-میرزا حسین النوری الطبرسیؒ، الجزء ۱۷، صفحہ ۲۸۵)(المُعْجَمُ الکبیر-ابو القاسم الطبراني، المتوفى: ۳۶۰ھ)
(مسند الإمام أحمد بن حنبل-أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني، المتوفى: ۲۴۱ھ)

خطبات میں شبہات ڈالنا

بعض نے یہ شک کیا ہے کہ نہج البلاغہ کے خطبے سید رضی کے اپنے خطبے ہیں چونکہ وہ بہت فصیح و بلیغ ادیب تھے لہٰذا اپنے خطبوں پر مقبولیت کی مہر لگوانے کیلئے انہیں علی علیہ السلام سے منسوب کر دیا۔ علماء نے اس شبہ کا جواب دیا ہے کہ سید رضی کا کلام بھی موجود ہے اور یہ خطبات بھی درج ہیں لیکن جس طرح کلامِ بشر میں کلامِ خالق ممتاز ہے اسی طرح کلامِ علماء میں کلامِ علیؑ ممتاز ہے۔ ان میں آپس میں تھوڑی سی بھی شباہت نہیں ہے۔ یہ سارے شبہات جہالت اور نادانی کی وجہ سے ہیں۔

اسی طرح جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے خطبے کے بارے میں بھی بعض نے شبہات ذکر کیے ہیں۔ البتہ ہمیں ان شبہات کی وجوہات معلوم ہیں؟ اصل حقیقت جو ان خطبات کے اندر نمایاں تھی اس حقیقت کو روکنے کے لئے خود خطبے کے اندر شبہ ڈالا گیا۔ یہ خطبہ فاطمیہ یوسفِ زہراء سلام اللہ علیہا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس محفل میں کوئی ایسا موجود ہو چونکہ یہ پیغام قیامت تک آنے والی بشریت کے لئے تھا۔

حکمران طبقہ کی ایک بڑی ذمہ دار شخصیت نے جب حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کا یہ خطبہ سنا، یہ فصاحت و بلاغت سنی، اُس کے اندر مضبوط و محکم اصول سنے، خطبے کی جہت اور کاٹ کو دیکھا، لہجے اور انداز کو دیکھا تو اسی وقت مسجد میں سب کے سامنے کہا: لگتا ہے کہ علی علیہ السلام نے پوری رات بیٹھ کر فاطمہؑ کو خطبہ ازبر کرا کے میدان میں اُتارا ہے اور انہوں نے حفظ کر کے صبح مسجد میں بیان کر دیا ہے۔ اُنہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ خطبہ سیدہ سلام اللہ علیہا کا ہے چونکہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا لکھا ہوا خطبہ نہیں پڑھ رہی تھیں بلکہ فی البدیہہ خطاب کر رہی تھیں۔

ایک شبہ یہ ڈالا کہ یہ کسی خاتون کا خطبہ نہیں لگتا، اس لئے کہ نہ اُس زمانے کی خواتین ایسی باتیں کرتی تھیں اور نہ ہی آج کی خواتین ایسی باتیں کرتی ہیں، خواتین کی باتیں ایسی نہیں ہوتیں جیسی اس خطبے میں ہیں، خواتین اس موضوع پہ بولتی ہی نہیں ہیں، ایسی گفتگو کرنا زنانہ مزاج ہی نہیں ہے۔ یہ شبہات جہالت اور نادانی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہیں۔ وہ درحقیقت اس راز، حقیقت، کمالات اور فضائل سے آگاہ و آشناہ نہیں تھے جو خداوند تبارک وتعالیٰ نے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی ذات میں رکھے ہوئے تھے۔

جس طرح علی علیہ السلام کے خطبوں کی بلندی اور سامعین کی پستی لوگوں کو شک میں ڈال دیتی ہے کہ اتنے گھٹیا لوگوں کے سامنے اتنا اعلیٰ خطبہ کیسے دیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح اس خطبہ کی بلندی اس قدر زیادہ ہے کہ لوگوں کو شک میں ڈال رہی ہے۔ کہنے لگے کہ خواتین تو ایسی باتیں سوچتی بھی نہیں ہیں۔ یہ لوگ اس لحاظ سے درست کہتے ہیں چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اور بھی خواتین تھیں لیکن کسی کی زبان سے بھی ایسا نورانی خطبہ نہیں نکلا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلقہ عقد میں بہت ساری فاضل اور اعلیٰ شخصیت کی مالک خواتین تھیں لیکن تمام تر عظمت کے باوجود جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کے خطبے کی مانند خطبہ تو دور کی بات ہے ایک جملہ بھی عمر بھر ادا نہ ہوسکا اور یہ حقیقت ہے کہ خواتین اس وقت ایسی باتیں نہیں کرتیں بلکہ ان کی دلچسپی کے موضوعات کچھ اور ہیں۔

غرضیکہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کے خطبات میں شک ایجاد کرنا پست لوگوں کا پرانا وطیرہ رہا ہے۔ دین مبین اسلام کی تعلیمات کا نچوڑ یہ خطبہ فاطمیہؑ فصاحت و بلاغت کی بلندیوں پہ پہنچا ہوا ہے۔ یہ خطبہ دینے کی وجہ وہ حکومت بنی جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تشکیل دے دی گئی تھی۔

تشیع، رہینِ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا

غرضیکہ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا نے اصل کام یہ انجام دیا کہ خطِ رسولؐ، راہِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واس دور کی پیچیدگیوں، سیاستوں، مشکلات، حزبوں اور گروہوں کے اندر گم نہیں ہونے دیا۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے خطِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنا نمایاں و روشن کر دیا کہ اس میں اپنی جان تک دے دی۔ اب قیامت تک خطِ رسولؐ کبھی گم نہیں ہوگا اگرچہ اس کے اردگرد متوازی خطوط بنیں گے۔ ممکن ہے کہ لوگ مشکلات کا شکار ہوں لیکن یہ خطِ فکری و عملی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنا نورانی ہے کہ ہرگز گم نہیں ہوگا۔

ہمارے ایک استادِ بزرگوار کا جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی بارگاہ میں یہ جملہ بہت بجا اور حقیقت پر مبنی ہے کہ اگر جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا یہ اقدامات نہ کرتیں، یہ خطبہ بیان نہ کرتیں، یہ حقائق روشن نہ کرتیں اور ان سے

پردہ نہ ہٹاتیں تو تشیع اپنا مستقل وجود قائم نہیں کرسکتا تھا۔ تشیع کی پہلی بنیاد جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے واضح کی اور تشیع کو ضم اور گم ہونے سے بچالیا۔ آپؑ نے خطِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں پر واضح کردیا اس پر ڈالا گیا سارا غبار ہٹادیا۔ آج تک تشیع رہینِ جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا ہے۔

فصل سوم:

حمد، شکر وثنائے پروردگار سے

آغازِ خطبۂ فاطمیہؑ

خطبہ دینے کیلئے بی بی زہراء سلام اللہ علیہا کی آمادگی

روایت میں وارد ہوا ہے کہ جب حضرتِ زہراء سلام اللہ علیہا کو اطلاع ملی کہ حکومتی فرمان کے تحت فدک ان سے لے لیا گیا ہے تو آپؑ فوراً تیار ہوئیں۔ آپؑ نے معمول کا لباس جو پہنتی تھیں اُس کے اوپر ایک اور لباس پہنا جو آدھے بدن کو چھپاتا ہے، اُس کے بعد ایک اور لباس پہنا جو پورے بدن کو چھپاتا ہے پھر اُس کے اوپر ایک لمبی چادر اوڑھی اور گھر کی کچھ کنیزوں، بچوں اور چند خواتین کو اپنے ساتھ لے کر مسجد نبوی کی طرف روانہ ہوگئیں۔ بی بی سلام اللہ علیہا کے حجرے اور مسجد کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ تھا۔ راوی کے بیان کے مطابق وہ چادر اس قدر دراز تھی کہ سیدہ سلام اللہ علیہا اس عالم میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی جارہی تھیں اور چادر بار بار جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے پاؤں کے نیچے آرہی تھی اور چلنے کا انداز مکمل طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشابہ تھا۔ آپؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح چل کر آئیں تو دیکھنے والے کو یہی لگا کہ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آرہے ہیں۔

جوں ہی آپؑ مسجد میں داخل ہوئیں تو مسجد میں پردہ آویزاں کیا گیا۔ خواتین ایک طرف اور مرد دوسری طرف تھے۔ مسجد میں کثیر ساتھیوں کے ساتھ خلیفہ بیٹھے ہوئے تھے۔ روایت میں اُن لوگوں کے نام بھی لکھے ہوئے ہیں۔ بی بی سلام اللہ علیہا مسجد میں داخل ہوئیں اور خواتین کے ساتھ بیٹھتے ہی فریاد کر کے رونا شروع کیا۔ بی بیؑ کی فریادوں سے وہ ساری عورتیں رونے لگیں اور اُن عورتوں کی گریہ وبکا سن کر وہ مرد بھی رونے لگے جو مسجد میں موجود تھے۔ اس جگر سوز گریہ سے محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ مجلس میں رونے کی بھی آوازیں آرہی تھیں اور چہ میگوئیوں کی بھی۔ مسجد میں ایک کہرام مچ گیا تھا۔ دیر تک شدید گریہ ہوا پھر اُس کے بعد بی بیؑ تھوڑی خاموش ہوئیں۔ روایت میں ہے کہ بی بیؑ نے اُن کو مہلت دی تا کہ اپنا غضب وغصہ کم کریں۔ جب حاضرین کی آوازیں کم ہوئیں تو پھر کھڑی ہوگئیں اور حمد وثناء سے خطبہ کا آغاز کیا:

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ عَلٰی مَا أَنْعَمَ، وَلَهُ الشُّكْرُ عَلٰی مَا أَلْهَمَ، وَالثَّنَاءُ بِمَا قَدَّمَ، مِنْ عُمُوْمِ نِعَمٍ إِبْتَدَأَهَا،

وَسُبُوغِ اَلْآءٍ أَسْدَاهَا، وَتَمَامِ مِنَنٍ اَوْلَاهَا...*، جَمَّ عَنِ الْإِحْصَاءِ عَدَدُهَا، وَنَآى عَنِ الْجَزَاءِ أَمَدُهَا، وَتَفَاوَتَ عَنِ الْإِدْرَاكِ أَبَدُهَا، وَنَدَبَهُمْ لِإِسْتِزَادَتِهَا بِالشُّكْرِ لِإِتِّصَالِهَا وَاسْتَحْمَدَ إِلَى الْخَلَائِقِ بِإِجْزَالِهَا، وَثَنّٰى بِالنَّدْبِ إِلٰى أَمْثَالِهَا،......[1]

حمد ہے اس خدا کی، ان نعمتوں پر جو خدا نے عطا کی ہیں......اور شکر ہے پروردگار کا ان چیزوں پر جو اس نے الہام کی ہیں......اور ثناء، حمد و تعریف ہے اس خدا کی جو کچھ اس نے پہلے سے عطا کیا ہے......وہ عموم، عام نعمتیں جنہیں خدا نے ہمیں ابتداء عطا کیا ہے......اور وہ فراوان نعمتیں جو خداوند تبارک وتعالیٰ نے بجا طور پر نازل کی ہیں......اور وہ عظیم نعمتیں جو متواتر و پے در پے بغیر وقفے کے خدا نے عطا کی ہیں......ان نعمتوں کا عدد اتنا عظیم و بڑھا ہوا ہے کہ وہ قابلِ شمار نہیں ہے......اور وہ نعمتیں اتنی عظیم ہیں جن کی جزاء کے لئے کوئی میدان نہیں ہے کہ ان کی جزاء دی جا سکے، کوئی حد نہیں ہے......اور ابد بھی ان نعمتوں کے ادراک سے قاصر و عاجز ہے......اور پھر اس کے بعد خدا وند تبارک وتعالیٰ نے اتنی عظیم نعمتیں دے کر پھر یہ فرمایا کہ تم شکر کرو میں اس کے علاوہ اور بھی تمہیں دوں گا۔ یہ جو شمار سے باہر ہیں، یہ شمار سے باہر نعمتیں دے کر ان کو مزید بڑھانے کا فارمولا بھی خدا نے بتا دیا کہ تم میرا شکر ادا کرو میں تمہیں مزید عطا کروں گا......اور پھر خلائق کو کیا کہا؟ کہ مزید نعمتوں کے نزول کے لئے تم حمدِ خدا بجالاؤ، بندگیِ خدا بجالاؤ......اور پھر خداوند تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ میں نے دے دیا میرے خزانوں میں صرف اتنا ہی نہیں تھا بلکہ میرے خزانے مالا مال ہیں، میں اس سے بھی کہیں زیادہ تمہیں دے سکتا ہوں، تم صرف میری نعمتوں کی طرف رجوع کرو......

---

[1]......(الاحتجاج-أبی منصور أحمد بن علی بن أبی طالب الطبرسیؒ، الجزء ۱، صفحہ ۱۳۲)

[2]......(وفی بعض النسخ: "وَتَمَامِ مِنَنٍ وَالَاهَا")

خطبہ کا آغاز رسمی نہیں

آج کل رائج ہے کہ ہر خطیب گفتگو سے پہلے حمد وثنائے پروردگار کے چند رٹے رٹائے جملے اور رسولؐ و آلِ رسولؑ پر درود وسلام رسمی طور پر عادت کے تحت پڑھ دیتا ہے لیکن آلِ رسولؑ رسم و رواج اور عادت نہیں بلکہ معرفت وارادے کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ ملاحظہ کرنے کیلئے آپ امیر المومنین علیہ السلام کے خطبات کا مطالعہ کریں جو بارہ جلدوں کی کتابوں پر محیط ہیں۔ نہج البلاغہ ان بارہ جلدی کتابوں کے خطبات کا گلچین ہے۔ یعنی جتنی ضخیم نہج البلاغہ ہے اتنی ہی گیارہ جلدیں اور بنتی ہیں جس میں امیر المومنین علیہ السلام کے سارے خطبے جو تاریخ میں نقل کیے گئے ہیں محفوظ ہیں۔ بعض علماء نے یہ اکٹھے کیے ہیں جن میں سے سید رضیؒ نے گلچین کیا ہے یعنی فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے بہت اعلیٰ سطح کے خطبات جو ان کو پسند آئے وہ کاٹ چھانٹ کے ایک جلد میں نقل کئے ہیں۔ ہر خطبے کا آغاز الگ طریقہ سے ہے۔ نہج البلاغہ کا پہلا خطبہ الگ الفاظ سے شروع ہو رہا ہے، دوسرا خطبہ جدا الفاظ سے، اور تیسرا دیگر الفاظ سے۔ کیوں؟ اس لئے کہ علی علیہ السلام ایسے خطیب نہیں ہیں جیسے ہم نے دیکھے ہوئے ہیں کہ عادت کے تحت خطبہ دیتے ہیں بلکہ علی علیہ السلام وہ خطیب ہیں جو ارادے کے تحت خطبہ دیتے ہیں۔ علی علیہ السلام رسمی نہیں بلکہ معرفت کا خطبہ پڑھتے ہیں۔ آپؑ کے ہر خطبے میں حمد وثنائے پروردگار کا ایک نیا پہلو ہوتا ہے۔ بہت کم خطبے ایسے ہیں جہاں جملوں میں تکرار ہے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے یہ خطبہ اس طرح نہیں پڑھا جیسے کوئی پہلے تقریر لکھتا ہے پھر اسے رٹتا ہے اور بعد میں سامعین کو سنا دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپؑ نے حمد وثنائے پروردگار کے جملے رسماً کہے ہوں۔ بارگاہِ خدا میں یہ بے ادبی ہے کہ انسان خدا کے بارے میں رٹے ہوئے جملے یاد کر کے پڑھ دے جن کا معنیٰ خود بھی نہ جانتا ہو۔ چاپلوس قسم کے لوگ ایسے کام کرتے ہیں کہ کچھ ایسی عبارتیں رٹ کے آجاتے ہیں اور دوسروں کے سامنے دہرا دیتے ہیں۔ اگر وہ ان کو روک کے پوچھیں کہ یہ جو تم کہہ رہے ہو اس کا معنیٰ کیا ہے؟ تو انہیں معلوم نہیں ہوتا۔

اظہارِ حمد معرفت کا نتیجہ

حمد وشکر اور ثنائے پروردگار سے درحقیقت انسان کی معرفت کا اظہار ہوتا ہے۔جس کا ہم ترجمہ کرتے ہیں کہ تمام تعریفیں پروردگار کے لئے ہیں۔ پھر اس کے بعد کہتے ہیں کہ یہ چوہدری صاحب بہت ہی سخی آدمی ہیں، یہ پیر صاحب بہت پہنچے ہوئے ہیں، یہ سیٹھ صاحب بڑے ہی عالی مرتبت ہیں، یہ شاہ صاحب بہت بڑے عالم ہیں۔ آپ تو ابھی کہہ رہے تھے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ابھی جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ بیچ میں چوہدری صاحب، پیر صاحب، سیٹھ صاحب اور شاہ صاحب کی تعریفیں شروع ہوگئیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک الحمد کا معنیٰ ہی نہیں سمجھا۔اگر تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں تو پھر دوسروں کے لئے کیا بچا ہے؟ پھر دوسروں کی تعریف کیوں کرتے ہیں؟ یہ جملے عادتاً ہماری زبان سے جاری ہوجاتے ہیں۔مثلاً کسی کو سلام کرتے ہیں تو عادت کے تحت کرتے ہیں۔سلام کرنا رسم ہوگئی ہے جبکہ یہ دعا ہے۔اگر ہم نیت وارادے کے ساتھ یہ دعا کریں تو خدا قبول کرے گا۔بعض تو سلام بھی نہیں کہتے بلکہ ساما لیکم کہتے ہیں۔وہ سلامتی کے الفاظ ادا ہی نہیں کرتے ۔آپ سلامٌ علیکم کہہ کر باقاعدہ اس کا ارادہ کریں کہ میں کسی کے حق میں دعا مانگ رہا ہوں۔اسی طرح عادتاً نماز نہ پڑھیں بلکہ ارادے کے ساتھ پڑھیں۔نماز کا پہلا واجب نیت یعنی ارادہ ہے۔پس سارے کام ارادے اور معرفت کے ساتھ کریں نہ کہ عادت اور رسم کے طور پر۔

صرف زبان سے الحمد کہہ دینا حمد نہیں ہے بلکہ حمد معرفت کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح سورۂ مبارکہ حمد کا آغاز کرتے ہیں:

بِسۡمِ اللهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ۔لیکن کیا شروع کرتے ہیں؟ کھانا، پینا ،بولنا ، تقریر،لکھنا، آنا، جانا، کام کرنا چونکہ ہر کام میں ادب یہ ہے کہ پہلے اسے بسم اللہ سے شروع کریں۔نہیں، بلکہ......"بِسۡمِ اللهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ"...... یعنی میں قربِ الٰہی ومعرفتِ خدا کا سفر شروع کرتا ہوں خود اللہ ہی کے نام کے ساتھ، رحمان ورحیم کے نام کے ساتھ جوں ہی انسان یہ سفرِ معرفت طے کرتا ہے تو

اس کے بعد اس کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ

بسم اللہ کے بعد فوراً الحمد کیوں ہے؟ اس لئے کہ انسان جب کسی عظمت، بزرگی، بڑائی، کبریائی یا غیر معمولی چیز کو دیکھتا ہے تو سب سے پہلے بے ساختہ انسان کی زبان سے اس کی عظمت کا اقرار اظہار ہوتا ہے مثلاً اگر آپ ایک بہت تیز رفتار گاڑی دیکھیں تو بے ساختہ آپ کی زبان سے نکلتا ہے: کتنی تیز جا رہی ہے۔ آپ معمول سے بڑھی ہوئی کوئی بھی چیز دیکھیں تو فوراً بے ساختہ اس کا اقرار آپ کی زبان سے ادا ہو جاتا ہے، پس آپ نے بصیرت سے کام لیا اور عالمین کو دیکھا تو کہا:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ

یعنی ربوبیتِ خدا اور عالمین کو دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکلا کہ یہ ربِ عالمین لائق حمد وثناء ہے۔ پس ادراک اور معرفتِ خدا کے بعد بے ساختہ خدا کی عظمت کے اقرار کا نام حمد ہے۔

شکر اور ثنا کی کا فرق

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے خطبے کا آغاز یوں فرمایا:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ عَلٰی مَآ اَنۡعَمَ،

خدا نے جو نعمتیں عطا کی ہیں ان سب پر خدا کی حمد ہے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے آغازِ کلام کے لئے یا ربطِ کلام پیدا کرنے کے لئے عادتاً یا رسماً یہ جملہ ادا نہیں کیا بلکہ معرفت اور ارادے کے ساتھ ادا کیا۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا باغِ فدک کے چھن جانے کے بعد مسجد میں یہ خطبہ بیان کر رہی تھیں۔ اگر معمولی زبان ہوتی تو شکوے سے شروع ہوتی جیسے آج بھی اگر کسی کی گاڑی چوری ہو جائے تو وہ عدالت میں جا کر اپنا بیان کس چیز سے شروع کرتا ہے؟ کیا وہ اس طرح شروع کرتا ہے کہ......''اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ''......خدا نے مجھے گھر دیا، صحت دی اور دولت دی۔ بلکہ وہ جاتے ہی

کہے گا کہ یہ کوئی ملک ہے؟ یہ کوئی مملکت ہے؟ یہ کوئی نظام ہے؟ کہ یہاں میری گاڑی چوری ہوگئی۔اس کو گاڑی کی چوری کا احساس ہے لیکن وہ ہزاروں چیزیں جو محفوظ ہیں ان کا احساس نہیں ہے۔ہم سب ایسے ہیں کہ جب کسی کے دانت میں درد شروع ہوتا ہے اور کوئی فون کرتا ہے کہ کیا حال ہے؟ تو کہتا ہے کیا حال بتاؤں درد سے مر رہا ہوں، نہ سونا، نہ جینا، نہ اٹھنا، نہ کھانا، نہ پینا، یہ بھی کوئی زندگی ہے؟! اس درد نے تو میری زندگی حرام کردی ہے۔بتیس دانتوں میں سے ایک درد میں مبتلا ہے لیکن تمہارے اکتیس دانت تو ٹھیک ہیں ۔ پہلے ان اکتیس دانتوں کا ذکر کرو کہ الحمدللہ! یہ ٹھیک ہیں، گلا بھی ٹھیک ہے، ناک بھی ٹھیک ہے، سماعت بھی ٹھیک ہے لیکن ایک دانت تھوڑا سا درد کررہا ہے۔ہم شاکر و حامد نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ شاکی ہیں۔

اگر خاندان میں ایک آدمی مرجاتا ہے تو کہتے ہیں خدا نے یہ کیا نازل کردیا، ہم پر بڑی مصیبت نازل ہوگئی۔اگر ان سے پوچھیں کہ کیا ہوا تو کہتے ہیں ایک سو پانچ سالہ بوڑھا فوت ہوگیا ہے۔جبکہ خود سالم ہے، بیوی بچے اور سارے عزیز و رشتے دار سالم ہیں۔ہم زبان سے شکر ادا کرنے والے نہیں ہیں کیونکہ ہم اس کی معرفت نہیں رکھتے۔ہمارے استادِ بزرگوار حضرت آیۃ اللہ حسن زادہ آملی دام ظلہ العالی کہ خداوند تبارک وتعالیٰ انہیں صحت وسلامتی عطا فرمائے اپنے استاد میرزا ابوالحسن شیرانیؒ سے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔وہ بہت ہی عظیم شخصیت تھے اور اپنے زمانے کے ناشناختہ نابغہ اور ذوالفنون تھے۔انہیں تقریباً دس پندرہ بیماریاں ایک ساتھ لگ گئی تھیں مثلاً دل کی بھی بیماری ہوگئی، شوگر بھی ہوگئی وغیرہ وغیرہ۔ہسپتال میں جب انہیں لوگ دیکھنے کے لئے آتے اور پوچھتے کہ کیا حال ہے؟ تو کہتے تھے الحمدللہ فلاں فلاں بیماریاں نہیں لگی ہیں مثلاً الحمدللہ ابھی کینسر نہیں ہوا، الحمدللہ ابھی ایڈز نہیں ہے، الحمدللہ قولنج نہیں ہے، الحمدللہ السر نہیں ہے، سو بیماریاں گنوا کر کہتے تھے الحمدللہ یہ نہیں لگیں اس پر میں خدا کا شکر بجالاتا ہوں۔اسے کہتے ہیں انسانِ شکور۔

حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا شاکر در بارگاہِ خدا

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا متوجہ ہیں کہ اللہ نے انہیں کیا کیا نعمتیں عطا کی ہیں۔یوں نہیں کہ نخلستان چھین لیا

گیا ہے تو خدا کی بارگاہ میں شا کی ہو جائیں۔ آپؑ خدا کی نعمتوں پر پہلے شکر بجا لاتی ہیں کہ شرفِ رسالت تو ہمارے پاس موجود ہے، شرفِ امامت تو ہمارے پاس موجود ہے، سیادت تو ہمارے پاس موجود ہے، عصمت تو ہمارے پاس موجود ہے، برگزیدگی تو ہمارے پاس موجود ہے، ولایت تو ہمارے پاس موجود ہے، قربِ خدا تو ہمارے پاس موجود ہے، رضائے خدا تو ہمارے پاس موجود ہے، مقامِ کوثر تو ہمارے پاس موجود ہے، قرآن کا نازل ہونا تو موجود ہے، ملائکہ کی رفت وآمد تو موجود ہے۔ اتنی نعمتیں خدا نے زہراء سلام اللہ علیہا کو دی ہیں اگر ایک نخلستان لے بھی لیا گیا تو نخلستان کا تذکرہ بعد میں کروں گی لیکن نعمتوں کا ذکر پہلے کروں گی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی مَا أَنْعَمَ،

زہراء سلام اللہ علیہا بارگاہِ خدا میں شا کر ہے۔ اے پروردگار میں بھولی نہیں ہوں مجھے یہ معلوم ہے کہ تو نے مجھے کیا کیا عطا کیا ہے؟

ہم ان مادی چیزوں کو نعمت سمجھتے ہیں جن سے فقط لذت اٹھائی جا سکے اور ان کی تعداد بھی زیادہ ہو۔ اگر ایک آدمی کو دو روٹیوں کی بھوک ہے تو وہ پانچ روٹیوں کو اپنے لئے نعمت سمجھتا ہے۔ سو روپے کی ضرورت ہے تو وہ پانچ سو روپے کو اپنے لئے نعمت سمجھتا ہے۔ آیا یہ نعمت ہیں؟

نعمت کی تعریف

نعمت خدا کے دیئے ہوئے اس وسیلے وذریعے کو کہتے ہیں جو انسان کو مقصدِ خلقت تک پہنچنے میں مدد دے۔ اگر اس سے زیادہ ہو جائے تو یہ وبال ہے۔ مثلاً لاہور سے ملتان جانے کیلئے آپ کو ایک گاڑی کی ضرورت ہے کہ جس سے آپ اپنے مقصد تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن فرض کریں آپ کو دس گاڑیوں کی چابیاں دے دی جائیں تو یہ نو گاڑیاں نعمت نہیں بلکہ وبال ہیں کیونکہ یہ مقصد کی طرف جانے سے روک رہی ہیں، آدمی کیوں نہیں جا رہا؟ کہتا ہے کہ ان نو گاڑیوں کی خاطر نہیں جا رہا کہ کہیں یہ چوری نہ ہو جائیں۔ آپ کے لئے اتنا ہی گھر نعمت ہے جس میں رہ کر آپ مقصدِ زندگی حاصل کر سکیں لیکن اس سے زیادہ وبال ہے جسے سنبھالنے

کے لئے مقصدِ زندگی بھولنا وفراموش کرنا پڑ جائے۔اسی طرح اتنا ہی مال نعمت ہے جس کے ذریعے اپنا مقصدِ حیات حاصل کرسکیں اس سے زیادہ مال وبال ونقمت ہے۔

بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کا مختصر حجرہ وسامان اور عظیم حمد خدا

تاریخ میں وہ سامان بھی درج ہے جو جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے حجرے میں تھا۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے گھر میں مادی نعمتیں کیا تھیں؟ جن پر آپ ؑ شکر گزار ہیں۔ پاکستان کے ایک شہر میں جانا ہوا تو وہاں پر خواتین کا مدرسہ دیکھنے کا موقع ملا جہاں طالبات نے ایک بہت خوبصورت کام کیا ہوا تھا۔انہوں نے ایک کمرہ جس کی حدود تاریخ کی کتاب پڑھ کر مشخص کی ہوئی تھیں بنایا ہوا تھا۔ظاہر ہے اس وقت انچی ٹیپ نہیں تھا لہٰذا اس وقت میٹر کے بجائے ذراع کی اکائی استعمال ہوتی تھی۔اسی طرح وقت کا دقیق نظام موجود نہیں تھا کہ جس طرح ہمارے ذاکرین آج کل جذبات میں پڑھ جاتے ہیں کہ فلاں واقعہ اتنے بج کر اتنے منٹ اور اتنے سیکنڈ پر پیش آیا۔اس زمانے میں اتنا دقیق ٹائم نوٹ نہیں ہوتا تھا بلکہ کچھ اور پیمانے ہوتے تھے۔حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کے حجرے کا سائز ذراع میں ذکر کیا گیا ہے۔اسی کے مطابق انہوں نے ایک حجرہ بنایا تھا اور اس حجرے کے اندر وہ سارا سامان جو تاریخ میں لکھا ہوا ہے رکھا تھا۔میں بلا مبالغہ کہہ رہا ہوں کہ کمرے کی اس شبیہ یا ماڈل کے اندر رکھا ہوا سارا سامان اگر سمیٹا جائے تو وہ آپ کی گاڑی کی ڈگی میں رکھا جاسکتا ہے بلکہ اس میں پھر بھی جگہ بچ جائے گی۔وہ بی بی سلام اللہ علیہا مسجد نبی میں صحابہ رسولؐ کے سامنے خطبہ پڑھ رہی ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی مَا أَنْعَمَ،

حمد ہے اس خدا کی جس نے نعمتیں عطا کی ہیں۔

پھر اگلے جملے اسی بارے میں ہیں کہ اللہ نے اتنی عظیم نعمتیں عطا کی ہیں جو شمار نہیں ہوسکتیں۔ بی بی سلام اللہ علیہا آپ ان نعمتوں پر اتنا زیادہ شکر ادا کررہی ہیں۔آج دیکھیں کہ جو خواتین دس دس کنال کے مکان میں رہتی ہیں اور ان کے گھر کا سامان اتنا زیادہ ہے کہ اسے شفٹ کرنے کے لئے ٹرین یا ٹرالر بک

کروانا پڑتا ہے کیونکہ ٹرک ناکافی ہوتے ہیں لیکن اگر ان کی گفتگو سنیں تو ناسپاسی و ناشکری سے اٹی ہوتی ہے۔ پھر یہ ایامِ فاطمیہ میں بی بیؑ کے غم میں روتی بھی ہیں۔ اس لئے کہتے ہیں کہ ہم نے فقط عقیدتِ جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا سنی ہے جبکہ حقیقتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا ابھی ہمارے سامنے روشن نہیں ہوئی۔

خودخواہی کے ہاتھوں بشریت کی شکست

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے یہ نہیں کہا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی مَا اَنْعَمْنَا یعنی جو نعمتیں خدا نے مجھے و ہمیں دی ہیں میں اس پر خدا کی حمد کرتی ہوں بلکہ فرمایا کہ نعمتوں پر خدا کی حمد کرتی ہوں۔ اگر ہم صرف ان نعمتوں پر خدا کی حمد کریں جو اللہ نے ہمیں دی ہیں تو یہ اللہ کی حمد نہیں، یہ نعمتوں کا شکر بھی نہیں بلکہ درحقیقت خودخواہی ہے۔

استادِ بزرگوار حضرت علامہ محمد تقی جعفری فرماتے ہیں کہ یہ بشریت جو آج زمین کے اوپر موجود ہے خودخواہی، خود پرستی، خودغرضی، خود بینی، خودمحوری اور خود پسندی کے ہاتھوں شکست کھا چکی ہے۔

لشکرِ بشر خواہ مشرق کا ہو یا مغرب کا، دینی ہو یا سکیولر، مسیحی ہو یا مسلمان، تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ، عورت ہو یا مرد، جوان ہو یا پیر سب کے اندر یہ خودخواہی نظر آتی ہے۔ یہ سب خودخواہی کے سامنے تسلیم ہو چکے ہیں۔ انسان کے اوپر خودخواہی نے غلبہ پالیا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات یہ خودخواہی عبادت بن جاتی ہے۔ خودخواہ انسان اپنی خودخواہی کا اظہار کرتا ہے کہ میں بڑا ہی مخلص انسان ہوں اور اسی کو تقویٰ سمجھتا ہے۔

خودخواہی کے ہاتھوں بشریت کی شکست

علمی سرمایوں سے آشنائی کی ضرورت

ہمیں اپنے علمی سرمایوں سے آشنا ہونے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ یہ بہت ہی عظیم شخصیات ہیں۔ ائمہ معصومین علیہم السلام نے بعض شیعہ علماء کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ ارکانِ اسلام ہیں، ان کے دوش پر دین قائم ہے، اگر یہ نہ ہوتے تو دین ختم ہو چکا ہوتا۔ ہر دور میں ایسے ارکانِ دین رہے ہیں۔ انہی ارکانِ دین سے میں ایک ناشناختہ شخصیت استادِ بزرگوار علامہ محمد تقی جعفری ہیں۔ ان کا ایک عجیب منفرد کارنامہ نہج البلاغہ کی منفرد تفسیر

ہے۔آپ خود ایک منفرد عالم دین ہیں۔ یہ وہ شخصیت ہیں کہ جنہوں نے نجفِ اشرف میں تعلیم حاصل کی اور پرورش پائی۔لیکن ان کے کسی پہلو سے نہیں لگتا کہ یہ نجف سے پڑھے ہیں چونکہ نجف سے پڑھے ہوئے عالم دین کا اپنا ایک خاص انداز اور خاص تفکر ہوتا ہے۔لیکن یہ دنیا کے تمام علوم سے آشنا ہیں۔آپ ایک عالی فیلسوف اور بہترین حقوق دان بھی ہیں۔ وہ موضوعات جو عموماً علومِ دینی کی فہرست میں شامل ہی نہیں کئے گئے یا برسوں و عرصوں سے نکال دیئے گئے اس بزرگوار نے وہ علوم بھی حاصل کئے۔از جملہ ایک موضوع جس میں انہوں نے تخصص حاصل کیا اور پھر اس پہ قلم فرسائی کی وہ جمالیات کا موضوع ہے۔آپ نے نہج البلاغہ کی بہت خوبصورت اور بہت ہی زیبا تفسیر ایک منفرد انداز بیان کے ساتھ پیش کی ہے۔ان کی تفسیر تفسیرِ نہج البلاغہ ہی کے نام سے معروف ہے۔البتہ کم لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں چونکہ لوگ نہج البلاغہ کے ساتھ زیادہ مانوس نہیں ہیں لیکن ان کے شاگردان و ہم فکر جو ان کے تفکر سے آشنا ہیں ان کے لئے ان کے آثار بہت ہی مفید ہیں۔اس استاد بزرگوار کے افکار عالی شان ہیں اور خودخواہی سے متعلق درج بالا جملہ بہت قیمتی ہے۔

خودخواہی کے بھیس

خودخواہی بھیس بدل کے آتی ہے جس طرح دنیا بھیس بدل کے آتی ہے۔پھر حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

یَا دُنْیَا یَا دُنْیَا، إِلَیکِ عَنِّیْ أَبِیْ تَعَرَّضْتِ؟أَمْ إِلَیَّ تَشَوَّقْتِ؟لَا حَانَ حِیْنُکِ هَیْهَاتَ!غُرِّیْ غَیْرِیْ......[1]

اے دنیا!اے دنیا!دور ہو مجھ سے،کیا میرے سامنے اپنے آپ کو لاتی ہے؟ یا میری دلدادہ وفریفتہ بن کر آئی ہے؟ تیرا وہ وقت نہ آئے (کہ تو مجھے فریب دے سکے) بھلا یہ کیونکر ہوسکتا ہے، جا کسی اور کو دھوکا دے۔

اے دنیا کسی بے بصیرت کو دھوکا دے۔تو علی علیہ السلام کو دھوکا نہیں دے سکتی۔تو جس بھیس میں آئے گی علی علیہ السلام تجھے پہچان لے گا اور حجابوں کے نیچے تجھے تشخیص دے لے گا۔

---

[1]......(نہج البلاغہ،حکمت ۷۷)

اسی طرح خودخواہی ہزار بھیس بدل کے آتی ہے۔ اقبالؒ کے بقول:

عقل عیار ہے، سو بھیس بنالیتی ہے

عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم!......۱

عقل کبھی تقویٰ کا بھیس، کبھی علم کا بھیس، کبھی اخلاص کا بھیس، کبھی خیرخواہی کا بھیس غرضیکہ ہزاروں بھیس بدل لیتی ہے۔

خودخواہ کی گفتار ہی الگ ہوتی ہے۔ وہ جب بات کرتا ہے، شکر کرتا ہے، حمد کرتا ہے، تعریف کرتا ہے تو اسی سے پتا چل جاتا ہے۔ خودخواہ فقط اپنی ذات کو دیکھتا ہے۔ وہ خدا کا نام بھی اپنی خاطر لیتا ہے اور اسی خود خواہی کے ہاتھوں انسان شکست کھا چکا ہے۔ خدا رحمت کرے اس عظیم انسان پر جس نے فرمایا کہ یہ سات ارب جمیعت کا لشکر جو اس کرہِ ارض پر موجود ہے خودخواہی کے ہاتھوں شکست خوردہ ہے۔ لیکن عشق بھیس نہیں بدل سکتا۔ عشق اس لحاظ سے بے ہنر ہے۔ جو بھیس نہیں بنا سکتا وہ ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہتا ہے۔ پس عشق میں منافقت نہیں ہے۔

عقل کی اقسام

عقل کی اقسام

انسان کے اندر کئی اقسام کی عقل موجود ہے:

۱۔ عقلِ علمی

۲۔ عقلِ عملی

۳۔ عقلِ سوداگر

۴۔ عقلِ مکار

۵۔ عقلِ مفاد پرست، وغیرہ

۱...... (بالِ جبریلؑ - علامہ اقبالؒ، صفحہ ۲۵)

اسی طرح عقلِ علمی روشنی ہے اور راستہ دکھاتی ہے جبکہ عقلِ عملی رہبر و راہنما ہے اور راستہ پر چلاتی ہے۔ عقلِ عملی دہلیزِ عشق تک پہنچا دیتی ہے اور پھر کہتی ہے کہ میرا سفر یہیں تک تھا، میں یہیں تک تیری رہبر تھی لہٰذا اب تیری زِمام کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔

مذموم عقل

مذموم عقل

بزرگوں کے کلام میں جب بھی عقل کی مذمت ہوتی ہے تو اس سے مراد عقلِ مکار، عقلِ مفاد پرست یا عقلِ سوداگر ہوتی ہے۔ عقل کی ایک قسم ایسی ہے جس کا نام ہم نے سمجھانے کے لئے عقلِ زنانہ رکھا ہے۔ وہ عقل جو جزئیات میں بہت زیادہ جاتی ہے اور کلیات سے اس کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس کی دید بھی مختلف ہوتی ہے۔ جزء بین و جزئیت پسند انسان کو کبھی بھی حسن نظر نہیں آتا۔ کلی نظر رکھنے والے انسان کو ایک اچھا علمی مرکز حسین نظر آتا ہے۔ اسے یہ منظر بہت ہی زیبا نظر آتا ہے کہ خوبصورت جگہ ہے، طلباء ہیں، علم ہے، عبادت ہے، مجلس ہے۔ اسے نورانیت نظر آتی ہے اس لئے کہ کلی نگاہ کر رہا ہے لیکن بعض جزئی ہوتے ہیں۔ وہ کیا دیکھتے ہیں؟ وہ آ کر فقط ٹوٹی کھولیں گے اور اگر ان میں سے ایک ٹوٹی ڈھیلی (Loose) ہے، اس میں پانی نہیں ہے تو یہیں سے ایک رائے قائم کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ ادارہ ناکام ہے چونکہ ایک ٹوٹی میں پانی نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی ایک عقل ہے۔

ایک اور سادہ سی مثال یہ ہے کہ عموماً آپ جب لوگوں کا چہرے دیکھتے ہیں تو چہرہ بہت ہی حسین نظر آتا ہے۔ چونکہ آپ نگاہِ کلی کر رہے ہیں اس وجہ سے چہرہ بہت ہی خوبصورت نظر آتا ہے۔ ایک ہی نگاہ میں آپ کو آنکھیں، گال، پیشانی، ناک، لب، ٹھوڑی، مونچھ، ریش (اگر ہے تو) نظر آ رہی ہے اور چہرہ حسین، زیبا و نورانی لگتا ہے لیکن اگر اسی چہرے کے اوپر جزئی نگاہ ڈالیں تو یہی چہرہ بدصورت ہے۔ مثلاً اگر قریب ہو کر کسی کی ناک کے اندر جھانک کے دیکھیں تو وہ کیسا لگے گا؟ خوبصورت ہے یا بدصورت؟ متلی آنا شروع ہو جائے گی۔ اب اشکال پیش کرتا ہے کہ اس کو چھوڑ و اس کی تو ناک میں عجیب وغریب بال

ہیں۔اب یہاں پر آپ کی غلطی ہے کہ اتنی جزئیات میں جا کر دیکھا۔جزئیت یعنی ایک نقطہ پہ نظر جما کے دیکھنا اور باقی ساری چیزوں سے نظر ہٹا لینا۔اس سے انسان ہمیشہ غلطی کی طرف چلا جاتا ہے۔یہ وہ نگاہ ہے جو انسان کو گمراہ کر دیتی ہے۔یہ کام عقلِ زنانہ کرتی ہے۔

آپ ہمیشہ نگاہِ جامع کریں۔ناک باعثِ حسن ہے لیکن اگر سب سے نظریں ہٹا کر فقط اس پہ نظریں جما کے دیکھیں گے تو یہ نہ صرف حسن نہیں ہے باعثِ کراہت بھی ہے۔اگر آپ کسی کے گھر پر جامع وکلی نگاہ کریں تو بہت خوبصورت گھر نظر آتا ہے لیکن اگر آپ وہاں کسی نالی سے ڈھکن اٹھا کر اس کی جزئیت میں جائیں تو وہاں سے لال بیگ ہی نکل رہے ہوں گے۔پس یہ بزرگان جب عقل کی مذمت کرتے ہیں تو اس عقل سے مراد عقلِ علمی نہیں ہے چونکہ خود عاقل ہیں۔عقل نے اقبالؒ کو اقبالؒ بنایا ہے۔

معصومین علیہم السلام کا خودخواہی سے مبرا ہونا

اس مقام پر مقامِ فاطمہ سلام اللہ علیہا وعلی علیہ السلام کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔یہ اس لئے خدا کو نہیں چاہتے کہ خدا نے انہیں کچھ دیا ہے،ان کے لئے جنت بنائی ہے،نعمتیں دی ہیں بلکہ اس لئے خدا کی عبادت اور حمد و شکر کرتے کہ خدا قابل عبادت وقابلِ ستائش ہے۔خدا مخلوق کی ربوبیت کر رہا ہے۔

معصومؑ خودخواہی سے بھی معصوم ہوتا ہے۔سب سے بڑی پلیدی یہی خودخواہی ہے۔ہم نے حوزہ میں طلباء وطالبات کو یہ ہوم ورک (Assignment) دیا تھا کہ اپنی ذات کے اندر خودخواہی ڈھونڈیں اور اپنی خودخواہانہ عادتوں، باتوں، اقدامات، صفات اور علامتوں کا چارٹ (Chart) بنائیں۔جب آنکھوں سے پردہ ہٹے گا تو پھر اپنی خودخواہی نظر آنی شروع ہوجائے گی۔پھر دیکھیں کہ یہ عزیزان کہاں پہنچتے ہیں؟اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ انہیں تلاش کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ہر انسان کے اندر یہ خودخواہی موجود ہے جو باتوں،عبادتوں اور دعاؤں میں نکل آتی ہے۔

اب توجہ فرمائیں کہ وہ جو اس خودخواہی سے مبرا ومعصوم اور پاک ہیں کہ جن کے بارے میں

خدا نے فرمایا:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ٥......[1]

اللہ کا ارادہ بس یہی ہے ہر طرح کی ناپاکی کو اے اہل بیت! آپ سے دور رکھے اور آپ کو ایسے پاکیزہ رکھے جیسے پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔

یہ اس صفت پر تعریفِ خدا کرتے ہیں جو شانِ خدا ہے۔ چنانچہ حضرتِ زہراء سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى مَا أَنْعَمَ،

حمد ہے اس خدا کی جس نے نعمتیں عطا کی ہیں۔

کس کو عطا کی ہیں؟ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کسے عطا کی ہیں؟ بلکہ حمد ہے اس کی جس نے نعمت خلق کی ہے۔ یعنی پاک و قابلِ تعریف ہے وہ خدا جس نے یہ کائنات بنائی ہے، جس نے یہ منظومہ شمسی بنایا ہے، جس نے یہ کہکشاں بنائی ہے، جس نے ان کرات کے اندر جاذبہ بنایا ہے، جس نے ان کے اندر حیات خلق کی ہے، جس نے اس حیات کے اندر انسان بنایا ہے، جس نے انسان کو عقل و شعور دیا ہے اور جس نے انسان کو یہ سب کچھ عطا کیا ہے۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ وہ خدا جس نے مجھے یہ سب کچھ دیا ہے مجھے اچھا لگتا ہے۔

فرمانِ علی علیہ السلام اور ہمارا کردار

امیر المومنین علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں کہ خدایا میں پناہ مانگتا ہوں اس وقت اور اس حالت سے کہ جو مجھے دے اس کی مدح و ثناء کرنے لگوں اور جو نہ دے اس کی برائی و مذمت کرنے میں مبتلا ہو جاؤں۔

أُبْتَلٰى بِحَمْدِ مَنْ أَعْطَانِيْ، وَ أُفْتَتَنَ بِذَمِّ مَنْ مَنَعَنِيْ......[2]

یعنی میرے دو ہی کام ہوں کہ کچھ لوگوں کی تعریف کر رہا ہوں اور کچھ لوگوں کی مذمت چونکہ معیار یہ

---

[1]......(سورۃ الاحزاب، آیہ ۳۳)

[2]......(نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۲)

نہیں ہے کہ جو مجھے کچھ دیتا ہے وہ اچھا ہے اور جو مجھے کچھ بھی نہیں دیتا وہ اچھا نہیں ہے۔ لیکن اس وقت ہمارا معیار یہی ہے اور یہ خودخواہانہ معیار ہے۔ ممکن ہے کہ ایک انسان مجھے کچھ بھی نہ دیتا ہو لیکن وہ بہت ہی عالی انسان ہو اور ممکن ہے کہ ایک آدمی مجھے بہت کچھ دیتا ہو لیکن اس سطح کا عالی انسان نہ ہو۔

شیعہ کا دشوار ترین انتخاب اور ذمہ داری

کائنات میں سب سے دشوار ترین کام شیعوں نے کیا ہے کہ علی علیہ السلام جیسا آگاہ و بابصیرت امامؑ چن لیا ہے۔ اگر کسی معمولی کو چن لیتے تو اس کے پیچھے چلنا آسان ہوتا لیکن جو ہر چیز سے آشنا ہے، جو ہر باریکی سے آشنا ہے، جو آلودگیوں سے پاک، منزہ و مبرہ ہے تو اب خودخواہ بن کر اس کے ساتھ نہیں چلا جا سکتا۔ اگر آپ چل نہیں سکتے تو تیز رو کو اپنا ہمسفر نہ بنائیں بلکہ کندرو کو بنائیں ورنہ دونوں کیلئے مشکل ہو جائے گی۔ آپ کوئی ایسا ساتھی ڈھونڈیں جو آپ کی طرح دھیما چلتا ہو۔ خود کو دیکھ کر اپنے لئے ساتھی چنیں لہٰذا امام علی علیہ السلام کو اپنا راہنما ماننے پر شیعہ پر سنگین ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ خود کو امام علی علیہ السلام کی ہم رکابی کے قابل بنائے۔

جو مجھے دے اس کی تعریف کرنا اور جو مجھے نہ دے اس کی مذمت کرنا کوتاہ بینی، تنگ نظری و تنگ دلی ہے۔ یہ ضیقِ صدر ہے کہ انسان کو وہ نعمتیں تو نظر آئیں جو اسے دی ہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ نعمتیں جو خدا نے کائنات میں پیدا کی ہیں وہ نظر نہ آئیں۔ اگرچہ میرے اختیار میں نہیں ہیں لیکن ہیں تو اللہ کی نعمتیں۔ جب میں بیماری سے شفا پاتا ہوں تو کہتا ہوں: شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے شفا دی۔ لیکن کیا وہ اللہ صرف مجھے ہی شفا دیتا ہے؟ وہ تو ہر روز کروڑوں لوگوں کو شفا دیتا ہے۔ اللہ جس کسی کو بھی کچھ عطا کرے اسی کی بابت خدا کا شکر ادا کریں مثلاً الحمدللہ! کہ بہت سارے لوگ صحت مند ہیں، الحمدللہ! کہ بہت سارے لوگ عزت مند ہیں، الحمدللہ! کہ بہت سارے لوگ صاحبِ عظمت ہیں، الحمدللہ! کہ بہت سارے لوگ آسودہ اور سکھی ہیں۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا اور دوسروں کیلئے دعا

یہ روایت سیرتِ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا میں کئی طرح سے منقول ہے اور امام مجتبیٰ علیہ السلام بھی اس روایت کے راوی ہیں کہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا جب رات کو نمازِ تہجد میں قنوت میں دعا مانگتیں تو لوگوں کے نام لے لے کے، ان کے مسائل گن گن کر دعا فرماتیں۔ ایک مرتبہ جب خود علیل تھیں تو اس شب بھی نماز پڑھی اور ہم سن رہے تھے تو توقع یہ تھی کہ آج اپنی صحت کے لئے بھی دعا مانگیں گی۔ اس وقت بھی فاطمہ سلام اللہ علیہا نے اللہ سے سب کچھ مانگا لیکن اپنے لئے کچھ بھی نہیں مانگا۔

ہمارے اور بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کے شکر میں فرق

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا اپنے خطبہ کا دوسرا جملہ یہ ارشاد فرماتی ہیں:

وَلَهُ الشُّكْرُ عَلٰى مَاأَلْهَمَ،

اور شکر ہے اس کا جو کچھ اس نے الہام کیا ہے۔

روزمرہ ہماری زبان سے عادتاً یہ جملات نکلتے ہیں کہ شکر ہے اللہ نے بہت کچھ دیا ہوا ہے، شکر ہے اللہ نے گاڑی بھی دے دی ہے، شکر ہے اللہ نے ڈرائیور بھی دے دیا، شکر ہے اللہ نے پٹرول بھی دے دیا، شکر ہے اللہ نے سی این جی بھی دے دی ہے، یہ ہمارے شکر کی نعمتیں ہیں جو ہم خدا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ عموماً ہم غلے، چنے و چاول پہ اللہ کا زیادہ شکر بجالاتے ہیں اور وہ بھی تب کہ جب غلہ کھا لیتے ہیں تو پھر کہتے ہیں شکر ہے خدا کا لیکن جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا شکرِ خدا کی ابتداء کہاں سے کرتی ہیں؟

وَلَهُ الشُّكْرُ عَلٰى مَاأَلْهَمَ،

یہ نہیں فرمایا کہ جو مجھے الہام کیا بلکہ خدا کا شکر کہ جو کچھ خدا نے الہام کیا۔

یہ تعریف آپ تمام شاگردانِ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ڈھونڈیں۔ ابن ابی الحدید کے بقول جب معرفت و بندگی کا مقام آتا ہے تو وہاں فقط علی علیہ السلام ہی نظر آتے ہیں۔ اگر علی علیہ السلام کے قریب کوئی شخصیت نظر آتی

ہے تو وہ فقط ہمسرِ علی علیہ السلام جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نظر آتی ہیں۔اسی شکر سے لگتا ہے کہ علی علیہ السلام کی ہمسری کے لائق ہیں۔اس مقام پر شکر اور الہام کی وضاحت ضروری ہے۔

شکر سے مراد

جو نعمت خداوند تبارک وتعالیٰ نے عطا کی ہے اس کو ظاہر کرنے کا نام شکر ہے۔اس کے مقابلے میں قرآن مجید میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ کفر ہے۔کفر یعنی چھپا دینا، جو نعمت ملی ہے اس کو پنہاں کر دینا۔اظہارِ نعمت سے مراد یہ نہیں ہے کہ لوگوں کے سامنے آ کر کہے کہ میرے پاس یہ نعمت ہے مثلاً اللہ نے جو پیسے دیئے ہیں وہ ساری اماؤنٹ منبر پر لے آئے اور سب کے سامنے گن کر بتائے کہ میرے پاس اتنی زیادہ رقم ہے یا عموماً کچھ لوگ اس طرح اظہارِ علم کرتے ہیں کہ میں سب سے بڑا علامہ ہوں، میں سب سے بڑا افہامہ ہوں، میں سب سے بڑا حجۃ الاسلام ہوں، میں سب سے بڑا آیۃ اللہ ہوں، اصلاً تاریخ میں پہلا اور آخری آیۃ اللہ ہوں اس کے بعد کوئی ایسا پیدا نہیں ہوگا۔

ہمارے استاد بزرگوار فرماتے ہیں کہ میں کتابوں کی دکان پہ گیا اور وہاں ایک کتاب اٹھائی تو دیکھا اس کے مقدمہ میں ہی مولف نے لکھا ہوا تھا: ایسی کتاب تاریخ میں نہ کسی نے لکھی ہے اور نہ ہی موجود ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے اوپر لکھ دیا: قیامت تک کوئی لکھے گا بھی نہیں، چونکہ اتنا نادان کوئی پیدا نہیں ہوگا۔اسے اظہارِ علم نہیں کہتے کہ انسان اپنے لئے بڑے بڑے القاب اختیار کرلے اور بقلم خود مرجعِ عالم بن جائے۔علم کا اظہار یہ ہے کہ علم سکھاؤ، علم پھیلاؤ اور علم کے مطابق عمل کرو۔یعنی جہاں علم کے اظہار کی ضرورت ہے وہاں علم پیش کرو کہ یہ شکرِ علم ہے۔

خدا کی ہر نعمت کا اظہار شکر ہے۔لیکن زبانی اظہارِ شکر اور عملی اظہارِ شکر میں فرق ہے۔شکرِ لسانی یہ ہے کہ زبان سے کہہ دیا جائے کہ پروردگار تیرا شکر ہے۔یہ نعمت کا اظہار ہے لیکن اس نعمت کو کام میں لانا شکرِ عملی ہے۔جن لوگوں کو اللہ نے نعمت دی ہے اور وہ چھپاتے ہیں مثلاً جن لوگوں کو خدا نے جوانی دی ہے اور انہوں نے

شکر سے مراد

اس جوانی کو محفوظ رکھا ہوا ہے تو یہ کفرانِ نعمت ہے، کیونکہ اس جوانی کو کام میں نہیں لا رہے ہیں۔ جن کو اللہ نے ذہانت دی ہے اور انہوں نے یہ ذہانت سنبھال کے رکھی ہوئی ہے یہ کفرانِ نعمت ہے۔

شکرِ نعمت یہ ہے کہ اللہ نے جو بھی صلاحیت دی ہے اسے استعمال میں لائیں۔ اسی خطبے کے اندر موجود ہے کہ خداوندِ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تدریجاً، دھیرے دھیرے نعمت دیتا ہوں۔ پہلے ایک نعمت دیتا ہوں اور اگر بندہ اس پر شکر کرے تو مزید نعمت دیتا ہوں۔ شکر باعثِ افزودگیِ نعمت ہے۔

الہام کیا چیز ہے؟

اردو میں یہ لفظ زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ لوگ کہتے بھی ہیں کہ فلاں پیر صاحب کو بہت الہام ہوتا ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ ہم اس وقت ایسے لوگوں کے اسیر ہیں جن کو بہت الہامات ہوتے ہیں۔ عموماً نشئیوں کو بہت زیادہ الہامات ہوتے ہیں۔ جب وہ نشے کے عالم میں غرق ہوجاتے ہیں تو اس کے بعد الہامات کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ ایسے بہت سارے قصے سننے میں بھی آتے ہیں کہ مجھے الہام ہوا کہ فلاں کام کرو۔ پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ الہام ہے کیا چیز؟ الہام قرآنی لفظ ہے۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں اسے بہت ہی خوبصورت پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے سورۂ شمس میں نفس کی قسم کھا کر یہ نکتہ بیان کیا:

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا O......[1]

پھر اس نفس کو اس کی بدکاری اور اس سے بچنے کی سمجھ دی۔

نفس کو خدا نے پیدا کیا، اسے مستوی بنایا، معتدل کیا اور اسے فجور و تقویٰ الہام کردیا۔

الہام عربی لغت میں کسی چیز کو چبائے بغیر نگل لینے کو کہتے ہیں۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو چبائی نہیں جاتیں جبکہ بعض چیزوں کو انسان چبا کے کھاتا ہے۔ اَلْهَمَ یا لَهَمَ یعنی کسی چیز کو توڑے بغیر ٹکڑے کئے

---

[1]......(سورۃ الشمس، آیہ ۸)

بغیر لقمہ بنائے بغیر نگل لینا۔ یہ لغت کا معنیٰ ہے ابھی قرآنی واصطلاحی معنیٰ بیان نہیں کیا۔

عموماً کچھ جانور ایسے ہوتے ہیں جو کھانے کو نگلتے ہیں مثلاً بھینس پہلے صرف نگلتی ہے پھر فرصت میں بیٹھ کر جگالی کرتی ہے۔اس کے دو معدے ہیں: ایک عارضی (Temporary) معدہ ہے اور ایک اصلی۔ پہلے چبائے بغیر نگلتی رہتی ہے چونکہ اس کو زیادہ کھانا ہوتا ہے اور ٹائم کم ہوتا ہے۔لہٰذا اگر وہ چبا چبا کے کھائے تو اس کا پیٹ نہیں بھرتا اس لئے نگلتی رہتی ہے پھر بعد میں اسے معدے سے نکال کے دوبارہ چبا کے کسی اور معدے میں ڈال دیتی ہے۔اگر آپ غور کریں تو بھینس کے اندر سے دو تو لیے نکلتے ہیں اور وہ اسی مقصد کے لئے ہوتے ہیں۔ایک سے ذخیرہ (Storage) کا کام لیا جاتا ہے جبکہ دوسرے سے ہاضمے کا کام ہوتا ہے۔

اب ہم بھینسوں کے ساتھ رہ رہ کر بھینسوں والا عمل شروع نہ کر دیں کہ دعوتوں میں کھانا نگلنا شروع کر دیں چونکہ آپ اسے دوبارہ نکال کے نہیں چبا سکتے۔لیکن بعض اوقات انسان کچھ نرم چیزیں جو چبانے کی نہیں ہوتیں انہیں منہ میں ڈال کر نگل لیتا ہے۔ کظیم نگلی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح قرآن مجید میں دیگر معنیٰ میں استعمال ہوئی ہے البتہ اسی لغوی معنیٰ کے تناظر میں۔

الہام اور تعلیم میں فرق

خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے دو راستے مقرر کیے ہیں:

۱۔ تعلیم

۲۔ الہام

الہام تعلیم کے مقابلے میں ہے۔ تعلیم یعنی ایک لقمہ لقمہ سمجھنا، پڑھنا، سیکھنا، لکھنا، کتاب سے پڑھنا، استاد سے پڑھنا، کلاس میں جانا، کسی سے پوچھنا، آگاہ ہونے کے دوسرے ذرائع سے استفادہ کرنا یا مختلف راستوں کے ذریعے کسی شئی سے آگاہ ہونا۔جس طرح ہم سب نے ابتداء میں کچھ گھروں میں سیکھا ہے کہ یہ بھی ایک نوع تعلیم ہے۔ماں باپ کو دیکھ کر جو کچھ سیکھا وہ بھی تعلیم ہے اور استاد سے جو کچھ پڑھا وہ بھی تعلیم

ہے، کتابوں سے پڑھنا بھی تعلیم ہے اور کسی سے کسی بھی ذریعے سے سیکھنا تعلیم کے زمرے میں آتا ہے۔

الہام تعلیم سے ہٹ کر ہے۔ اساتیدِ بزرگوار کے بقول تعلیم سے اجتہاد و فقاہت تک پہنچنا ایسے ہے جیسے انسان سوئی سے کنواں کھود رہا ہو اور پانی تک جا پہنچے۔ طلاب درحقیقت سوئی سے زمین کھود کر چشمہ نکال رہے ہوتے ہیں۔ تعلیم کیلئے اتنی زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ اب شاید کسی میں یہ حوصلہ نہ ہو کہ کنواں کھودے لہٰذا کہتے ہیں کہ بورنگ والے کو بلاؤ۔ جو ایک ہی دن میں بور کر کے پانی نکال دے اور موٹر لگا کر چلا جائے۔ یہ بورنگ وہی ڈگریاں ہیں کہ کوئی ایسا اسکول بتاؤ کہ ادھر سے بچہ ڈالیں اور اُدھر سے ڈاکٹر بن کے نکل آئے۔ بالکل مرغی کی طرح کہ ادھر سے انڈہ ڈالو اور ادھر سے برائلر چوزہ باہر آ جائے۔ پاکستان میں ابھی چوزہ تعلیمی سسٹم رائج ہے۔ ماں اڑھائی سال کے بچہ کو جسے ابھی ماں کی آغوش میں رکھنا چاہئے اسکول میں ڈال دیتی ہے۔ چند سال کے بعد وہ چوزہ دانشور بن کے نکل آتا ہے۔ پھر ڈگری ہونے کے باوجود اسے بھرتی ہونے کے لئے سفارش کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں چلتا اور اگر یہ بھرتی ہو بھی جائے تو اسے کوئی کام کرنا نہیں آتا۔

ایک صاحب دل کے مریض ہو گئے۔ ان کا بیٹا ہارٹ سپیشلسٹ تھا۔ جب ان کو ہارٹ اٹیک ہوا تو ہوش کے آخری لمحات میں انہوں نے یہ وصیت کی کہ مجھے میرے بیٹے کے پاس لے کر نہ جانا بلکہ کسی اور ڈاکٹر کے پاس لے جانا۔ لوگوں نے کہا کہ اس کے پاس کیوں نہ لے کر جائیں، وہ تو آپ کا زیادہ ہمدرد ہے، بیٹے سے زیادہ آپ کا اور کون خیال رکھے گا۔ اب انہوں نے اعتراف کیا کہ میں نے پیسے دے کر اس کو پاس کروایا تھا، مجھے معلوم ہے کہ یہ اس قابل نہیں ہے۔ یہ تعلیم ہے۔ تعلیم یعنی ایک ایک لقمہ، ایک ایک ٹکڑا، ایک ایک حصہ، آہستہ آہستہ، تدریجاً، دھیرے دھیرے، استاد، کتاب اور کلاس کے ذریعے سیکھنا اور اسے اپنے اندر اتارنا۔ الہام بھی آگہی و ہدایت ہے لیکن ان ذریعوں یعنی تعلیم کے ذریعے نہیں بلکہ خداوند تبارک وتعالیٰ کسی کے دل میں ایک بات ڈال دیتا ہے جسے الہام کہتے ہیں۔ الہام وحی کی ایک قسم ہے لیکن الہام کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

علم کیلئے تطہیر قلب کی ضرورت

پس خداوند تعالیٰ بعض اوقات تعلیم کے اسباب مہیا کر دیتا ہے تو انسان از طریقِ تعلیم آگاہ ہوتا ہے اور بعض اوقات الہام کے ذریعے آگاہ ہوتا ہے۔ خود تعلیم کے لئے بھی آمادگی کی ضرورت ہے کیونکہ تعلیم بھی ایسا کام نہیں ہے کہ جو بیٹھے بیٹھے انسان کو حاصل ہو جائے۔ اس کے لئے بھی انسان کو جتن کرنے پڑتے ہیں، کوشش کرنی پڑتی ہے اور اپنے آپ کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ فیلسوف و مفکر شہید شیخِ اشراقؒ اپنی کتاب میں طلابِ علوم کے لئے وصیت لکھتے ہیں کہ یہی علم جو تم کتابوں اور استادوں کے ذریعے حاصل کرتے ہو اس علم کے لئے بھی تطہیر اور تزکیہ کی ضرورت ہے۔ یہ بھی بغیر تزکیہ کے حاصل نہیں ہوسکتا چونکہ علم نور ہے اور خدا نور کو نورانی ظرف کے اندر عطا کرتا ہے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام کا فرمان ہے:

اَلْعِلْمُ نُوْرٌ یَقْذِفُهُ اللّٰهُ فِیْ قَلْبِ مَنْ یَشَاءُ......[1]

علم نور ہے اور خدا جس قلب کے اندر چاہے یہ نور ڈال دیتا ہے۔

یعنی جس کا دل اس نور کے لئے تیار ہو جائے خدا نورِ علم اس میں ڈال دیتا ہے اور جو دل تیار نہ ہو تو اسے خدا معلومات عطا کر دیتا ہے۔

علم اور معلومات میں فرق

معلومات اور علم میں بہت فرق ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بہت سارے لوگ معلومات اور ڈگریاں رکھتے ہیں لیکن ان کے پاس نورانیت و ہدایت نہیں ہے۔ بلکہ ان کے عمل گفتار، کردار، تالیفات اور سیرت کے اندر گمراہی موجود ہے۔ با اینکہ مذہبی، قرآنی اور مختلف علوم کی معلومات ہیں لیکن ساتھ ظلمت بھی ہے۔ اس کی

---

[1]......(مصباح الشریعة المنسوب للصادقؑ، صفحه١٦)(مستدرك سفينة البحار-العلامة آية الله الشيخ علی النمازی، الجزء٨، صفحه٣٠٥)

وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر نور و علم نہیں گیا بلکہ صرف معلومات منتقل ہوئی ہیں۔ وہی معلومات جو ایک کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک (Hard Disk) میں منتقل ہوجاتی ہیں اور ایک فارمیٹ (Format) سے باہر بھی نکل جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ معلومات انسان کے مغز میں بھی آجاتی ہیں۔ جس طرح بہت ساری معلومات کمپیوٹر کو دے دی جائیں تو بھی اس میں نورانیت نہیں آتی اسی طرح انسان بھی اگر معلومات کا ذخیرہ بن جائے تو اس کے اندر نور نہیں آتا۔ نور اس وقت آتا ہے جب وہ اپنے نفس کو مہذب کرے، پاک کرے، تزکیہ کرے اور اس سے بھی بالاتر مراتب طے کرے۔

جس طرح سے ہم کھانوں میں اکتفاء نہیں کرتے بلکہ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہمیں اعلیٰ سے اعلیٰ کھانا ملے۔ اسی طرح انسان کے روح کی غذا علم وہدایت ہے اور اس کے درجات و مراتب ہیں۔ علم میں سب سے کم مرتبہ علمِ کتابی و علمِ درسی ہے۔ اس علم سے انسان خود کو اس سطح پہ لے کر آتا ہے جہاں سے خدا اسے علمِ الہامی عطا کرتا ہے۔ الہام وحی کے ساتھ مختص نہیں ہے کہ اسے کوئی فرشتہ لے کر آئے بلکہ الہام کے کئی طریقے ہیں۔

انسان میں آگہی کی اقسام

خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کے اندر دو طرح کی آگہی رکھی ہے۔ ان میں سے ایک کا نام غریضی آگہی وہدایت ہے جو حیوانات کے اندر بھی ہے۔ جس طرح آج کل ٹیکنالوجی نے بہت ساری ڈیوائسز اور پروڈکٹس بنائی ہوئی ہیں کہ جن کو بناتے ہی ان کے اندر چپ (Chip) رکھ دیتے ہیں جس میں پورا دستور یا فارمولا موجود ہوتا ہے۔ مثلاً جب آپ کمپیوٹر آن کرتے ہیں تو جو فائلیں اس کو لوڈ کرنی ہوتی ہیں وہ خود لوڈ کر لیتا ہے جبکہ ابھی آپ اسے کوئی کمانڈ (Command) نہیں دیتے۔ آن ہونے کے بعد وہ آپ کو سگنل دیتا ہے کہ لوڈ ہو چکا ہے پھر آپ اسے ایک ایک کمانڈ دیتے ہیں اور پھر وہ آپ کے مطابق کام کرنا شروع کرتا ہے۔ اس سے پہلے اس کے اندر موجود پروسیسر (Processor) وہ سارا کام خود کر رہا ہوتا ہے۔ یہ غریضہ کی مثال ہے۔ یا جب آپ اپنا موبائل سیٹ آن کرتے ہیں تو آن ہوتے ہی اس کے اندر موجود ڈیٹا جو

کمپنی نے رکھا ہوتا ہے وہ پہلے ہی مرحلے میں آٹومیٹکلی لوڈ (Automatically load) ہوجاتا ہے۔ بعد میں آپ اس میں اپنے نمبرز ڈالتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں۔ جو آپ اس کے اندر ڈال رہے ہیں یہ غریضہ نہیں ہے بلکہ جو کمپنی نے اس کے اندر رکھ دیا ہے وہ غریضہ ہے۔

خداوند تبارک وتعالیٰ نے بھی مخلوق کو خلق کر کے اس کے وجود میں ایک آگہی رکھ دی ہے جسے غریضہ کہتے ہیں۔ غریضہ جانوروں کے اندر بھی موجود ہوتا ہے۔ سب غریضے کے تحت اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انسان میں بھی جو کچھ غریضے کے طور پر اللہ نے ڈال دیا یہ تعلیم نہیں بلکہ ایک نوعِ الہام ہے۔ جو رجحانات و تمایلات خدا نے آپ کے اندر رکھ دیئے ہیں وہ سارے الہام ہیں چونکہ یہ سب تعلیم کا نتیجہ نہیں ہیں۔

اسی طرح الہام کے ذریعے انسان کو بہت سارے علوم وآگاہیاں بھی نصیب ہوجاتی ہیں۔ قرآن مجید کے بقول اللہ نے تقویٰ بھی الہام کیا اور فسق وفجور۔ یعنی تعلیم نہیں دی بلکہ تمہاری خلقت کے بعد یہ دو رجحان اللہ نے تمہارے اندر رکھ دیئے اور پھر فرمایا:

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰهَا ۝ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰهَا ۝......[1]

بتحقیق جس نے اسے پاک رکھا کامیاب ہوا اور جس نے اسے آلودہ کیا نامراد ہوا۔

ان دونوں رجحانات میں سے اگر تم نے فطرت کے رجحان کو، تقویٰ کو پروان چڑھالیا، نفس کی پرورش کی تو تم کامیاب ہو اور اگر اسے مار دیا، فسق وفجور تلے دفن کر دیا تو تم ہلاک ہو۔ پس ہمارا کام ان الہام شدہ چیزوں کو پروان چڑھانا ہے۔ بعض نے فسق وفجور کو پروان چڑھالیا ہے اور بعض نے تقویٰ کو۔

......کامیابی کا معیار

قرآن مجید میں ''افلح'' کامیاب انسانوں کو کہا جاتا ہے یا دوسرے لفظوں میں انسانی کامیابی کا نام فلاح ہے۔ ویلفیئر کا نام فلاح نہیں ہے۔ جو لوگ مقصود تک پہنچ گئے اور جنہیں مقصد حاصل ہو گیا وہ کامیاب

---

[1]......(سورۃ الشمس، آیہ ۱۰-۹)

کامیابی کا معیار

کہلاتے ہیں، نہ کہ وہ جنہیں فائدے بہت زیادہ مل گئے ہیں۔ہم نے کامیابی کا معیار فائدوں کا حصول رکھا ہوا ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ بڑا ہی کامیاب سفر رہا۔ کیوں؟ کیونکہ فائدہ بہت ہوا۔ فائدہ تو بہت ملا لیکن مقصد بھی ملا یا نہیں؟ ممکن ہے ہمیں فائدے بہت زیادہ ملے ہوں لیکن مقصد نہ ملا ہو۔ جسے مقصد حاصل نہ ہو تو ایسا انسان ناکام انسان ہے۔

الہامی علوم کے حصول کی شرائط

پس الہام کا ایک مصداق غریضی رجحانات ہیں جو پیدائشی طور پر ہر انسان کے اندر موجود ہوتے ہیں اور ہمیں الگ سے سیکھنے نہیں پڑتے۔ انسان کا دونوں طرف رجحان ہوتا ہے۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ کس رجحان کو پروان چڑھاتا ہے۔ علوم بھی اسی طرح سے انسان کو عطا ہوتے ہیں۔ الہامی علوم ہر ایک کو عطا نہیں ہوتے بلکہ جو لوگ اپنے خیال کو پاک رکھتے ہیں خداوند تبارک وتعالیٰ انہیں الہام کرتا ہے۔

انسان کے لئے لباس اور بدن کی طہارت سے زیادہ ضروری خیال کی پاکیزگی ہے۔ اگر خیال ناپاک ہو تو گھر، کپڑوں اور بدن کی پاکیزگی کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ سب کو ہی پتا ہے کہ ہمارے خیالات پاک ہیں یا نہیں۔ خواب خیال کو دیکھنے کا ایک پیمانہ ہے۔ ناپاک خیالات انسان کو ناپاک خواب دکھاتے ہیں اور پاک خیالات پاک خواب دکھاتے ہیں۔ پس اپنے خیال، ذہنیت اور دل کو پاک رکھیں۔

الہام کا اثر

آج انقلابِ اسلامی کے بعد جن لوگوں نے انقلاب سیکھا وہ امام خمینیؒ سے سیکھا لیکن امام خمینیؒ نے کسی سے انقلاب نہیں سیکھا چونکہ امام خمینیؒ کے استادوں میں بظاہر کوئی انقلابی استاد نہیں تھا۔ بہت سارے بزرگان ایسے گزرے ہیں جن کے استادوں میں ان جیسا کوئی بھی نہیں تھا مثلاً شہید صدرؒ کے استادوں میں سے ان جیسا کوئی نہیں تھا۔ پھر یہ کیسے بن گئے؟ اگر استاد بھی ویسا ہی ہو اور شاگرد بھی تو پھر یہ تعلیم ہے کیونکہ تعلیم سے ہی

یہ انسان بنا ہے لیکن اگر استاد کے پاس وہ متاع نہ ہو اور شاگرد کے پاس آجائے تو معلوم ہوا کہ خدا نے تعلیم کے ساتھ ساتھ اسے الہام بھی کیا ہے۔

الہام کی منفی قسم

البتہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے دونوں چیزوں کیلئے لفظِ الہام استعمال کیا ہے:

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ○......[1]

بعض لوگ برائی وفساد کسی سے سیکھتے ہیں مثلاً چوری ودھوکا دہی کی تعلیم کسی برے دوست یا برے ماحول سے حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے مجرم ہوتے ہیں کہ جنہیں استاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے ایسے چور پائے جاتے ہیں کہ جن کے استاد بھی اتنی بڑی چوری نہیں کر سکتے۔ ایسے جھوٹے وکذاب موجود ہیں جن کے استاد بھی اتنا جھوٹ نہیں بول سکتے لہٰذا انہیں جھوٹ الہام ہوا ہے یعنی یکجا ان کے دل کے اندر برائی آ گئی ہے، کیونکہ دل اس کو قبول کرنے کے لئے آمادہ تھے۔

الہام کیلئے آمادگی کی ضرورت

الہامی چیز وہاں آتی ہے جس کا دل آمادہ ہو، جس کے اندر تیاری ہو، جو قبول کرنے کے لئے تیار ہو۔ اگر انسان خود کو ہدایت کے لئے تیار کر لے تو خدا اسے ہدایت الہام کر دیتا ہے۔ چہ بسا بعض کو سالہا سال لگ جاتے ہیں اور بعض: "راہ صد سالہ یک شبہ می روند"، یعنی سو سال کا راستہ ایک شب میں طے کر لیتے ہیں۔ ایسے نمونے موجود ہیں مثلاً شیخ اشراقؒ کہ جو بہت ہی عظیم فیلسوف ہیں۔ ملاصدراؒ فرماتے ہیں کہ شیخ اشراقؒ کی کتاب میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ ملاصدراؒ غیر معصوم لوگوں میں سے ہیں لیکن ہم یہ کہہ

---

[1]......(سورۃ الشمس، آیہ ۸)

الہام کیلئے آمادگی کی ضرورت

سکتے ہیں کہ ملاصدراؒ اوجِ تفکرِ بشر ہیں۔آپ کا ذہن جہاں پہنچا ہے وہ تمام بشریت کی کاوشوں کا اوج ہے۔ابھی تک ملاصدراؒ کی حد سے آگے کوئی نہیں بڑھا ہے۔یہ ملاصدراؒ، شیخ اشراق شہاب الدینؒ کی کتاب کیلئے اتنا عظیم جملہ ارشاد فرمارہے ہیں۔شیخ اشراقؒ کو تیس سال کی عمر میں شہید کردیا گیا تھا۔حاسد علمائے دین نے حکمران کے پاس جا کر ان کی غیبت کی اور چغلی کھائی کہ یہ شیخ مرتد ہوگیا ہے، یہ دین سے باہر چلا گیا ہے، یہ ایسی ایسی باتیں کرتا ہے۔حکمران کا ذہن بھر کے اسے اتنا اکسایا کہ وہی حاکم جس نے شیخ اشراقؒ کو بہت زیادہ نوازا ہوا تھا اسی نے شیخ اشراقؒ کو پھانسی دلوادی۔صلاح الدین ایوبی جو صلیبی جنگوں کی معروف شخصیت تھی اس کے ہاتھوں شیخ اشراقؒ کو پھانسی دلوائی گئی۔یہ کام ان حاسد علماء نے کروایا جوان کے ہم مذہب وہم مسلک تھے۔اس لئے کہ ان علماء کی عمریں ستر ستر، اسی اسی سال ہوگئی تھیں اور شیخ تیس سال کا جوان لڑکا تھا لیکن شیخ جو بات کرتا تھا وہ بڑی ہی پکی اور پختہ ہوتی تھی۔بڑے بڑے علماء اس کے سامنے چھوٹے نظر آتے تھے۔ہمارے استاد آج بھی فرماتے ہیں کہ اس شیخ نے پچیس سال کی عمر میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ ہمیں پچھتر سال میں بھی سمجھ نہیں آرہی ہیں۔شیخ خود فرماتے ہیں کہ حکمتِ اشراقؒ خدا نے مجھے ایک رات میں الہام کی ہے۔یعنی شیخ اشراقؒ کو ایک رات میں فلسفہ تعلیم ہوا لیکن ہ خود فرماتے ہیں کہ اسے لکھنے میں، اس کی کتابت میں مجھے پانچ سال لگ گئے۔اس طرح کے بہت سارے نمونے موجود ہیں کہ جہاں خداوندتبارک وتعالیٰ نے الہام کیا ہے۔الہام فقط ان جادو، منتر والوں کے لئے نہیں ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں الہام ہوا ہے۔بعض دھوکا باز دکاندار آئے دن اپنے الہامات بتاتے ہیں۔

علمِ الہامی یہ بھی نہیں ہے کہ جیسے بعض افراد رات کواوٹ پٹانگ خواب دیکھتے ہیں اور پھر انہیں الہامات سمجھتے ہیں۔اکثر ہوتا ہے کہ انسان رات کو زیادہ کھانا کھالیتا ہے تو معدے کی تبخیر سے بخارات مغز پر چڑھ جاتے ہیں۔نتیجتاً وہ الٹے سیدھے خواب دیکھتا ہے اور پھر صبح اٹھ کر تعبیر پوچھنے آجاتا ہے۔میں اکثر ان کو یہ تعبیر بتاتا ہوں کہ کم کھایا کریں اور کھانے کے فوراً بعد نہ سویا کریں بلکہ تھوڑا سا وقفہ بھی کیا کریں تاکہ ایسے الہامات آپ کو نہ ہوں۔

جس طرح خداوندتبارک وتعالیٰ نے انسانوں کیلئے اسبابِ تعلیم مہیا کئے ہیں اسی طرح الہامات کے

اسباب بھی مہیا کئے ہیں۔لیکن ہم نفسانی خواہشات اور ہویٰ وہوس کے اندر اتنے غرق ہیں کہ علومِ کتابی سے محروم ہیں چہ جائیکہ الہامات تک پہنچیں۔الہامات کے لئے ذرا زیادہ پاکیزگی اور بالاتر تقویٰ کی ضرورت ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ......ا۔

اور اللہ سے ڈرو اور وہ تمہیں تعلیمات سے آراستہ فرماتا ہے......

یعنی تقویٰ اختیار کرو گے تو خدا تمہیں علم وآگہی عطا کرے گا۔

پس بہت سارے حقائق و ہدایات جو تعلیم کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں اگر انسان ان سے اپنے وجود کو تیار کرلے تو پھر خدا الہام کرتا ہے۔خداوند تبارک وتعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دین الہام کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو دین تعلیم کیا:

وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ......۲۔

اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے......

چونکہ امت الہام کے قابل نہیں تھی۔خداوند تبارک وتعالیٰ نے خاندانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عظیم ترین الہام کیا جس میں حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا سب سے مقدم ہیں لیکن جب شکر کا مقام آیا تو یہ نہیں کہا کہ خدا کا شکر کہ اس نے فاطمہ سلام اللہ علیہا و الہام کیا بلکہ فرمایا کہ کائنات میں جس کو بھی خدا نے الہام کیا اس پر فاطمہؑ خدا کا شکر بجالاتی ہے۔یعنی اے خدایا تو نے ،انسانوں،جنوں،انبیاء علیہم السلام اور امتوں پر جو الہام کیا اور جو قیامت تک آنے والے لوگوں پر کرے گا اس پر فاطمہؑ تیری شکر گزار ہے۔یہ حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے قلبِ نورانی پر خداوند تبارک وتعالیٰ کے الہامات ہیں جنہیں آپؑ نے اس خطبہ میں ظاہر فرمایا ہے۔

ا۔......(سورۃ البقرہ، آیہ ۲۸۲)

۲۔......(سورۃ البقرہ، آیہ ۱۵۱)

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو عالمین میں چننے کی وجہ

خداوند تبارک وتعالیٰ نے نساءِ عالمین میں سے چار برگزیدہ ہستیوں جنابِ سیدہ نساء العالمین فاطمہ، جنابِ خدیجہ، جنابِ مریم اور جنابِ آسیہ علیہن السلام کو چنا جنہیں ایک روایت میں ارکانِ نظامِ ہستی کہا گیا ہے۔ دیگر روایات کے مطابق جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو سیدۃ النساء العالمین کہا گیا ہے مثلاً

اِبْنَتِیْ فَاطِمَۃُ فَاِنَّھَا سَیِّدَۃُ نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ مِنَ الْاَوَّلِیْنَ وَ الْاٰخِرِیْنَ ......[1]

میری بیٹی فاطمہؑ یقیناً تمام عالمین کی عورتوں کی سردار ہے چاہے وہ عورتیں اولین میں سے ہوں یا آخرین میں سے......

یَا فَاطِمَۃُ، اَلَا تَرْضَیْنَ اَنْ تَکُوْنِیْ سَیِّدَۃَ نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ وَ سَیِّدَۃَ نِسَاءِ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ وَ سَیِّدَۃَ نِسَاءِ الْمُؤْمِنِیْنَ؟......[2]

اے فاطمہؑ! کیا آپ اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ میں آپ کو عالمین کی عورتوں کی سردار، امت کی عورتوں کی سردار اور مومنین کی عورتوں کی سردار بناؤں؟

زیارتِ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا میں آیا ہے:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکِ یَا سَیِّدَۃَ نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ مِنَ الْاَوَّلِیْنَ وَ الْاٰخِرِیْنَ ...... [3]

سلام ہو آپ پر اے تمام عالمین کی عورتوں کی سردار، چاہے وہ عورتیں اولین میں سے ہوں یا

---

[1]......(بحار الأنوار-الشيخ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء۲۸، صفحه۳۸، والجزء۴۳، صفحه۱۷۲) (إرشاد القلوب- الحسن بن أبی الحسن محمد الدّيلمیؒ، من أعلام القرن الثّامن) (مستدرك سفينة البحار- الشيخ علي النمازي، بحواله: أمالي الصدوقؒ) (ميزان الحكمة- الريشهری، الجزء۵، صفحه۲۵۱) (فضائل - ابي الفضل سديد الدين القمیؒ) (تفسير نور الثقلين) (روضة الواعظين -الفتال النيسابوری، الشهيد فی سنة ۵۰۸ھ)

[2]......(المستدرك علی الصحيحين -أبو عبدالله الحاكم، المتوفی: ۴۰۵ھ، الجزء۳، صفحه۱۷۰)

[3]......(من لا يحضره الفقيه-الشيخ الجليل الاقدم الصدوق أبی جعفر محمد بن علی بن الحسين بن بابويه القمیؒ، المتوفی: سنة ۳۸۱ھ)

آخرین میں سے......

تو کیا خدا نے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو اس لئے چنا تھا کہ وہ رسولؐ کی بیٹی تھیں؟ اس لحاظ سے تو دوسرے بھی اپنا حق مانگیں گے چونکہ دوسروں کی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رشتے داری تھی۔ بنو عباس نے اس رشتہ داری سے کتنا فائدہ اٹھانا چاہا چونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ اولادِ علی علیہ السلام و فاطمہ سلام اللہ علیہا رشتے کی وجہ سے اتنے عزیز تھے۔ لہٰذا وہ یہ کہتے کہ ان کا رشتہ بیٹی کی وجہ سے ہے اور ہمارا رشتہ چچا کی طرف سے ہے۔ سادات کا سلسلہ بیٹی کی طرف سے چلا اور ہمارا سلسلہ رسولؐ کے چچا کی طرف سے۔

خدا کے یہاں رشتہ داری اہم نہیں ہوتی۔ یہ ہمارے اپنے بنائے ہوئے معیارات ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ جس کو بھی رسولؐ سے کوئی نسبت ہو جائے تو وہ اس مقام پہ فائز ہو جاتا ہے یا خدا اس کو چن لیتا ہے۔ بنو عباس برگزیدگان خدا نہیں ہیں اگر چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نسبت ہے۔ نوح علیہ السلام کا بیٹا برگزیدہِ خدا نہیں ہے اگر چہ وہ نوح علیہ السلام کا بیٹا ہے۔ یوں تو نہیں ہے کہ جو ہمارے معیارات ہیں وہی خدا کے معیارات ہیں یعنی خدا نے بھی قبیلہ پرستی اور اقرباء پروری کی بنیاد پر یہ سارے مقامات تقسیم کئے ہیں۔ ہم عموماً حقِ اہلبیت علیہم السلام اس طرح سے ثابت کرتے ہیں۔ البتہ امیر المومنین علیہ السلام نے بھی ایک جگہ یہ استدلال پیش کیا لیکن یہ مقامِ مہاجہ و مجادلہ تھا۔ جب سقیفہ میں میٹنگ ختم ہوئی اور لوگوں نے امیر المومنین علیہ السلام کے پاس آ کر ماجرا بیان کیا تو امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ ان سارے دلائل سے تو میں ہی خلیفہ بنتا ہوں یعنی جو دلائل انہوں نے دیئے ہیں وہ سارے دلائل میرے ہی حق میں تمام ہوتے ہیں ان کے حق میں نہیں۔ لیکن خود امیر المومنین علیہ السلام نے کبھی اس سے استدلال نہیں کیا کہ چونکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رشتہ دار ہوں لہٰذا بس میں ہی سب کچھ ہوں۔

خدا کسی کو رشتہ داری کی وجہ سے نہیں چنتا ورنہ تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سارے رشتے دار خلیفہ ہونے چاہئیں۔ پھر تو بنو عباس صحیح کہتے ہیں کہ چونکہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتے دار ہیں لہٰذا خلافت ہمارا حق ہے۔ خلافت ان کا حق نہیں ہے چونکہ خدا جب خلیفہ بناتا ہے تو کسی معیار پر بناتا ہے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو خداوند تبارک و تعالیٰ نے مقامِ عظمیٰ عطا کیا تو صرف بیٹی کا رشتہ ہونے کی وجہ سے عطا نہیں کیا بلکہ اس جوہر کی بنیاد پر کیا جو فاطمہ سلام اللہ علیہا کے اندر موجود تھا۔ کئی اہم خصوصیات کے ساتھ

ساتھ جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا میں یہ جوہر موجود تھا کہ عام مخلوق تو اپنی حاصل کردہ نعمت پر بھی شکرِ خدا نہیں بجالاتی لیکن فاطمہ سلام اللہ علیہا تمام نظامِ ہستی کی نعمتوں پر خدا کی حمد کررہی ہے اور تمام عالم کو خدا نے جو الہام کیا اس پر خدا کا شکر ادا کررہی ہے۔ اس عظیم ہستی کا نام فاطمہ سلام اللہ علیہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط اس لئے اٹھ کر کھڑے نہیں ہوجاتے تھے کہ میری بیٹی ہے اور ہر باپ اپنی بیٹی کے لئے اٹھ کے کھڑا ہوجائے بلکہ اس گوہر کے اندر وہ حکمتِ خدا متجلی تھی جسے فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیکھ رہے تھے۔ وہ تجلی اس خطبے کے اندر نمایاں ہے۔ لیکن امت نے اس عظیم نورِ خدا کو نہیں پہچانا۔

اس خطبہ شریفہ میں جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے وہ حقائق بیان کیے ہیں جو خداوند تبارک وتعالیٰ نے آپؑ کو تعلیم والہام فرمائے تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی کے ذریعے دین مبین کی تفسیر وتبیین کا جو مرحلہ طے کیا اب وہی مرحلہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا بیان فرمارہی ہیں۔

کلامِ سیدہ سلام اللہ علیہا میں ثنائے پروردگار

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے خطبہ کا تیسرا جملہ ثنائے پروردگار پر مشتمل ہے:

وَالثَّنَاءُ بِمَا قَدَّمَ،

اور ثناء ہے خدا کی اس پر کہ جو کچھ خدا نے پیش کیا ہے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے تین جملوں کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں حمد وتعریف پیش کی ہے۔ لفظِ حمد کے ساتھ، کلمۂ شکر کے ساتھ اور لفظِ ثناء کے ساتھ۔ نعمتوں پر حمدِ خدا کی ہے، الہامات پر شکرِ خدا بجالائی ہیں اور جو نعمتیں خدا نے پیش کی ہیں ان پر ثناء بجالائی ہیں۔

ثناء سے مراد

خطبہ کے اس حصہ میں فراواں طالبعلمانہ بحثیں ہیں جو علمائے کرام نے عالمانہ حد تک بیان کی۔

ہم ان دقائقِ طالبعلمی میں نہیں جاتے کہ حمد وشکر وثناء میں کیا فرق ہے۔ اجمالی طور پر ثناء اس تعریف کو کہتے ہیں جو بار بار تکرار ہو۔ تثنیہ ومثنٰی اسی کے مشتق الفاظ ہیں۔ عربی زبان میں ثناء اس چیز کو کہتے ہیں جو دوہری ہوجائے، جسے پیچ سے موڑ کر دوہرا کر دیا جائے۔ غیر لچک دار چیزیں آسانی سے دوہری نہیں ہوتیں جیسے لوہے کا سریہ۔ اسی طرح سیدھی لکڑی یا سیمنٹ کی بنی ہوئی چیز دوہری نہیں ہوسکتی لیکن کچھ چیزوں کے اندر یہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ انہیں دوہرا کیا جاسکتا ہے جیسے کپڑا۔ دوہرا کرنے یعنی دو کرنے کو عربی زبان میں تثنیہ کہتے ہیں۔ یہ اس کا لغوی معنٰی ہے۔

قرآن مجید میں لفظِ مثانی استعمال ہوا ہے اور اس کا سب سے اہم استعمال سورۂ مبارکہ فاتحہ سے متعلق ہے جسے روایت کے مطابق سبعِ مثانی کہا گیا ہے۔ مثانی یعنی وہ سورہ جس کو نزول کے وقت دہرایا گیا ہے، دو دفعہ نازل ہوا ہے۔ اس کی سات آیتیں تکرار کی گئی ہیں۔ برخلاف دیگر سورتوں کے کہ ہر سورہ ایک ہی دفعہ نازل ہوا ہے۔ اسی لئے یہ سورہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی۔

قدم سے مراد

قدم سے مراد

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا ثنائے پروردگار بیان کرتے ہوئے فرما رہی ہیں:

وَالثَّنَاءُ بِمَا قَدَّمَ،

"قَدَّمَ"، یعنی تقدیم کرنا، پیش کرنا۔ جس طرح آپ دعائے توسل میں معصومین علیہم السلام سے توسل کرتے ہیں اور بارگاہِ خدا میں ان پاکیزہ وبرگزیدہ ہستیوں کو وسیلے کے طور پر پیش کر کے کہتے ہیں:

وَقَدَّمْنَاکَ بَیْنَ یَدَیْ حَاجَاتِنَا یَا وَجِیْهًا عِنْدَ اللّٰهِ اِشْفَعْ لَنَا عِنْدَ اللّٰهِ...... [1]

اور ہم نے آپ ہی کو اپنی تمام حاجتوں کے پیش پیش رکھا ہے، اے اللہ کے نزدیک مقبول، آپ اللہ سے ہماری شفاعت فرمائیے......

---

[1]...... (بحار الانوار - علامہ مجلسیؒ، دعائے توسل، الجزء ۹۹، صفحہ ۲۴۷)

یعنی میں آپ کو خدا کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔کیس میرا ہے،مشکل میری ہے لیکن میں اس قابل نہیں ہوں کہ خدا کے سامنے منہ اٹھا سکوں اور سر بلند کر سکوں کیونکہ میں روسیاہ ، بدعمل اور بے آبرو ہوں۔آپ برگزیدگانِ خدا اور ''وجیہہ عنداللہ'' ہیں۔ جو خدا کے نزدیک مؤجہ یعنی قبول شدہ اور بہت ہی عزیز و پیارے ہیں۔وجیہہ کا سادہ ترجمہ مقبول وقابلِ قبول ہے۔

روایات میں وارد ہوا ہے کہ جو عالمِ دین اس لئے علم حاصل کرے کہ وجیہہ ومؤجہ عند الناس بن جائے تو یہ علم اس عالم کو جہنم لے جائے گا۔

سب سے بُرا علم وہ ہے جس کے ذریعے آدمی لوگوں کے اندر اپنی مقبولیت پیدا کرنا چاہتا ہو۔

قدام یاتقدیم یعنی کوئی چیز سامنے لاکر پیش کرنا۔

وَالثَّنَاءُ بِمَا قَدَّمَ،

جو کچھ خدا نے بشر و کائنات کیلئے پیش کیا ہے اس پر خدا کی تعریفِ مکرر اور نہ ختم ہونے والی تعریف ہے۔

فصاحتِ کلامِ فاطمہ سلام اللہ علیہا

یہ فصاحتِ کلامِ فاطمیؑ ہے کہ تین مختلف الفاظ کے ساتھ ایک مطلب کو ادا کیا ہے۔اردو جیسی محدود زبان ان فصیح مطالب کو اسی انداز سے منتقل کرنے سے عاجز ہے۔یعنی ہم حمد،شکر اور ثناء کا دقیقاً وہی معنیٰ کریں کہ جو قرآنی اصطلاح یا کلامِ فاطمہ سلام اللہ علیہا میں مدِ نظر ہے تو یہ ممکن نہیں ہے۔لہٰذا اس کی تفسیر کی ضرورت ہوتی ہے چونکہ ایسے الفاظ جو ترادف کا فریضہ ادا کریں دوسری زبانوں میں نہیں ہیں۔فارسی زبان اردو سے قدرے فصیح تر ہے لیکن پھر بھی عربی کے ہم پلہ نہیں ہے۔معارف ،علوم اور مطالب کو بیان کرنے کی جتنی وسعت وگنجائش عربی زبان میں ہے اتنی کسی دوسری زبان میں نہیں ہے۔

حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا نے اس خطبہ شریفہ کا آغاز حمدِ خدا سے کیا ہے یعنی بارگاہِ الٰہی میں اپنی معرفت،

بندگی، عبودیت اور مقامِ الٰہی سے قرب کا اظہار لفظوں کے قالب میں بیان فرما رہی ہیں۔ یہ کوئی تکلفاتی خطبہ نہیں ہے کہ جو آج کل رائج ہیں اور ہمارے سننے میں آتے ہیں۔ بعض ایسے پیشہ ور خطیب ہیں کہ جن کا کام ہی خطبے پڑھنا اور تقریریں کرنا ہے۔ اولیائے الٰہی اس مقام سے بالاتر واجل ہیں کہ انہوں نے چند تقریریں رٹ لی ہوں تاکہ مجمع کے سامنے انہیں جابجا تکرار کیا جائے۔ وہ جو کچھ بھی بیان فرماتے ہیں وہ درحقیقت بندگانِ خدا کے سامنے اپنی معرفت کا اظہار کر رہے ہیں۔

مخاطب کی سطحِ ذہنی کا خیال

انبیائے کرام اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے کلامِ نورانی میں یہ عمومی قانون ہے کہ مخاطب کی سطح کو بھی مدِنظر رکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے کس سطح کا مخاطب ہے؟ لیکن بعض اوقات ایسا پیغام جو ابدی ہے اس میں مخاطب کا لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ اس میں مخاطب کو پیغام رسانی کا فقط بہانہ سمجھا جاتا ہے۔ بہت سارے مقامات ایسے بھی ہیں جہاں مخاطبین اس لائق نہیں ہیں لیکن چونکہ ایک ابدی پیغام قیامت تک کے لئے دنیا کو پہنچایا گیا ہے لہٰذا مخاطبین صرف بہانہ ہیں۔

خطبہ غدیر میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاضرین کو صرف بہانہ قرار دیا اور اللہ کا ابدی پیغام لوگوں تک پہنچا۔ اس وقت آپؐ نے یہی کہا کہ سمجھ نہیں آتا تو لکھ لو، حفظ کر لو اور اسے غائبین تک پہنچاؤ کہ شاید تمہاری زبان سے جن تک یہ پیغام پہنچے گا وہ تم سے بہتر سمجھنے والے ہوں گے اور یہ فریضہ راویانِ دین نے ادا کر دیا کہ کلامِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وائمہ علیہم السلام کو نقل کیا ہے۔ خود راوی قطعاً کلامِ معصومؑ کو اتنا نہیں سمجھتے تھے۔ ہمارے بہت سارے علمائے کرام ایسے گزرے ہیں کہ جنہوں نے راویوں پر اعتراض کیا کہ آپ کا کام فقط روایت نقل کرنا تھا لہٰذا اے کاش آپ اس کا معنٰی نہ کرتے۔

جنابِ شیخ مفیدؒ اور جنابِ شیخ صدوقؒ دونوں سرمایہ تشیع ورکنِ تشیع ہیں۔ دونوں بہت ہی ارجمند واعلیٰ شخصیات ہیں لیکن شیخ مفیدؒ فقیہ ہیں اور شیخ صدوقؒ محدث ہیں۔ شیخ صدوقؒ کا کام احادیث اکٹھی کرنا اور ان

کونقل کرنا ہے لیکن بعض جگہ انہوں نے احادیث کا تجزیہ بھی کیا، معانی بھی کیے اوران کی تفسیر بھی کی۔ بعض جگہ جہاں جنابِ شیخ صدوقؒ نے احادیث سے کچھ سمجھنے کی کوشش کی یا کچھ سمجھا تو چونکہ آپ شیخ مفیدؒ کی استادی کا درجہ رکھتے اوران پر مقدم ہیں لہٰذا شیخ مفیدؒ پورے آداب کے ساتھ شیخ صدوقؒ سے عرض کرتے ہیں کہ اے کاش آپ ان روایات کا معنٰی نہ کرتے ،تفسیر نہ کرتے اور فقط نقل کر کے گزر جاتے ، جو ایک محدث کا فریضہ ہے۔ یہ فریضہ انجام دے کے آپ گزر جاتے اوران لوگوں پر چھوڑ دیتے کہ جوان کے معانی کو سمجھتے ہیں تو کہیں بہتر ہوتا۔ راویان حدیث نے بڑی عظیم خدمت انجام دی ہے۔ یہ ذخیرہ علمی، یہ خطباتِ عظیم جن راویوں اور حافظوں نے نقل کیے ہیں یہ بہت عظیم کارنامہ انجام دیا ہے کہ ان خطبات کو نقل کر کے تاریخ میں قیامت تک کے لئے محفوظ بنا دیا۔ خداوند تبارک وتعالیٰ انہیں اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ پس بعض اوقات مخاطبین کا خیال رکھا جاتا ہے اور بعض اوقات مخاطبین کو فقط بہانہ سمجھا جاتا ہے۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا یہ پورا خطبہ ہی فقط حاضرین کے لئے نہیں تھا بلکہ قیامت تک آنے والی بشریت کیلئے تھا۔

خطبہ سیدہ سلام اللہ علیہا کی صناعت

خطبہ کے آغاز ہی میں جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا حمد، شکر وثنائے پروردگار سے معرفتِ توحید کی بنیاد ڈال رہی ہیں۔ یہ درحقیقت ایک صناعت وفن کی طرف اشارہ ہے جسے طلابِ علم اور مدرسہ کی اصطلاح میں برأت و استھلال کہا جاتا ہے۔ یعنی شروع سے ہی ایسے مقدمات وتمہید باندھنا، ایسی باتیں کرنا کہ بعد میں جو کچھ کہنا ہے اس کے لئے میدان ہموار ہو جائے اور ذہنیتیں تیار ہو جائیں۔ مثلاً ابن ابی الحدید نے اپنی کتاب کے آغاز میں خطبہ لکھا تو اس خطبہ سے ہی پتا چل رہا ہے کہ بعد میں کیا کہنے والے ہیں۔ خطبہ کا آغاز یہاں سے کیا:

أَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ...... قَدَّمَ الْمَفْضُوْلَ عَلَی الْأَفْضَلِ...... [1]

یعنی حمد ہے اس خدا کی جس نے کمتر کو بالاتر پر ترجیح دی ہے۔ یہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کر رہے ہیں

---

[1]...... (شرح نهج البلاغة - ابن ابي الحديد۔ المقدمة الكتاب)

کہ جس کا مقام بہت بالا تھا اس پر اسے ترجیح دی جس کا مقام اتنا زیادہ نہیں تھا۔ اب اسی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ بعد میں کیا ثابت کرنے والے ہیں۔

عام لوگ بھی گفتگو کا آغاز اسی طرح کرتے ہیں۔ فرض کریں آپ سے کوئی قرض مانگنے آیا ہے تو وہ آ کر تمہید باندھتا ہے۔ جونہی وہ بات شروع کرتا ہے تو اگلا سمجھ جاتا ہے کہ آخر میں قرض مانگے گا۔ اگرچہ اس کے لئے ایک گھنٹہ گفتگو کرے لیکن گھنٹے کے آخر میں جو بات ہوگی وہ قرض کی ہوگی۔ اسی طرح جو آدمی چندہ مانگنے آتا ہے تو وہ آتے ہی کسی موضوع پر گفتگو شروع کرتا ہے اور آغاز میں ہی اس کے منہ سے ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں کہ جن سے پتا چلتا ہے کہ آخر میں انتہاء چندے پر ہی ہوگی۔ میڈیا میں بھی اگر غور کریں کہ ایک آدمی کیا کہنے والا ہے تو اس کے ابتدائی کلمات سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ آخر میں کیا کہے گا۔ اس کو کلامی صناعت کہتے ہیں۔ یہ گفتگو کا ایک فن ہے کہ جو بات آپ نے بعد میں کہنی ہے اس کی تمہید ابھی سے باندھ دیں۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے اس خطبے کے آغاز میں حمد وثنائے پروردگار میں ہی اپنے اصل مدعا کی تمہید باندھ دی اور بتا دیا کہ جو میں کہنے والی ہوں، جو میں بیان کر رہی ہوں اسے آپ کس نظریے سے سنیں۔

خواستہ وناخواستہ ظلم

کیونکہ لوگ اس خطبہ کو مختلف نظریوں سے پڑھتے ہیں۔ بسا اوقات ناخواستہ ظلم بھی ہوتا ہے یعنی ہم کسی پر ظلم نہیں کرنا چاہتے لیکن ہوجاتا ہے۔ آشنائی نہ ہونے کی وجہ سے بھی ناخواستہ ظلم ہوجاتا ہے مثلاً مجھ سے کہا جائے کہ آپ فلاں کا تعارف کروادیں۔ اگر میں ان کو نہیں جانتا لیکن اپنی طرف سے بہت ہی اچھا تعارف کروادوں تو یہ نادانی کی وجہ سے شاید ان کے اوپر ظلم ہو۔ ہم ناخواستہ طور پر بعض اوقات یہ کام کرجاتے ہیں۔ خود اہلِ منبر سے جذباتی خطابت میں بعض اوقات منہ سے ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں۔

ابھی تک ہمارے ذہن میں حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کے بارے میں منبروں سے سن سن کے ایک تصور بیٹھا ہوا ہے۔ خصوصاً اس خطبے کے حوالے سے کہ جب بی بی سلام اللہ علیہا نے مسجد میں تشریف لا کر خطبہ سنایا اور

انہیں فدک نہیں لوٹایا گیا تو بعد میں بی بی سلام اللہ علیہا نے یہ وصیت کی کہ فلاں فلاں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے، یہ میری عیادت کو نہ آئیں، میں ان سے نہیں بولوں گی، یہ میرے تشیع جنازہ میں نہ آئیں، میرے دفن میں نہ آئیں اورحتیٰ کہ میری قبر پر بھی نہ آئیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ بی بی سلام اللہ علیہا ان سے ناراض، آزردہ اور خفا تھیں۔

خواستہ و ناخواستہ ظلم

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایسی ہی ناراضگی تھی جیسی ہم لوگ روزمرہ خفگی کا مظاہرہ اپنے گھروں اور محلّوں میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ کبھی خواتین کسی خاتون سے ناراض ہوجاتی ہیں، کبھی مرد کسی سے ناراض ہوجاتے ہیں، کبھی خاندانوں کے اندر لوگ ایک دوسرے سے ناراض رہتے ہیں۔ جب کوئی کسی دوسرے کے ساتھ کوئی ظلم کرتا ہے تو اس کے دل کے اندر ایک نفرت ، دشمنی و کینہ بھر جاتا ہے اور اس کینے کا اظہار خفگی کے ان طریقوں سے کیا جاتا ہے کہ میں نے اس کا منہ نہیں دیکھنا، اس کے گھر نہیں جانا، اس کی کسی شادی میں نہیں جانا، کسی غم میں نہیں جانا، کسی جنازے میں نہیں جانا اور نہ ہی وہ ادھر آئے۔ خصوصاً قریبی رشتے داروں کے اندر یہ زیادہ ہوتا ہے کہ جب ان کی طرف سے ظلم و زیادتی ہو تو اس قسم کے احساسات انسان کے دل میں پیدا ہونا شروع ہوجاتے ہیں کہ ہم ہرگز ان کے ہاں نہیں جائیں گے اور پھر نہیں جاتے۔ اس لئے کہ ان کی طرف سے انہیں کوئی دکھ و تکلیف پہنچی ہے، کوئی ظلم و ناانصافی ہوئی ہے اور اس دکھ، تکلیف و رنج کے نتیجے میں ان کے دلوں میں دشمنی، کینہ و نفرت پیدا ہوگئی ہے جس کا اظہار وہ اس احتجاج سے کرتے ہیں۔ بائیکاٹ کر کے بتاتے ہیں کہ ہمارے دل میں ان کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

عام طور پر منبروں سے بعض اوقات جو تاثر پیش کیا جاتا ہے وہ یہی تھا کہ معاذ اللہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے دل میں بعض افراد کیلئے ذاتی و شخصی کینہ بھر گیا تھا اور وہ بھی اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے بی بی سلام اللہ علیہا کا مال غصب کرلیا تھا اور اس کینے کا اظہار کرنے کے لئے بی بیؑ نے خطبہ دیا، وصیت فرمائی اور پھر اقدامات بھی کئے۔ اگر کسی نے یہ احساس و تاثر لیا ہے کہ بی بیؑ کے دل میں ایک کینہ تھا تو یہ جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی ذات پر ناخواستہ و نادانستہ ظلم ہے۔ ہم ایمان رکھتے ہیں کہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا مقامِ عالی عصمت پر فائز ہیں، آپ عصمتِ کبریٰ، مادرِ عصمت و منبعِ عصمت ہیں۔ ہم اس عقیدہ عصمت کو آخر تک محفوظ رکھیں۔

اعتقادی بنیادوں کو محفوظ رکھیں

یہ بہت ہی اہم ہے کہ انسان اپنی اعتقادی بنیادوں کو آخر تک محفوظ رکھے۔اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے عقیدوں کو فراموش کر دیتے ہیں اور ان کے خلاف رائے دیتے ہیں مثلاً توحید ہمارا عقیدہ ہے لیکن ہم ایک سیکنڈ کے لئے توحیدی ہوتے ہیں پھر اس کے بعد جو بات کرتے ہیں، جو چیز سوچتے ہیں اور جو اقدام اٹھاتے ہیں وہ غیر توحیدی ہوتا ہے۔اسی طرح امامت ہمارا عقیدہ ہے لیکن اقدام امامت کے مطابق نہیں کرتے۔ابھی تمام امامیہ، شیعہ، اثنا عشریہ، پیروانِ امامت انتخابات کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک لحظہ کے لئے نہیں سوچتے کہ عقیدہِ امامت ہم سے کیا تقاضا رکھتا ہے؟ ہم جو کام کرنے والے ہیں اس کے بارے میں امامت ہم سے کیا تقاضا کرتی ہے؟ ہمارا عقیدہ کیا ہے؟ یہ عقیدہ ذہن میں کس دن کے لئے رکھا ہوا ہے؟ آیا یہ عقیدہ زندگی گزارنے کے لئے تھا یا فقط قیامت میں کام آئے گا؟!

امامت کا عقیدہ آغازِ زندگی اور اس دنیا کے لئے ہے۔جب بھی قومی و ملی فیصلے کریں تو امامت کے عقیدے کو مدنظر رکھیں۔یوں نہ ہو کہ ہم سے بیچ میں امامت کا عقیدہ نظرانداز ہو جائے۔ہماری سوچ میں امامت موجود ہو، گفتار میں امامت موجود ہو، فیصلوں میں امامت موجود ہو، حرکتوں میں امامت موجود ہو، اقدامات میں امامت موجود اور اس کی جھلک ہماری زندگی میں نظر آئے۔ہندو بھی الیکشن کی تیاری کر رہا ہے، مسلم بھی الیکشن کی تیاری کر رہا ہے، غیر مسلم بھی الیکشن کی تیاری کر رہا ہے، سیکولر بھی الیکشن کی تیاری کر رہا ہے، شیعہ بھی الیکشن کی تیاری کر رہا ہے۔تو پھر آپ میں اور دوسروں میں فرق کیا ہوا؟ امامت کس دن کام آئے گی؟ امامت کس درد کی دوا ہے؟

لوگوں کا انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے فرائض مقرر کرنا

اللہ تعالیٰ نے انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے فرائض مقرر کیے ہیں اور کچھ فرائض ہم نے مقرر کر رکھے ہیں۔ جس طرح خدا نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا کہ اے موسیٰؑ آپ کا فریضہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو نجات دیں لیکن

جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا اے موسیٰؑ! اللہ کی باتیں چھوڑو بلکہ ہماری باتیں سنو کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ کہنے لگے: اللہ نے جو یہ کہا ہے کہ جہاد کرو، اپنی زمینِ مقدس آزاد کراؤ، ستم گاروں کے خلاف جنگ ومبارزہ کرو یہ سخت کام ہیں لہٰذا اللہ سے کہو یہ کام ہم سے نہیں ہو سکتے۔ اگر اللہ کو ان کاموں کا بہت ہی شوق ہے تو خود اللہ اور موسیٰؑ جنگ کریں۔

فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَآ إِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ...... ۱؎

آپ اور آپ کا پروردگار جا کر جنگ کریں ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے لئے من وسلویٰ لے کر آؤ، پکا پکایا کھانا لاؤ۔ روشنی کی باتیں چھوڑ وراشن کی باتیں کرو۔ گیس نہیں ہے، لوڈ شیڈنگ ہے، بجلی بھی نہیں ہوتی اور ہماری عورتوں کے پاس پکانے کے لئے ٹائم بھی نہیں ہے لہٰذا پکے پکائے کھانے کا انتظام کرو۔ اب من وسلویٰ آ گیا لیکن کھا کھا کے اکتا گئے تو پھر موسیٰؑ نے کہا کہ اب تو عبادت کی بات کرو، اللہ کی بات کرو، دین کی بات کرو۔ کہا ان باتوں کو چھوڑو، یہ پکا پکایا ہمارے منہ پڑ گیا ہے لہٰذا اب ہمارے لئے کچے راشن کا انتظام کرو۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا...... ۲؎

اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے کہا تھا: اے موسیٰؑ! ہم ایک ہی قسم کے طعام پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے پس آپ اپنے رب سے کہہ دیجئے کہ ہمارے لئے زمین سے اُگنے والی چیزیں فراہم کرے جیسے ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز......

اب منڈی کا انتظام کرو تا کہ ہم اپنا ٹیسٹ خود بنائیں، یہاں تو ایک ہی ذائقہ صبح شام چل رہا ہے، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا، اب یہ بے مزہ ہو گیا ہے، ہم اپنا ٹیسٹ بدلیں گے۔ ہمارے لئے

۱؎...... (سورۃ المائدۃ، آیہ ۲۴)

۲؎...... (سورۃ البقرہ، آیہ ۶۱)

منڈی کی چیزیں لے کر آؤ۔ خدا نے موسیٰؑ کی کیا ڈیوٹی لگائی تھی اور امت نے انہیں کس کام پہ لگا دیا؟ امت نے کیا ذمہ داری عائد کر دی؟

اسی طرح اللہ نے امامؑ بھیجے کہ آپ کا فریضہ یہ ہے کہ اس امت کو گمراہی سے نکالیں، انہیں طاغوت کے سائے سے نکال کر اللہ کے سائے میں لے آئیں۔ لیکن ہم نے کیا کیا؟ پیروکاروں نے امامؑ کو ملاقات کا وعدہ دیا کہ امامؑ سے ہماری پہلی ملاقات ہی قبر میں ہوگی۔ مرنے سے پہلے آپؑ کی ضرورت نہیں ہے، مرنے سے پہلے مذہبی سیاسی پارٹیاں ہیں، مرنے سے پہلے پہلے جمہوریت ہے، مرنے سے پہلے انتخابات ہیں۔ آپؑ ہمارا انتظار کریں اور جب ہم مر جائیں تو قبر میں آ جائیں اور وہاں بھی کس لئے آئیں؟ ہمیں چھڑانے کے لئے چونکہ یہاں جو الیکشن لڑیں گے اس میں تو ہم پھنس جائیں گے کیونکہ جس کو ووٹ دیں گے اسی کے ساتھ محشور ہوں گے۔ یہ اللہ کا قانون ہے کہ جسے ووٹ دیں گے اسی کے ساتھ اٹھائے جائیں گے:

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ......[1]

قیامت کے دن ہم ہر گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے......

ہم ہر ایک کو اس کے کینیڈیٹ کے ساتھ اٹھائیں گے، جس کے پیچھے چلنے والے تھے اسی کے ساتھ اٹھائیں گے۔ اس دن ہمیں مشکل پیش آئے گی لہٰذا مولاؑ آپ قبر میں آ کر فقط منکر و نکیر کو بھگا دیجئے گا۔ اس سے فقط یہ کہنا کہ یہ ہمارا ہے لہٰذا اس سے سوال جواب نہیں کرنے۔ بس آپؑ کا کام وہاں ختم ہو جائے گا۔

جیسے کوئی سمگلر پھنس جاتا ہے تو وہ کسی بڑی شخصیت سے کہتا ہے کہ کسٹم میں آ جانا چونکہ وہاں پکڑ دھکڑ ہوتی ہے اور وہاں سے جب آپ مجھے نکلوا دیں گے تو پھر آپ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ بس اس بارڈر کو پار کرنے تک ہمیں آپ کی ضرورت ہے اور اگر بارڈر کراس ہو گیا تو پھر میں جانوں اور میرا کام جانے۔

پہلے اللہ سے پوچھیں کہ اے پروردگار تو نے امام کس لئے بنایا ہے؟ اس سے پہلے کہ تم دنیا میں آؤ امامت تمہاری ضرورت ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد ماں تیری دوسری ضرورت ہے جبکہ امام پہلی ضرورت

---

[1]......(سورۃ الاسراء، آیہ ۷۱)

ہے۔آپ ماں کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں لیکن امام کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔حدیث میں ہے کہ اگر دنیا میں صرف دوانسان رہ جائیں تو یقیناً ان میں سے ایک امام ہوگا۔یہ نہیں ہوسکتا کہ امام پہلے اٹھ جائے اور مخلوق بغیر امام و حجت کے باقی رہے۔امامت ہماری اس زندگی وحیات کی ضرورت ہے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی رنجش ذاتی نہیں

کیا جنابِ زہراء سلام اللہ علیہا کے اس خطبہ اور اقدامات سے یہ لگتا ہے کہ معاذ اللہ بی بیؑ فقط چند افراد کا کینہ دل میں رکھ کر نفرت کا اظہار کررہی ہیں؟ نہیں بلکہ آپؑ اپنے دین کا اظہار کررہی ہیں، وہ چیز بیان کررہی ہیں جو قیامت تک بشر کی ضرورت ہے۔خواہ وہ نہج البلاغہ کے خطبے ہوں یا خطبہ فاطمیہؑ۔آپؑ خطبہ کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے بیان کرکے فرمارہی ہیں کہ جو کچھ میں کہنے والی ہوں یہ کینے کا نتیجہ نہیں ہے۔یہ خطبہ دل کی بھڑاس نکالنے کیلئے بیان نہیں کررہی۔یہ میں اپنی طرف سے نہیں بول رہی بلکہ جو کچھ بیان کررہی ہوں وہ تسلسلِ وحی ہے۔میرے بابا نے تمہیں وحی کا نتیجہ بتایا تھا جبکہ میں تمہیں الہام بتارہی ہوں۔میں یہ سب کچھ حکمِ خدا سے کررہی ہوں۔

جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بی بیؑ کا مقام بیان کیا تو وہ باپ کی بیٹی سے محبت کے باعث نہیں بلکہ خداوند تبارک وتعالیٰ کے حکم سے تھا اسی طرح آج بی بیؑ ان الفاظ کے ذریعے بتارہی ہیں کہ بعد میں جو کچھ تم سننے والے ہو تو یہ نہ سمجھنا کہ میں یہ سب غصے وغضب میں بول رہی ہوں اور اپنے کینہ ونفرت کا اظہار کررہی ہوں۔معصوم کینے سے بھی معصوم ہوتا ہے، معصوم کی نفرت معیار کی نفرت ہوتی ہے۔اسی لئے اللہ فرمادیتا ہے کہ اس کے غضب میں خدا کا غضب ہے۔اگر وہ ذاتی و شخصی کینہ ہوتا تو خدا کبھی بھی فاطمہ سلام اللہ علیہا کے غضب کو اپنا غضب قرار نہ دیتا۔اللہ کا کسی کے ساتھ ذاتی کینہ نہیں ہوتا۔اللہ تو کسی کا دشمن نہیں ہے بلکہ اللہ سب کا خالق ہے۔اللہ ان دشمنوں کا بھی خالق ہے پھر اللہ کیوں کسی پر غضبناک ہوتا ہے؟ جب وہ خدا کی مخالفت کرے۔جب وہ حدِ خدا کو توڑے۔یعنی حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا جب بھی غضب ناک ہوں گی تو یقین جان لو کہ کبھی بھی اپنی ذاتی کینے سے غضبناک نہیں ہوں گی بلکہ اسی بات پر غضب ناک ہوں گی کہ جس بات سے خدا غضبناک ہوتا ہے۔

عقائد، عملی زندگی کی بنیاد

پس ہم عصمت کو اپنا عقیدہ بناتے ہیں لیکن بعد میں چھوڑ دیتے ہیں۔ امامت کو عقیدہ بناتے ہیں لیکن اقدام میں امامت سے دستبردار ہوجاتے ہیں۔ یہ ہمارے زبانی عقیدے ہیں لیکن زندگی کی بنیاد نہیں بنے۔ اگر بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کی عصمت پر عقیدہ ہے تو پھر بی بیؑ کو دنیا پرست اور مالِ دنیا کی محبت کی آلودگی میں مبتلا نہ سمجھیں۔ کیا بی بی سلام اللہ علیہا کے لیے پراپرٹی (Property) کی اہمیت اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ اس سے دستبردار نہیں ہورہی تھیں کہ میرا باغ مجھے ہر قیمت پر ملے۔ اگر آج کوئی شخص یہ کام کرے تو کہتے ہیں کہ بھائی مالِ دنیا ہے اگر چھین لیا گیا ہے تو چھوڑ دو۔ بعض عزت مند چھوڑ بھی دیتے ہیں کہ کیا کریں ہم اس کے لئے اب اپنی خواتین کو عدالتوں میں تو نہیں لے کے جاسکتے۔ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ مالِ دنیا تھا چلا گیا تو کیا ہوا؟ خدا اور دے دے گا۔ لیکن بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا نے جو کچھ کیا وہ مالِ دنیا کی خاطر نہیں تھا بلکہ وہ سب کچھ حکمِ خدا تھا اور اللہ کی حدود کی پاسبانی ہورہی تھی۔

بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کا خطبہ معرفت و ادب سے سرشار

بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کے خطاب میں معرفت اور ادب ملاحظہ فرمائیں۔ میں عمداً طالبعلمانہ گفتگو سے گریز کررہا ہوں لیکن بعض اوقات بات ناگزیر ہوجاتی ہے۔ جب انسان معرفت و بندگی کا اظہار کرتا ہے تو اس اظہار میں ادب ضروری ہے۔ حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا بارگاہِ خداوند تبارک وتعالیٰ میں سراپا ادب ہیں۔

بعض علماء نے ادب کے موضوع پر کتاب لکھی ہے از جملہ علامہ طباطبائیؒ نے جو تفسیرِ شریف المیزان میں موجود ہے۔ علامہ طباطبائیؒ ہمارے اساتید کے استاد تھے۔ المیزان بیس جلدوں پر مشتمل تفسیر ہے جو اس وقت تک شیعہ سنی علماء کے متفقہ قول کے مطابق تاریخِ اسلام کی بہترین تفسیر ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ادبِ معلّی کے متعلق بیان کیا ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو کس طرح مودب بنایا اور وہ کس طرح بارگاہِ خدا میں ادب کے ساتھ حاضر ہوتے تھے۔ مثلاً قرآن میں ایک نمونہ حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے

کہ جنابِ ایوب علیہ السلام بارگاہِ خدا میں کتنے ادب کے ساتھ دعا مانگتے ہیں اور اظہارِ عبودیت کرتے ہیں:

وَ أَيُّوْبَ إِذْ نَادٰى رَبَّهٗ أَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَ أَنْتَ أَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝...... [1]

اور ایوب کو بھی (اپنی رحمت سے نوازا) جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا: مجھے (بیماری سے) تکلیف ہو رہی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔

مجھے مشکل آ پڑی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ خدایا! تو نے مجھے مشکل میں مبتلا کر دیا ہے۔ حتیٰ یہ بھی نہیں کہا کہ مجھ پر رحم فرما بلکہ فرمایا تو بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ یہ ادب ہے۔

ایک روایت میں امیر المومنین علیہ السلام، کمیلؒ سے فرماتے ہیں:

يَا كُمَيْلُ، إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ وَ سَلَّمَ أَدَّبَهُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ، وَ هُوَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَدَّبَنِيْ، وَ أَنَا أُؤَدِّبُ الْمُؤْمِنِيْنَ ......[2]

اے کمیلؒ: خداوند تبارک وتعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مودب بنایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے مودب بنایا اور اب مجھے مومنین کو مودب بنانا ہے۔

دین سراپا ادب کا نام ہے۔ کلِ دین ادب ہے۔ ادب کے بغیر دین دین نہیں بلکہ گمراہی ہے۔ قرآن سراسر ادب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَأْدُبَةُ اللّٰهِ...... [3]

قرآن ادبستانِ خدا ہے۔ قرآن کتابِ ادب وسراپا ادب ہے۔

---

[1]......(سورۃ الانبیاء، آیہ ۸۳)

[2]......(تمام نہج البلاغۃ-السید صادق الموسوی)

[3]......(مستدرك الوسائل ومستنبط المسائل-میرزا حسین النوری الطبرسیؒ، الجزء ۴، صفحہ ۲۳۲) (وسائل الشیعۃ-الشیخ محمد بن الحسن الحر العاملیؒ، المتوفی: سنۃ ۱۱۰۴ ھ، الجزء ۶، صفحہ ۱۶۸) (میزان الحکمۃ-الریشھری، الجزء ۸، صفحہ ۱۹۳)

اسی طرح ادب کو بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کے ان جملات میں مشاہدہ فرمائیں:

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ عَلٰی مَا أَنْعَمَ، وَلَهُ الشُّکْرُ عَلٰی مَا أَلْهَمَ، وَالثَّنَاءُ بِمَا قَدَّمَ۔

دین آموزی میں معرفتِ توحید کا مقام

خطبہ کا یہ پہلا حصہ معرفتِ توحیدی کا اظہار ہے اور لوگوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کروانا ہے جو اساسِ دین ہے۔ جیسے امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں پہلے خطبے میں ہی بیان فرما دیا کہ

أَوَّلُ الدِّيْنِ مَعْرِفَتُهُ...... [1]

دین کی بنیاد و اساس معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے۔ معرفتِ خدا سے دین کا آغاز ہوتا ہے۔ بسا اوقات بعض جوانان پوچھتے بھی ہیں کہ ہم دین شناسی و دین کا مطالعہ کہاں سے شروع کریں؟

دین کے بہت سے ابواب ہیں۔ کچھ کو دین فقہ یعنی وضو و طہارت سے شروع کروایا جاتا ہے جبکہ بعض کو آداب سے۔ البتہ اپنے ملک میں دین کی شناخت کا آغاز رسومات سے ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ہم اپنی اولادوں کو رسوماتِ دین سے آگاہ کرتے ہیں پھر اس کے بعد اگر وقت ہو تو احکامِ دین سے آگاہ کرتے ہیں اور پھر اسی عرصے میں کہیں نہ کہیں سے وہ اڑتے اڑاتے اعتقادات بھی سن لیتے ہیں۔ جبکہ دین آموزی و دین شناسی کا صحیح طریقہ وہی ہے جو ائمہ اطہار علیہم السلام و امیر المومنین علیہ السلام نے بتا دیا ہے۔ یعنی دین کا آغاز شناختِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے اور شناختِ خدا وہی ہے جو خود امیر المومنین علیہ السلام اور جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے کروائی ہے۔

---

[1]...... (نہج البلاغہ، خطبہ ۱)

فصل چہارم:

خطبہ فاطمیہؑ،

اسلام و کائنات شناسی کا درس

خطبہ فاطمیہ سلام اللہ علیہا، اسلام شناسی کا درس ونصاب

یہ خطبہ، خطبہ نہیں بلکہ اسلام شناسی کی کلاس تھی۔ یہ کلاس ان لوگوں کیلئے تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کلاس سے فارغ التحصیل تو ہو چکے تھے، دین تو سیکھ چکے تھے لیکن ابھی انہیں فلسفہ دین ومقصدِ دین سمجھ نہیں آیا تھا۔ جب بی بی زہراء سلام اللہ علیہا نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی ان کی حرکات اور اقدامات سے پتا چلتا ہے کہ دین کی حکمت کو نہیں سمجھ سکے، انہیں دین اور اللہ کی معرفت نہیں ہے، انہوں نے ظاہر تو پڑھ لیا لیکن باطن بھول گئے ہیں اس لئے بی بی سلام اللہ علیہا نے ان کے لئے عالی کلاس کا اہتمام کیا کہ شاید اس سے متوجہ ہو جائیں۔ دراصل کمالات، فصاحت، بلاغت، علمیت وجامعیت کے لحاظ سے یہ خطبہ اسلام شناسی کا مکمل کورس (Course) ہے۔ اگر کوئی انسان یہ خطبہ آغاز سے انتہاء تک تفسیر کے ساتھ پڑھ لے تو ایسا ہے جیسے اس نے اسلام شناسی کا کورس مکمل کر لیا ہے۔ بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا نے جن لوگوں کو اسلام کا یہ نصاب پڑھایا انہوں نے تیئیس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں رہ کر اسلام سیکھا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بی بی سلام اللہ علیہا کو انہیں پھر نئے سرے سے اسلام سکھانا پڑا۔ آپؑ نے توحید سے قیامت اور احکامات تک کی حقیقت کو ایک نئے پہلو وزاویے سے دوبارہ واضح کیا۔

معرفتِ توحید درکلامِ فاطمی سلام اللہ علیہا

معرفت توحید وقربِ خدا میں جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کا بلند مقام اور وسیع احاطہ اس خطبہ سے بخوبی عیاں ہو رہا ہے۔ آپؑ نے حمد وثناء کے تین جملے بیان کرنے کے بعد مزید تین جملے خداوند تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں کے بارے میں اسی فصاحت وبلاغت کے ساتھ ارشاد فرمائے:

مِنْ عُمُوْمِ نِعَمٍ اِبْتَدَأَهَا، وَسُبُوْغِ اٰلَآءٍ أَسْدَاهَا، وَتَمَامِ مِنَنٍ اَوْلَاهَا،

آپ ؑ نعمت، الہام وتقدیم پر حمد، شکر وثناء بجالا رہی ہیں۔ جناب سیدہؑ کا یہ ثناء بجالانا ان عمومی نعمتوں پر ہے جو خدا نے ابتداءً عطا کی ہیں۔

صدیوں پرانے دقیق مسائل کا سادہ وسلیس بیان

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے ان جملات کے تحت بہت سے حقائق ودقائق موجود ہیں جن کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ بہت سے تاریخی مسائل ومطالب جو اہلِ معرفت، اہلِ حکمت واہلِ فلسفہ کے اذہان کے لئے پیچیدہ مسائل سمجھے جاتے تھے، صدیوں سے علماء جن حقائق کو سلجھانے میں مصروف رہے لیکن واضح بیان نہیں کر سکے انہیں بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا نے اس خطبہ شریفہ میں بہت ہی سادہ طریقے سے روانی کے ساتھ واضح وروشن کیا ہے۔ بی بی سلام اللہ علیہا کے خطبہ کی روشنی میں حکماءِ متعالیہ جیسے صدر المتألہینؒ، ان کے شاگردان اور ہمارے اساتیدِ گرامی مرتبت (خداوند تبارک وتعالیٰ انہیں صحت وسلامتی عطا فرمائے) ان دقائق کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔

کائنات اور مقصدِ کائنات

اس جملے کے ضمن میں ایک نکتہ آپ کی خدمت میں مختصر حد تک عرض کیا جاتا ہے۔ انسانوں کے اذہان میں یہ سوال ہمیشہ سے گردش میں ہیں کہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے اس کائنات کو کیوں پیدا کیا؟ انسانوں کو پیدا کرنے کی کیا غرض وغایت اور ضرورت وحاجت تھی؟ انہیں کس مقصد کے تحت خلق کیا؟ چونکہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہر آدمی جو کچھ کرتا ہے اس میں کوئی نہ کوئی مقصد کارفرما ہوتا ہے۔ جب کوئی فاعل ارادے وشعور کے تحت کوئی فعل انجام دے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ نے یہ کام کس مقصد کے لئے انجام دیا ہے؟

ذاتِ خدا خالق ومالکِ کائنات ہے۔ اس رب والہٰ کائنات نے کائنات کے ذرے ذرے کو پیدا کیا ہے۔ کائنات کی وسعتیں اتنی عظیم ہیں کہ انسان ان پر احاطہ نہیں کرسکتا۔ حتیٰ یہ مادی کائنات کتنی وسیع اور

پھیلی ہوئی ہے کہ ابھی تک بشر ذہنی طور پر بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکا۔ جہاں تک بھی بشر کی رسائی ہوتی ہے اس سے آگے کائنات کی حدود بڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ مادی کائنات حقیقی کائنات کا ایک جز، ایک جھلک اور ایک قطرہ ہے۔ ابھی انسان اس مرحلہ تک نہیں پہنچ سکا کہ وہ کائنات کی وسعت کا اندازہ لگا سکے۔

وسعتِ کائنات اور ہماری محدود سوچ

بعض اہلِ معرفت کے مطابق اس سلسلہ میں ہماری مثال اس کیڑے کی سی ہے جو کسی پھل میں بیٹھا زندگی گزار رہا ہو۔ فرض کریں ہزاروں ایکڑ پر محیط ایک باغ میں ہزاروں درخت ہیں، ہر درخت پر سینکڑوں شاخیں اور ہر شاخ پر درجنوں پھل لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک پھل میں ایک کیڑا بیٹھا ہوا ہے۔ اس کیڑے کی ساری کائنات یہی پھل ہے جہاں وہ زندگی گزار رہا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ یہ باغ کتنا وسیع ہے؟ اس میں کتنے درخت اور کتنے پھل ہیں؟ پھر یہ کیڑا کیسے اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس کا باغبان کیسا ہوگا؟

ہماری حالت ایسی ہی ہے کہ ہم خود بہت محدود ہیں۔ ہم سب ایک کائنات میں نہیں رہتے بلکہ ہم میں سے ہر ایک کی الگ کائنات ہے۔ بعض کی ایک حویلی کی کائنات ہے، بعض کی ایک کمرے کی کائنات ہے، کچھ کی ایک بستر کی حد تک کائنات ہے اور بعض ایسے ہیں کہ صرف اپنی ذات اور اپنی انا ان کی پوری کائنات ہے۔ جو حویلی، کمرے، بستر یا اپنی ذات سے باہر نگاہ نہیں کر سکتا اسے کیا معلوم کہ اس کائنات کی وسعت کتنی ہے؟! اور اس سے کیا توقع کہ وہ یہ معلوم کرے کہ اس کائنات کا بنانے والا خالق کتنا عظیم ہے؟! ہماری مثال دقیقاً سیب کے اس کیڑے جیسی ہے جو اتنے عظیم باغ کے ایک پھل میں زندگی گزار کے اسی کو پوری کائنات سمجھتا ہے۔

کنویں کے مینڈک

ایک اور عامیانہ محاورہ کنویں کا مینڈک ہونا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک سمندری مینڈک کسی لہر کے

ذریعے سمندر کے کنارے موجود کنویں میں جا گرا۔ کنویں میں ایک اور مینڈک زندگی گزار رہا تھا۔ کنویں کے مینڈک نے سمندری مینڈک کا استقبال کیا اور پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟ اس نے اپنا تعارف کروایا کہ میں سمندر سے آیا ہوں۔ کنویں کا مینڈک باوجود اس کے کہ اپنے خاندان اور آباؤ اجداد سمیت سمندر کے کنارے رہ رہا تھا لیکن اس کیلئے سمندر ناشناختہ تھا لہٰذا اس نے پوچھا: سمندر کیا ہوتا ہے؟ سمندری مینڈک نے بتایا کہ سمندر پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہوتا ہے۔ کنویں کے مینڈک نے اس کنویں کے اندر ایک چھوٹا سا دائرہ کھینچا اور کہا اتنا بڑا؟ اس نے ہنس کر کہا اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ اس نے تھوڑا اور بڑا دائرہ کھینچ کر کہا: اتنا تو ہوگا؟ اس نے کہا اس بھی زیادہ وسعت ہوتی ہے۔ وہ دائرہ بڑھاتا گیا حتیٰ کہ اس نے اشارے سے پورے کنویں کا دائرہ پیش کر کے کہا کہ اس سے بڑا تو نہیں ہوگا؟ اس نے کہا کہ نہ اس سے بھی بڑا۔ کنویں کے مینڈک نے کہا: اس سے بڑا سمندر ہو ہی نہیں سکتا۔ پانی کی سب سے بڑی مقدار یہی ہے کہ جو میں نے بیان کر دی ہے۔ یہیں سے کنویں کا مینڈک محاورہ بنا۔

کنویں کا مینڈک ان انسانوں کو کہتے ہیں جو اپنی ایک محدود اور چھوٹی سی دنیا بنا لیتے ہیں۔ پھر اسی کے اندر آباد رہتے ہیں اور کوئی اندازہ نہیں لگاتے کہ باہر کچھ اور بھی موجود ہے۔ انہیں کیا خبر کہ یہ کائنات کتنی وسیع و عظیم ہے۔ یہ وسیع کائنات حقیقی کائنات کی ایک جھلک ہے جو غیر جسمانی و غیر مادی ہے۔ جسے قرآن نے عالمِ غیب کہا ہے۔ زمین و آسمان، کہکشائیں، منظومۂ شمسی، کرات، ستارے، سیارے یہ سب عالمِ شہادت کہلاتا ہے۔ عالمِ شہادت، عالمِ غیب کی ایک جھلک ہے۔ عالمِ غیب اوجھل کو نہیں کہتے بلکہ یہ ایک غیر جسمانی عالم ہے جس کی وسعتوں کا اندازہ انسان نہیں لگا سکتا۔ ہم تو ابھی تک کائناتِ مادی کی وسعتوں کا اندازہ نہیں لگا سکے۔

مقصدِ کائنات اور گمشدہ انسان

پس سوال یہ ہے کہ اتنی عظیم، وسیع، پیچیدہ و رنگ برنگی کائنات اور یہ عمومی نعمتیں خدا نے کس ہدف

ومقصد کے تحت خلق کیں؟ اگر انسان غور کرے تو یہ دقیق ترین سوال ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ وہ کامیاب ترین، دانا ترین اور آگاہ ترین انسان ہے، وہ عارف انسان ہے کہ جس کو ان تین سوالوں کے جواب معلوم ہو جائیں:

رَحِمَ اللّٰهُ امْرَءً عَرَفَ مِنْ أَيْنَ وَفِيْ أَيْنَ وَإِلٰى أَيْنَ ......[1]

خدا رحمت کرے اس شخص پر جس نے یہ پہچان لیا کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ اور (پھر) کہاں جانا ہے؟......

گمشدہ انسان اسی کو کہتے ہیں جسے یہ معلوم نہ ہو۔ جیسے بازار میں گمشدہ بچے کو یہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے پوچھتے ہیں کہ کہاں سے آئے ہو؟ وہ نہیں بتا سکتا۔ کہاں جانا ہے؟ نہیں بتا سکتا۔ اس وقت کہاں ہو؟ یہ بھی نہیں بتا سکتا۔ بچہ فقط دکانوں کی کھڑکیوں میں جھانکتا رہتا ہے، رنگ برنگی مخلوق دیکھ کر خوش ہوتا ہے، کبھی تھک جاتا ہے، کبھی جاگتا ہے اور کبھی کھاتا ہے۔ اسی طرح بہت سے انسان اس گمشدہ بچے کی مانند ہیں جو کھاتے، پیتے، سوتے، اٹھتے اور رنگ رلیوں میں مشغول ہیں لیکن ان تینوں سوالوں سے ناآشنا و ناآگاہ ہیں۔

معرفتِ خدا نتیجۂ معرفتِ نفس

اگر ان تین سوالوں کے جوابات معلوم ہو جائیں تو ہمیں اپنا سراغ مل جائے گا اور جب اپنا سراغ مل جائے تو ہمیں رازِ کائنات اور خالقِ کائنات کا راز معلوم ہو جائے گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ......[2]

---

[1]...... (علیؑ و پایانِ تاریخ، بحوالہ/اسفار-ملاصدراؒ، الجزء ۸، صفحہ ۳۵۵)

[2]...... (مرآة العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ - العلامة المجلسیؒ، الجزء ۲، صفحہ ۵۶) (بحار الأنوار - علامہ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۲، صفحہ ۳۲) (میزان الحکمة - الریشھری، الجزء ۷، صفحہ ۱۳۰)

جس نے اپنے آپ کو پہچانا بتحقیق اس نے اپنے رب کو پہچانا......

اپنے آپ کو کشف کرلو، تلاش کرلو اور سمجھ لوتو تم پر کائنات کے راز کھول دیئے جائیں گے لیکن گمشدہ کو کچھ بھی نہیں بتایا جاتا۔ اگر ایک گمشدہ آدمی بازار میں جا کر مملکت کے راز جاننا چاہے تو اسے کچھ بھی نہیں بتایا جاتا چونکہ یہ خود ہی گمشدہ ہے، اسے معلوم ہی نہیں کہ یہ کہاں سے آیا ہے، کہاں جانا ہے، اور ابھی کہاں ہے؟ اسے کون راز بتائے گا۔ اگر ایک گمشدہ آدمی آپ کی گھریلو مصروفیات و معلومات جاننا چاہے تو آپ اس نہیں بتاتے، کیونکہ پہلے اسے اپنا اتا پتا تو معلوم ہو۔

اسی طرح ایک گمشدہ کو خدا کس طرح کائنات کے راز بتا دے؟ جو اپنے آپ کو ڈھونڈ لے اسے کائنات کے راز مل جاتے ہیں۔ اس وجہ سے کائنات کے راز معلوم کرنے ہیں تو درِ صدیقہ طاہرہ سلام اللہ علیہا پہ آنا پڑتا ہے۔ اس ہستی کو سارے جوابات معلوم ہیں کہ کہاں سے ہیں؟ کہاں کیلئے ہیں؟ اور اس وقت کہاں ہیں؟ پس خداوند تعالیٰ نے حقائق و معارف جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو الہام کر دیئے۔ آپؑ ان معارف پر شکرِ خدا بجالاتی ہیں۔

وَلَهُ الشُّكْرُ عَلٰى مَا أَلْهَمَ،

پروردگار کا شکر ہے کہ جس نے مجھے یہ معرفت الہام کی ہے، جس نے مجھے کائنات کے رازوں سے آشنا کیا ہے، جس نے مجھے ان دقائق سے آشنا کیا ہے۔

اللہ نے کائنات کا کوئی ذرّہ بے مقصد خلق نہیں کیا۔ اس کائنات کی خلقت سے اللہ کی کون سی مشکل حل ہوتی ہے؟ اگر یہ کائنات خلق نہ ہوتی تو کیا کمی ہوتی؟ ان سوالوں کا جواب خزانۂ معرفتِ فاطمیہؑ سے ملے گا۔ خدا نے ان ہستیوں کو اپنے علم کا مظہر قرار دیا ہے۔ انہیں خدا نے الہام کیا اور معلمِ ناس بنایا ہے۔ خدا نے انہیں یکجا ساری معرفت دے دی ہے جسے انہوں نے بشریت کو تدریجاً سکھایا۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن یکجا عطا فرمایا لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیئس سال میں اسے تعلیم فرمایا۔ اسی طرح امام منبع معرفتِ خدا و تجلی گاہِ معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے۔

مستقیم راستہ کے لیے مستقیم فکر کی ضرورت

مِنْ عُمُوْمِ نِعَمٍ اِبْتَدَأَهَا،

یہ اسی نکتے، باریکی اور گہرائی کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے کائنات کو کیوں پیدا کیا؟ عموماً جب ہم ان موضوعات میں غور و فکر کرتے ہیں تو مستقیم فکر نہیں رکھتے۔ ہم خدا سے کہتے تو ہیں کہ

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ...... [1]

ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما۔

خدا ہدایت کر دیتا ہے لیکن ہم مستقیم راستے سے کج ہو کر دائیں بائیں نکل جاتے ہیں۔ چونکہ شیطان نے صراطِ مستقیم کے دائیں بائیں اپنے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں اور انسان کو اپنی جانب گھسیٹنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ صراطِ مستقیم بہت ہی طولانی اور وسیع و عریض راستہ ہے۔ انسان کی سوچ، ارادے، فیصلے، گفتار، رفتار اور کردار سب میں صراطِ مستقیم ضروری ہے۔ سب سے پہلے فکر میں صراطِ مستقیم ہو کہ انسان شیطان زدہ وشبہ زدہ نہ ہو جائے۔ ضروری نہیں ہے کہ شیطان فقط انسان سے گناہ ہی کرواتا ہے بلکہ بعض اوقات اشتباہ بھی کرواتا ہے۔ وہ انسان کو غلط سوچنے کا موقع دیتا ہے یا اس میں مدد فراہم کرتا ہے۔

انسانی سوچ میں شیطان کی مداخلت

معصیتِ عملی میں معاونت سے پہلے شیطان کا کام انسان کی سوچ میں مداخلت کرنا ہے اور معصیتِ عملی کیلئے شیطان انسان کی دو اندرونی صلاحیتوں غضب اور شہوت سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام کی تعبیر کے مطابق شیطان انسان میں اپنا گھونسلا وآشیانہ بناتا ہے۔ اس آشیانے کے اندر انڈے دیتا ہے اور ان سے چوزے نکالتا ہے۔ انسان کے وجود کے اندر اپنی نسل پالتا ہے اور اس کے آشیانے کی بہترین جگہیں

---

[1]...... (سورۃ الفاتحۃ، آیہ ٦)

انسان کی شہوت اور غضب ہیں۔شیطان کے رسوخ وؤ رود کے لئے یہ دوآ سودہ مقامات ہیں۔

اسی طرح جب شیطان انسان کی سوچ ،فکر اور غور میں آشیانہ بنانا چاہتا ہے تو تخیل اور تو ہم کے دروازوں سے آتا ہے۔اس لئے آپ کوئی فکر کرنے یا کوئی کام کرنے سے پہلے شیطانِ رجیم کے شر سے بارگاہِ خدا میں پناہ مانگیں۔ایسا نہ ہو کہ شیطان فہمِ دین کی جگہ تخیل رکھ دے یا تو ہم کو دین بنا کر پیش کرے۔وہ حقائقِ دین کو سمجھنے کی بجائے انسانی تخیل وتو ہم کے ذریعے حقائقِ دین کی شبیہ بنائے اورانسان ان توہمات و خرافات کو دین اور مقدس سمجھ کر قبول کر لے۔

معاملہ کو پرکھنے کے غلط معیارات

انسان اس وقت کسی اشتباہ کا شکار ہوتا ہے جب کسی معاملہ کو پرکھنے کیلئے غلط چیز کو معیار، میزان و قانون قرار دیتا ہے۔اس مطلب کو مولانا روم نے بڑی ہی خوبصورت تشبیہ وتمثیل کے ذریعے بیان کیا ہے۔
ایک دکاندار نے بولنے والا طوطا پالا ہوا تھا۔طوطے کی وجہ سے دکان پر لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔جو شخص بھی دکان پہ آتا تو طوطا اس کو ویلکم کرتا، حال احوال پوچھتا لہٰذا گاہک طوطے سے محظوظ ہونے کے لئے باقی دکانوں کی بجائے اس دکان سے خریداری کرتے تھے۔آج بھی طوطوں کے ذریعے بڑے بڑے کاروبار چلتے ہیں، بڑے بڑے مکاتیب طوطوں کی وجہ سے کامیاب ہوجاتے ہیں چونکہ لوگ طوطوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔

ایک دن وہ طوطا اڑا تو اس نے دکان میں پڑی ہوئی قیمتی تیل کی شیشی گرادی۔سارا تیل زمین پر بہہ گیا تو مالک کو بہت غصہ آیا لہٰذا اس نے غصے میں آکر طوطے کو پکڑا اور زمین پر دے مارا۔جس کی وجہ سے طوطے کے سر کے سارے بال جھڑ گئے۔اس رویے پر طوطے کو بہت دکھ ہوا اور اس نے بولنا چھوڑ دیا۔جب طوطے نے بولنا کم کر دیا تو اب گاہک بھی کم آنے لگے لہٰذا اب دکاندار کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔بہرکیف اس نے بہت جتن کئے لیکن طوطا سارا دن پنجرے میں خاموشی سے افسردہ بیٹھا رہتا تھا۔ایک دن دکان میں

ایک گنجا گاہک آیا چونکہ بسا اوقات انسانوں کے بھی بال گر جاتے ہیں۔ بال گر جانا کوئی معیوب بات نہیں ہے لیکن بعض لوگ اس کو عیب سمجھتے ہیں۔ جس طرح سے بال نکلنا کوئی عیب نہیں ہے اسی طرح سے بال گرنا بھی کوئی عیب نہیں ہے۔

غرضیکہ اسے دیکھ کر طوطا فوراً بول پڑا کہ بھائی لگتا ہے کہ تم نے بھی تیل کی شیشی گرائی ہے۔ یہ واقعہ بہت ہی سادہ سا ہے لیکن مولانا روم کی یہ خوبی وخصوصیت ہے کہ بہت ہی دقیق معارف کو سادہ اور خوبصورت مثالوں سے بیان کر دیتے ہیں اور اس سے بہت ہی خوبصورت نتیجہ لیتے ہیں۔ آپ نے اس داستان سے یہ نتیجہ لیا کہ طوطے کی سوچ میں یہ غلطی تھی کہ اس نے اپنے خیال میں غلط قانون بنالیا تھا کہ جس کے بھی سر کے بال نہ ہوں اس سے وہی غلطی سرزد ہوئی ہوگی جو میں نے کی تھی۔ وہ فرضی طوطا تھا لیکن اصل طوطے وہ انسان ہیں جو کسی واقعہ پیش آنے کے باعث اپنے خیالِ خام میں غلط سوچ یا قانون بٹھا لیتے ہیں۔

ہمارے جیسے اعمال دوسرے لوگ بھی انجام دیتے ہیں۔ ہم کوئی کام کیوں کرتے ہیں؟ چونکہ فاعلِ ناقص ہیں۔ ہم میں کسی چیز کا فقدان ہے لہٰذا اس کے حصول کے لئے کوئی کام کرتے ہیں مثلاً ہم کسی نہ کسی کمی کو پورا کرنے کیلئے پڑھتے، لکھتے، پڑھاتے، چلتے، سوتے، سنتے اور سناتے ہیں۔ کاروبار یا جاب بھی کسی کمی کو پورا کرنے کیلئے کرتے ہیں یا میں ہاتھ سے کتاب اٹھانے کا فعل اس لئے سرانجام دیتا ہوں چونکہ میرے پاس کتاب اور علم کی کمی ہے لہٰذا اس کمی کو برطرف کرنے کے لئے میں نے یہ کام کیا۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ ناقص ذات کے فاعل کو دیکھا ہے۔ میرا حشر ناقص ذات کے ساتھ رہا ہے، میں خود بھی ایک ناقص ذات ہوں یعنی ایک ایسی ذات کہ جس کے اندر بہت ساری چیزوں کی کمی ہے اور اس کمی کو دور کرنے کے لئے مجھے کوئی فعل انجام دینا پڑتا ہے۔ رزق، غذا، علم اور بہت ساری چیزوں کی کمی کو برطرف کرنے کے لئے میں کچھ کرتا ہوں اور میں نے جن کو کام کرتے ہوئے دیکھا وہ سب بھی ایسے ہی تھے۔ یہاں سے میں نے قانون بنالیا کہ جو بھی کچھ کرتا ہے وہ کسی کمی کو برطرف کرنے اور کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کرتا ہے۔ یہ مداخلتِ شیطان ہے اور اس کی وجہ سے انسان فکرِ مستقیم سے ہٹ گیا ہے۔

مولانا روم کے بقول:

کار پاکان را قیاس از خود مگیر

گرچہ ماند در نبشتن شیر و شیر......[1]

اپنے آپ کو میزان قرار دے کر پاک لوگوں کا اپنے اوپر مقایسہ مت کرو۔

چونکہ جو پاک ہیں وہ تمہاری طرح نہیں ہیں۔تمہاری ناپاکی تمہارا قصور و تمہارا نقص ہے۔کمی کی بنیاد پر انجام پانے والا فعل اور ہوتا ہے اور وہ فعل جو کمی کی وجہ سے انجام نہیں پا رہا اور ہوتا ہے۔مثلاً ہم کمرے کی لائٹ اس لئے آن کرتے ہیں چونکہ کمرہ تاریک ہے اور اشیاء نظر نہیں آ رہیں۔یہ فعل ایک مقصد تک پہنچنے کے لئے ہے۔مقصد یہ ہے کہ مجھے کمرے میں موجود اشیاء اور حقائق نظر آنا شروع ہو جائیں۔چونکہ ہم نے ہمیشہ ناقص کو دیکھا ہے لہٰذا یہ فارمولا خود بنا لیا کہ جو بھی لائٹ آن کرتا ہے وہ اسی مقصد کیلئے کرتا ہے۔اسی لئے ہم بچوں کے اکثر سوالوں کے جواب دینے سے قاصر رہتے ہیں۔واقعاً بچوں کو قانع کرنا ایک ہنر ہے اور ہم ایسے ہنرمند کی جستجو میں ہیں جو بچوں کے سوال کا جواب بچگانہ زبان میں دینے کا فن جانتا ہو۔وہ یہ ہنر سب کو سکھائے کہ کس طرح بچوں کو یہ چیزیں سکھائی اور بتائی جاتی ہیں؟

دیندار خاندان میں والدین اپنے بچوں کو بتاتے اور پڑھاتے ہیں کہ پیارے بچو! زمین و آسمان، چرند و پرند، شجر و حجر اور تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔خصوصاً جن چھوٹے بچوں کے گھر ان کے بہن بھائی کی ولادت ہوتی ہے تو بچے پوچھتے ہیں کہ یہ نئی مخلوق کہاں سے آ گئی؟ تو عموماً ماں باپ جواب دیتے ہیں کہ یہ اللہ نے دیا ہے۔

ایک مومن بتا رہے تھے کہ ان کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی اور وہ اسے ہسپتال سے گھر لائے تو ان کے ایک اور چھوٹے بچے نے پوچھا: یہ کہاں سے لے آئے؟ تو انہوں نے کہا یہ ہم نے ہسپتال سے خریدا ہے۔ بچے نے کہا فضول میں خریدا ہے اس کی بجائے آپ وی سی آر خرید لیتے۔اب یہ گھر میں شور کرے گا اور ہمیں سونے نہیں دے گا لیکن بعض والدین بچوں کو بتاتے ہیں کہ یہ اللہ نے دیا ہے۔بعض اوقات جب

[1]......(مثنوی معنوی، بہ تصحیح: رینولد ا. نیکلسون، دفتر اول، صفحہ ۱۶)

بچے سفر کر رہے ہوتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ یہ چیز کس نے بنائی؟ انہیں کہتے ہیں کہ اللہ نے بنائی تو بچہ فوراً اپنا سوال اللہ پہ لے آتا ہے کہ پھر یہ بتائیں اللہ کو کس نے بنایا؟ اس وقت باپ کہتا ہے: لاحول ولاقوۃ الا باللہ، کچھ شرم کر یہ تو کیا پوچھ رہا ہے؟ بچہ حیران ہوتا ہے کہ اب کیوں جواب نہیں دیتے۔ بڑوں کو سمجھانے کا طریقہ آتا ہے لیکن بچوں کو کیسے سمجھائیں؟ یہ سوال کہاں سے پیدا ہوا؟ اس سوال نے ایک غلط فہمی اور غلط سوچ سے جنم لیا۔ وہ غلط سوچ یہ ہے کہ جو کچھ بھی موجود ہے اسے کسی نے بنایا ہے۔ یہ قانون غلط ہے۔ ہر موجود کو کوئی بنانے والا نہیں ہے بلکہ قانون یہ ہے کہ ہر وہ موجود اور ہر وہ مخلوق جس کا اپنا ذاتی وجود نہیں ہے اس کو کوئی بنانے والا ہے۔

خدا کے بارے میں سوالات کے باطل معیارات

خدا وہ موجود ہے کہ جس کی ہستی اپنی ذاتی ہے۔ وہ عینِ ہستی ہے۔ خدا کے بارے میں ایسے بہت سے سوالات ہی غلط ہیں۔ چونکہ یہ سوال ایک غلط تفکر وسوچ سے پیدا ہوئے۔ بہت سے لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام سے آ کر پوچھتے:

اَیْنَ اللّٰہُ؟......[1]، **اَیْنَ رَبُّکَ؟**......[2]، **اَیْنَ ھُوَ؟**......[3]، **اَیْنَ الْمَعْبُوْدُ**......[4]

یعنی خدا کہاں ہے؟

تو معصومین علیہم السلام یہ نہیں فرماتے تھے کہ خدا یہاں اور وہاں ہے بلکہ فرماتے تھے کہ سوال ہی غلط ہے۔ **رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا:**

---

[1]...... (بحار الأنوار-علامہ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۳۴، صفحہ ۱۳۳) (الخرائج والجرائح-قطب الدين الراونديؒ، المتوفي سنة ۵۷۳ھ)

[2] ...... (اصول الکافی-ثقۃ الاسلام ابي جعفر محمد بن يعقوب بن اسحاق الکلينيؒ، المتوفى: سنة ۳۲۸ھ، الجزء ۱، صفحہ ۱۳۲)

[3]...... (بحار الأنوار-علامہ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۳، صفحہ ۳۳۴)

[4]...... (بحار الأنوار-علامہ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۳، صفحہ ۲۹۷)

هُوَ فِيْ كُلِّ مَكَانٍ وَرَبُّنَا لَا يُوْصَفُ بِمَكَانٍ وَلَا يَزُوْلُ...... ۱؎

وہ ہر مکان میں ہے اور ہمارا رب مکان سے متصف نہیں ہوتا اور اس کو زوال بھی نہیں ہے......

اسی طرح امام علی علیہ السلام نے ایک یہودی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ أَيَّنَ الْأَيْنَ فَلَا أَيْنَ لَهُ، وَجَلَّ عَنْ أَنْ يَحْوِيَهُ مَكَانٌ وَهُوَ فِيْ كُلِّ مَكَانٍ، بِغَيْرِ مُمَاسَّةٍ وَلَا مُجَاوَرَةٍ...... ۲؎

بے شک اللہ تعالیٰ نے مکان کو خلق کیا ہے پس اس کے لئے کوئی مکان نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ عظیم ہے اس سے کہ اس کیلئے کوئی مکان ہو، درحالیکہ وہ ہر مکان میں ہے، بغیر اس کے کہ اسے محسوس کیا جائے اور بغیر اس کے کہ اس کا کوئی پڑوسی تصور کیا جائے......

خدا خالقِ مکان ہے اور خالقِ مکان کا اپنا کوئی مکان نہیں ہوتا۔ یہ سوچنا کہ ہر ایک کا مکان ہوتا ہے یہ سوال، یہ فارمولا اور یہ قاعدہ ہی غلط ہے۔ مکان اس کو چاہیے ہوتا ہے جو محتاجِ مکان ہو اور جس کا جسم ہو لہٰذا جو جسم نہ رکھتا ہو اور نہ محتاج ہو اس کا کوئی مکان نہیں ہوتا۔ اللہ نے یہ کائنات کیوں بنائی؟ ہمیں کیوں پیدا کیا؟ کس مقصد کے حصول کے لئے پیدا کیا؟ غور کریں کہ یہاں مستقیم سوچا نہیں ہے، استقامتِ فکری نہیں ہے بلکہ مداخلتِ شیطان آ گئی ہے۔ یعنی شیطان نے ہمارے توہم اور تخیل میں یہ نکتہ ڈال دیا کہ جب ہم کچھ کرتے ہیں تو کسی مقصد کے لئے کرتے ہیں، کسی کمی کو پورا کرنے کے لئے کرتے ہیں، جب میرے جیسے دوسرے لوگ کوئی کام کرتے ہیں تو کسی کمی کو پورا کرنے کے لئے کرتے ہیں لہٰذا اللہ نے جب کچھ کیا تو اس نے اپنی کون سی ضرورت پوری کی؟

یہاں ہماری فکری و اعتقادی استقامت ختم ہو گئی، ہم فکرِ مستقیم اور صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے۔ یہ مستقیم سوچ نہیں ہے بلکہ مستقیم سوچ یہ ہے کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ جو بھی کوئی کام انجام دیتا ہے تو کوئی کمی اور ضرورت اسے اکساتی ہے۔

۱؎...... (بحار الأنوار - علامہ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۳۴، صفحہ ۱۳۳)

۲؎...... (بحار الأنوار - علامہ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۴۰، صفحہ ۲۴۸)

خدا کے جود و کمال کا تقاضا

بعض اوقات اسے کمال اکساتا ہے اور کمی کا نہ ہونا باعث بنتا ہے کہ اس سے کوئی فعل سرزد ہو چونکہ وہ پُر اور صاحبِ جود ہے۔ اس کی جود کا تقاضا ہے کہ وہ یہ کام کرے۔ خدا کی ذات غنی ہے اور غنی کہتے ہی اسے ہیں جس کی غنا کے آثار ہوں۔ خدا نور ہے اور نور کہتے ہی اسے ہیں جس کے جلوے و شعائیں ہوں۔ نورانیت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ نور پھیلے۔ بجھے ہوئے چراغ کو جلانے کی ضرورت ہے لیکن جس کی ذات نورانی ہو اس کو جلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کی ذات کامل ہے اور جب کامل سے کوئی فعل سرزد ہوتا ہے تو پھر اس کی ضرورت نہیں پوچھی جاتی کہ اس نے یہ کام کیوں کیا ہے۔ چونکہ یہ اس کی ذات کا تقاضا ہے کہ اس سے کوئی چیز ظاہر ہو اور وہ صاحبِ اثر ہو۔ ہمیشہ ناقص کے بارے میں ہی سوال اٹھتا ہے۔

مِنْ عُمُوْمِ نِعَمٍ اِبْتَدَأَهَا،

خدا کی سب نعمتیں ابتدائی ہیں۔

اے پروردگار تو نے یہ ساری عمومی نعمتیں پیدا کیں، ساری کائنات خلق کی، کیوں خلق کی؟ چونکہ تیری جود کا تقاضا تھا، تیری بخشش کا تقاضا تھا، تیری ذات کے پُر ہونے کا تقاضا تھا، تیری ذات کے غنی ہونے کا تقاضا تھا۔

جودی اور سودی فاعل میں فرق

خداوند تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ میں نے عالمین کو سود کے لئے نہیں بلکہ جود کی وجہ سے پیدا کیا ہے۔ ہم سودی فاعل ہیں۔ مستقیم فکر یہاں سے ختم ہو جاتی ہے کہ سودی فاعل ہمیشہ سود کے لئے ہی کچھ کرتا ہے۔ اسے رباء (Interest) میں نہ لے جائیں بلکہ یہاں سود سے مراد فائدہ ہے۔ جو فائدوں کے لئے کچھ کریں وہ سودی فاعل ہیں۔ سودی فاعل جب بیٹھ کر جودی فاعل کے بارے میں سوچتا ہے تو یہاں وہی طوطے والی غلطی کرتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہر فاعل سودی ہوتا ہے۔

نور نام ہی اس حقیقت کا ہے جس سے حقائق روشن ہوں۔ یہ ذاتِ خدا کا جلوہ ہے۔ خدا نے تمام

نعمتیں ابتداءً پیدا کی ہیں۔ کسی نے بھی یہ نعمتیں خدا سے طلب نہیں کیں۔

الفاظ سے اشتباہ

چونکہ ہمیں یہ سب کچھ ہماری ہی زبان میں الفاظ کی مدد سے بتایا گیا لہٰذا ہم اشتباہ کرجاتے ہیں مثلاً:

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝......[1]

جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے: ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

بعض لوگ منبروں پر بھی وہی طوطے والی غلطی کرتے ہیں کہ جب ہم کسی کو کچھ کہتے ہیں تو پہلے اس کا ہونا ضروری ہے مثلاً میں آپ سے کچھ کہہ رہا ہوں تو جسے کہہ رہا ہوں وہ پہلے سے ہی موجود ہو، کوئی موجود ہوتا کہ میں اس سے خطاب کروں۔ وہ منبروں پر لوگوں کے سامنے کہتے ہیں کہ جی خدا نے جب کہا تھا ''کن'' تو کس کو کہا تھا؟ کوئی موجود تھا جس کو کہا تھا۔ پس وہ کون تھا؟ وہ تیرے ذہن کا تخیل وتوہم تھا۔ وہ تیری فکرِ غیر مستقیم ہے۔

......يَقُولَ......خدا کا فعل ہے۔ خدا نے کیا، نہ کہ کہا۔ خدا زبان اور الفاظ سے...... كُنْ......نہیں کہتا بلکہ خدا نے ارادہ کیا...... إِذَا أَرَادَ شَيْئًا ......خدا جب کسی شے کا ارادہ کرتا ہے...... أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ......تو اس ارادے سے وہ شے وجود میں آ جاتی ہے۔ خدا کا قول کسی مخاطب کے لئے نہیں ہوتا بلکہ خدا کے قول سے مخاطب پیدا ہوتا ہے۔

چونکہ ہم ناقص ہیں لہٰذا ہم جب بات کرتے ہیں تو کوئی پہلے سے موجود ہو جس کے ساتھ ہم بات کریں، جس کو اپنا پیغام سنائیں اور جس سے خطاب کریں۔ ہم خطاب کیلئے مخاطب کے محتاج ہیں۔ اللہ کا خطاب ارادۂ خدا ہے، قول نہیں ہے کہ پہلے خدا اپنی ذات میں ارادہ کرتا ہے، پھر ارادہ کر کے خدا کو شوق ہوتا ہے، پھر شوق ہونے کے بعد خدا زبان استعمال کرتا ہے (معاذ اللہ)، پھر اس کے بعد عربی میں ''کن'' کہتا ہے اور پھر اس کے بعد کوئی شے اسے سنتی ہے، وہ کہتی ہے کہ خدا نے ''کن'' کہہ دیا ہے لہٰذا اب میں ہو جاتی ہوں۔

---

[1]......(سورۃ یٰس، آیہ ۸۲)

کامل اور ناقص کے اعمال میں فرق

جب ہم کسی کو اپنے مافی الضمیر سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے دو مرحلے ہوتے ہیں:

......حقیقت کا مرحلہ

......تجزیہ وتحلیل کا مرحلہ

مثلاً جب کسی جگہ دھماکہ ہوتا ہے تو بعد میں میڈیا میں اس کے بارے میں تبصرے وتجزیے شروع ہوتے ہیں کہ یہ کس نے کیا ہوگا؟ کیسے کیا ہوگا؟ کیوں کیا ہوگا؟ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہوگا؟ ان کے اہداف کیا ہوں گے؟ یہ سب تجزیہ وتحلیل کا مرحلہ ہوتا ہے۔ تجزیے میں بہت ساری چیزیں الگ کی جاتی ہیں چونکہ دھماکے میں یہ الگ نہیں تھیں۔ دھماکہ کرنے والے نے اتنا کچھ نہیں کیا جتنا تبصرہ کرنے والا کر رہا ہے۔ مثلاً تبصرہ کرنے والا کہتا ہے کہ یہ امریکہ نے کروایا ہے تو اب نئی بحثیں چھڑ جاتی ہیں کہ امریکہ کون ہے؟ اس کی حیثیت کیا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اس کے خطے اور پاکستان میں کیا مقاصد ہیں؟ اس کا طریقہ واردات کیا ہے؟ اس کے پاکستان میں کتنے مہرے ہیں؟ وہ انہیں کس طرح استعمال کرتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور مثال یہ ہے کہ الحمدللہ! پاکستان کے وزیراعظم صاحب عدالت کے اندر رسماً مجرم قرار پائے تھے۔ انہیں جو سزا ملی تھی وہ بہت ہی مضحکہ خیز تھی یعنی تیس سیکنڈ تک قید کی سزا۔ توہینِ عدالت کیس میں صرف پاکستان میں ہی ایسی سزا سنائی جاتی ہے لیکن میڈیا میں اس واقعہ پر ایک عجیب کہرام مچا ہوا تھا، سنسنی پھیلی ہوئی تھی اور میڈیا میدانِ جنگ بنا ہوا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ عمل صرف یہ تھا کہ عدالت نے ایک ملک کے وزیراعظم کو مجرم قرار دیا تھا کہ یہ کرپٹ آدمی ہے۔ اب اس پر تبصرے شروع ہوئے تو لمبی لمبی داستانیں اور بہت سے ایسے حقائق جو روشن نہیں تھے تبصرے وتجزیے کے مرحلے میں کھول کر سامنے لائے گئے۔ یعنی نیتوں، اسباب، اہداف، منصوبوں اور سازشوں کو الگ الگ بیان کیا گیا کہ ایک دھڑا کیا سوچ رہا ہے؟ دوسرا جتھہ کیا سوچ رہا ہے؟ عدالت کیا چاہتی ہے؟ فوج کیا چاہتی ہے؟ ایجنسیاں کیا چاہتی ہیں؟ حکومت کیا چاہتی ہے؟ پارٹی کیا چاہتی ہے؟ بیرونی ایجنسیاں کیا چاہتی ہیں؟ امریکہ کیا چاہتا ہے؟ فلاں کیا چاہتا ہے؟

یہ سب تجزے وتبصرے کئے گئے جبکہ اصل کاروائی میں اتنا کچھ نہیں تھا۔ جیسے ایک شخص نے دوسرے سے نام پوچھا تو اس نے اپنا نام تفصیل کے ساتھ بتایا: میرا نام میرزا چوہدری حاجی نور بخش نورا ہے۔ اب تم اپنا نام بتاؤ۔ اس نے کہا کہ نام تو میرا بھی نورا ہی ہے لیکن میرے نام کے ساتھ اتنا رَش نہیں ہے۔

غور کریں واقعہ تو ایک رونما ہوا ہے لیکن جب تجزیہ وتحلیل کا مرحلہ آتا ہے تو اس ایک لمحہ کی کاروائی کے پیچھے چند دنوں یا چند مہینوں کی کاروائی بن جاتی ہے۔ حقیقت اور تجزیہ وتحلیل میں یہ فرق ہوتا ہے کہ دھماکہ ایک سیکنڈ میں ہوتا ہے لیکن تجزیے کے مرحلہ میں کئی تفاصیل سامنے آجاتی ہیں۔ اگر دھماکہ کرنے والا ان تفاصیل میں پڑ جاتا تو دھماکہ کبھی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

تجزیہ وتحلیل گر ذہن

ہمیشہ کسی شیٔ کی حقیقت ہوتی ہے اور اس حقیقت کو سمجھنے کا ذہنی تجزیہ ہوتا ہے۔ خدا نے انسان کا ذہن بنایا ہی ایسے ہے کہ یہ تجزیہ کرنے والا وتحلیل گر ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس کے ذہن میں جو بھی چیز جائے یہ فوراً اس کے حصے بخرے کر دیتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ ایک شخص کو جو بھی کاغذ دیا جاتا وہ فوراً اس کو پھاڑ دیتا تھا، بجلی کا بل، بچے کا سرٹیفکیٹ، نوٹ، چیک اور کوئی بھی قیمتی دستاویز پھاڑ دیتا تھا۔ بعد میں خود اس کو افسوس بھی ہوتا تھا۔ آخر کار جستجو کی گئی کہ یہ ہر قسم کے کاغذ کو کیوں پھاڑ دیتا ہے۔ تحقیق کرنے سے پتا چلا کہ یہ سینما گھر میں ٹکٹ کلیکٹر تھا۔ ٹکٹ پھاڑتے پھاڑتے اسے کاغذ پھاڑنے کی عادت ہوگئی تھی۔ اسی طرح سے انسانی ذہن بھی ہے کہ آپ اس میں جو بھی چیز ڈالیں تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک نہیں ہوگی۔

فرض کریں میڈیا والوں کے پاس وہ دہشت گرد خود آجائے اور کہے کہ میں نے تو اتنا اہتمام نہیں کیا تھا جتنا تم میرے بارے میں بیان کر رہے ہو۔ میں تو صرف ایک جیکٹ پہن کے آیا تھا پھر تم اتنی لمبی چوڑی داستان کیوں بیان کر رہے ہو؟ اس سے یہی کہا جائے گا کہ تم نے بہت ہی مختصر کام کیا لیکن اس مختصر کے اندر یہ سب کچھ موجود ہے۔ اس مختصر کو جب ذہن کے اندر لے آئیں تو ذہن اس سے پردے ہٹاتا ہے۔ باہر جو کچھ

ہوا اس کی ساری تفصیل اس عمل میں سمٹی و لپٹی ہوتی ہے۔ جس طرح بسا اوقات دھاگے کا ایک سرا پکڑ کے کھولنا شروع کریں تو اس کے اندر سے بہت لمبا دھاگہ نکلتا ہے۔ آپ حیران ہوجاتے ہیں کہ ایک کلومیٹر دھاگہ اس چھوٹی سی چیز سے نکل آیا۔ یہ اسی چھوٹی سی چیز میں موجود تھا لیکن سمٹا ہوا تھا۔

جدید ٹیکنالوجی، حقائق سمجھنے میں مددگار

آج کل مائیکرو ٹیکنالوجی (Micro Technology) نے یہ مسئلہ سمجھنا آسان کردیا ہے۔ مائیکرو ٹیکنالوجی نے بڑی کائنات کو سمیٹ کر چھوٹے چھوٹے ذروں میں سمادیا ہے مثلاً کئی گھنٹوں کی دستاویزی فلم ایک چھوٹے سے ذرے میں موجود ہوتی ہے۔ آج بشر اس مائیکرو ٹیکنالوجی پر قادر ہوا تو یہ بات اسے سمجھ آئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ دقیق تر نے نوٹیکنالوجی (Nano Technology) ہے جس نے عظیم الجثہ چیزوں کو مزید چھوٹا کرنا شروع کردیا ہے۔ ابھی جتنی بھی بڑی بڑی چیزیں آپ کے پاس ہیں یہ ناقابلِ رویت ذروں میں آپ کے پاس آئیں گی۔ مستقبل میں جو کچھ آپ کی دسترس میں آنے والا ہے وہ سب نے نوٹیکنالوجی کی بنیاد پر ہوگا۔ آپ کو انہیں مائیکروسکوپ سے دیکھنا پڑے گا لیکن ان کے اندر ساری تفاصیل موجود ہوں گی۔ یہ مثالیں اس لئے دی ہیں تا کہ آپ کا ذہن اس نکتہ کیلئے آمادہ ہوجائے جو عرض کرنا چاہتے ہیں۔

خدائی امور کے متعلق باطل سوچ

یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے خطاب کیا تو اس خطاب کے بعد کوئی سننے والا ہو، کوئی شئ ہو، کوئی موجود ہو، کوئی مخلوق ہو جو اس خطاب کو سنے تو یہ ذہن کے تجزیے کا مرحلہ ہے۔ ان لوگوں کا ذہن اسے تقسیم کررہا ہے کہ ایک اللہ کا خطاب ہے اور دوسری خطاب سننے والی کوئی شے۔ آپ نے ذہن میں تجزیہ کرکے اسے دو امور میں تقسیم کیا ہے لیکن اللہ نے دو کام انجام نہیں دیئے۔ اللہ نے خطاب کیا اور اس خطاب سے مخاطب پیدا ہوا، مخاطب نے شئیت کا لباس پہنا، انسانیت کا لباس پہنا، ہستی کا لباس پہنا اور آپ کے سامنے جلوہ گر ہوا۔

جب آپ اس شیٔ کو ذہن میں کھولتے ہیں تو اس کے مراحل ذکر کرتے ہیں۔ یہ مراحل تجزیے وتحلیل کے مراحل ہیں، خلقت کے مراحل نہیں ہیں۔خلقت کے مراحل میں اللہ نے بس ارادہ کیا جس سے یہ ساری تفصیل وجود میں آ گئی۔ جب آپ اپنے ذہن کی مدد سے اس ساری تفصیل کو سمجھنا چاہتے ہیں یعنی عمل کو علم میں بدلتے ہیں تو علم میں اتنی وسیع تفصیل نکل آتی ہے۔ پھر سوچتے ہیں کہ خطاب ہو تو مخاطب بھی ہو۔

اللہ نے کائنات کو اپنے ارادے، جود اور نور کے ذریعے ابتداءً پیدا کیا ہے۔کسی کے مطالبے سے پیدا نہیں کیا۔ یوں نہیں ہے کہ کوئی شیٔ پہلے سے ہی شئیت کا لباس پہن کر بیٹھی تھی اور اسے اللہ نے کہا کہ تو ہو جا اور وہ ہو گئی۔ یہ سب کچھ ہمارا ذہن کر رہا ہے۔ مخاطب ذہن تلاش کر رہا ہے ورنہ اللہ کے ارادے کے بعد یہ شیٔ وجود میں آئی ہے۔

قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا......[1]

کیا زمانے میں انسان پر ایسا وقت آیا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا؟

جب حضرتِ زکریا علیہ السلام نے تعجب کیا کہ اے خدا کیا تو مجھے بڑھاپے میں فرزند دے گا تو خدا نے فرمایا کہ اے زکریاؑ! تو بوڑھے زکریاؑ سے یحییٰؑ پیدا کرنے پر تعجب کرتا ہے اور تجھے اس پر تعجب نہیں ہے کہ تو کچھ بھی نہ تھا تو خدا نے تجھے پیدا کیا۔ بوڑھے زکریاؑ سے یحییٰؑ پیدا کرنا آسان ہے لیکن کچھ نہ ہونے سے زکریاؑ بنانا مشکل ہے۔

انحرافِ فکری سے انحرافِ عملی تک

پس اگر معرفتِ خدا سے متعلق انسان کی فکر مستقیم نہ ہو تو زندگی میں انحراف آ جاتا ہے۔ آج ہم دنیوی زندگی میں غرق ہیں اور ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں جو ہمارے شایانِ شان نہیں ہے۔ ہماری زندگیاں صرف غلے اور اپنی ذات کے گرد منڈلا رہی ہیں اور یہ مقامِ انسانیت نہیں بلکہ مقامِ حیوانیت ہے۔ حیوان کے لئے یہ زندگی

[1]......(سورۃ الانسان، آیہ ۱)

خوب ہے۔ انسان کو خدا نے معرفت اور سمجھنے کیلئے عقل دی اور حقائق کی طرف متوجہ کرنے کیلئے معلم پیدا کئے۔

حضرتِ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا فقط دعاؤں اور حاجات کی برآوری کا وسیلہ نہیں ہیں بلکہ وجیہہ عنداللہ ہیں۔ خدا نے حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو معلمِ بشریت بنایا ہے لہٰذا جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا پہلے بشر کو اللہ کی حقیقت بتائیں گی، اللہ کی صفات سے آشنا کریں گی، بشر کے دل میں اللہ کا خوف ڈالیں گی، بشر کو اللہ کی طرف متوجہ کریں گی، پھر اللہ کا دین بتائیں گی لیکن جس بشر کو اللہ ہی کی معرفت نہ ہو، جس کے دل سے خوفِ خدا نکل گیا ہو وہ فاطمہ سلام اللہ علیہا پر بھی ظلم کرتا ہے اور فاطمہؑ کی آلؑ پر بھی۔ وہ پوری بشریت پر ظلم کرتا ہے۔ پس بشر کو کس طرح انحراف سے روکا جائے؟ اسے بتایا جائے کہ اے بشر تو کون ہے؟ تو جو آج اتنا مغرور و متکبر اور اقتدار کی شہوت میں مست و اندھا ہو گیا ہے کیا تجھے حق نظر نہیں آتا؟ اس لئے کہا کہ فدک حق کو بیان کرنے کے لئے ایک بہانہ تھا۔ لوگوں کو حق اس لئے نظر نہیں آتا کہ حقِ مطلق و حقِ متعال نظر نہیں آتا۔ اگر یہ حق انہیں سمجھ آتا تو آج ہر ایک کا حق سمجھ آتا۔ ان کی مشکل یہ ہے کہ یہ خدا سے دور اور غافل ہیں اس لئے آپؑ نے خطبہ کا آغاز حق تعالیٰ کے ذکر سے کیا۔ خطبہ کا پہلا حصہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ بہت ہی بالاتر اسرار و معارف کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔

عمومی نعمتوں پر ثنائے فاطمہ سلام اللہ علیہا

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا خطبہ کے اس مرحلہ میں خدا شناسی کے ساتھ کائنات شناسی کا ذکر نعمتوں پر ثنائے پروردگار کے وسیلہ سے فرما رہی ہیں:

مِنْ عُمُوْمِ نِعَمٍ اِبْتَدَأَهَا،

ان عمومی نعمتوں پر ثنائے پروردگار ہے جو خدا نے ابتداً عطا کی ہیں، بغیر مانگے خلق کی ہیں۔

آپؑ بارگاہ خدا میں عمومی نعمتوں پر ثناءِ پروردگار کر رہی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جنابِ سیدہؑ عام عورتوں کی طرح صرف اپنی خصوصی نعمتوں کے حصول پر شکرِ خدا ادا کر رہی ہیں مثلاً اپنے گھر کو نعمتوں سے بھرا ہوا دیکھتی ہیں، کچن کو بھرا ہوا دیکھتی ہیں، ڈرائنگ روم کو بھرا ہوا دیکھتی ہیں، اپنے بچوں کے دس دس جوڑے

کپڑے اور جوتے دیکھتی ہیں تو پھر خدا کا شکر ادا کرتی ہیں کہ اے خدا تیرا شکر کہ میرے حسنؑ وحسینؑ کو اتنا کچھ دیا بلکہ یہ وہ بی بیؑ ہیں کہ جب گھر میں کوئی مہمان آجاتا ہے اور گھر میں نہ اپنے لئے نہ اپنے بچوں کو کھلانے کیلئے کچھ ہے تو اسی وقت بارگاہِ خدا میں کہتی ہیں کہ اے پروردگار یہ نعمتیں جو تو نے عطا کی ہیں ان پر تیری شکر گزار ہوں۔کوئی پوچھے بی بیؑ آپ کا گھر تو خالی ہے، آپ کے پاس تو مہمان کو کھلانے کے لئے بھی کچھ نہیں ہے تو جواب کیا آئے گا؟ کیا تو فاطمہؑ کے ذہن کو اپنے جیسا محدود سمجھتا ہے۔یہ ساری کائنات خدا نے فاطمہؑ کو عطا کی ہے، میری نعمت وہی نہیں ہے جو میرے گھر میں رکھی ہوئی ہے، جس کی سند میرے نام ہے، جس کی ڈگری میرے نام ہے بلکہ جو کچھ اس عالم میں ہے یہ سب خدا کی عمومی نعمتیں میرے لئے ہیں۔

نعمتوں کی اقسام

ہم نعمتوں کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱)عمومی نعمتیں

۲)خصوصی نعمتیں

خدا نے کچھ نعمتیں ایسی پیدا کی ہیں جو سب کیلئے عام ہیں۔عمومی نعمتیں یعنی جو خدا نے ابتداءً عطا فرمائی ہیں جیسے اصلِ نظامِ ہستی، اسباب، مراتب ودرجاتِ نظامِ ہستی جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے اندر مقرر فرمائے ہیں۔اسی نظم کے نتیجے میں نظم ونظامِ عالم اور خصوصاً نظامِ بشری چل رہا ہے۔عمومی نعمتیں ایک فرد سے زیادہ افراد سے تعلق رکھتی ہیں۔

خصوصی نعمتیں وہ ہیں جو ایک خاص فرد کے ساتھ مخصوص ہیں یعنی جو نعمتیں اللہ نے صرف آپ کو دی ہیں مثلاً جو اولاد اللہ نے آپ کو دی ہے، آپ کا بیٹا یا بیٹی خصوصی نعمت ہے۔جو صحت خدا نے آپ کو دی ہے یہ خصوصی نعمت ہے، جو عزت اللہ نے آپ کو دی یہ خصوصی نعمت ہے، جو توفیق اللہ نے آپ کو دی ہے یہ خصوصی نعمت ہے۔ہمیں وہ نعمتیں بھی یاد نہیں ہیں جو خدا نے ہمیں عطا کی ہیں۔

عمومی نعمت، خصوصی نعمت کا پیش خیمہ

عمومی نعمتوں کے بطن سے ہی خصوصی نعمتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر یہ کائنات، نظامِ عالم، قوانینِ عالم، کرات، کہکشائیں، منظومۂ شمسی، ابر، بادوباراں، خورشید و مہ اور کواکب و انجم نہ ہوں تو انسان کو ایک سانس و ایک لقمہ نان بھی میسر نہیں آ سکتا۔ یہ سب ان عمومی نعمتوں کا نتیجہ ہے کہ جنہیں انسان شاید اپنے سے متعلق نہیں سمجھتا۔ آپ کی صحت، رزق، غلہ، مال و منال، توفیق، خاندان، عزت، شرف اور ہر وہ چیز جو آپ کی ہے عمومی نعمتوں سے نکل کر آپ تک پہنچی ہے۔ اگر عمومی نعمتیں نہ ہوں تو دنیا میں کوئی خصوصی نعمت پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہم خصوصی نعمتوں پر ہی شکرِ خدا کرتے ہیں یعنی جب میں خود شفاء پا جاؤں، جب مجھے کچھ نصیب ہو جائے تو شکرِ خدا کرتا ہوں جبکہ خدا کی عمومی نعمتیں میرے لیے خصوصی نعمتوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلے عمومی نعمتوں کی شناخت کریں اور ان پر شکرگزار ہو تو ان سے خود ہی خصوصی نعمتیں نکلنا شروع ہو جائیں گی۔ کیا ہم نے کبھی عمومی نعمتوں پر خدا کا شکر ادا کیا ہے؟ کہ اے خدا ہم اس منظومۂ شمسی بنانے پر تیرے شکرگزار ہیں، خدایا ہم زمین و سورج کے درمیان جاذبہ بنانے پر تیرے شکرگزار ہیں۔

اہل بیت علیہم السلام اور نعمت شناسی

بی بی زہراء سلام اللہ علیہا نعمت شناس ہیں۔ اسی طرح نعت شناسی کا عالی ترین مجموعہ دعائے شریفِ عرفہ ہے۔ جب قم المقدسہ میں تھے تو وہاں طلاب کی خدمت میں اس دعا کی تفسیر شروع کی تھی لیکن اب پاکستان آنے کے بعد جہاں بہت ساری توفیقات اللہ نے عطا کی ہیں وہاں پر کچھ توفیقات کا تبادلہ ہو گیا ہے لیکن ایک توفیق جو ابھی تک حاصل نہیں ہو رہی وہ تفسیر دعائے شریفِ عرفہ ہے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ اس کو جاری رکھیں۔ اس دعا میں سید الشہداء علیہ السلام خدا کی ایک ایک نعمت کو یاد کر کے اس پر شکرِ خدا ادا کر رہے ہیں البتہ وہ خصوصی نعمتیں ہیں کہ اے پروردگار ان نعمتوں پر تیرا شکرگزار ہوں کہ جو میری پیدائش سے پہلے، جو پیدائش کے وقت اور جو پیدائش کے بعد تو نے مجھے عطا کی ہیں۔ سید الشہداء علیہ السلام حتیٰ اپنے جسم کے ایک ایک

جوڑ کا نام لیتے ہیں کہ اے خدایا! یہ جو انگلی کا پہلا جوڑ بنایا ہے اس پر تیرا شکر گزار ہوں، انگلی کے دوسرے جوڑ پر تیرا شکر گزار ہوں، یہ ہڈی جو تو نے پیدا کی ہے اس پر بھی تیرا شکر گزار ہوں، یہ عضو جو تو نے پیدا کیا ہے اس پر بھی تیرا شکر گزار ہوں، اس عضو کے اندر جو طاقت رکھی ہے اس پر بھی تیرا شکر گزار ہوں، گویا ایک ایک بال کا نام لے کر ان نعمتوں پر اللہ کے شکر گزار ہیں۔ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام دعائے عرفہ میں فرماتے ہیں:

لَمْ تخْرِ جْنِیْ لِرَ اْفَتِکَ بِیْ وَ لُطْفِکَ لِیْ وَ اِحْسَانِکَ اِلَیَّ فِیْ دَوْ لَۃِاَئِمَّۃِالْکُفْرِ الَّذِیْنَ نَقَضُوْ عَہْدَکَ وَ کَذَّبُوْا رُسُلَکَ لٰکِنَّکَ اَخْرَ جْتَنِیْ لِلَّذِیْ سَبَقَ لِیْ مِنَ الْھُدَی الَّذِیْ لَہٗ یَسَّرْ تَنِیْ وَ فِیْہِ اَنْشَاْتَنِیْ......

یعنی اے پروردگار! تو نے اپنی مہربانی، لطف اور احسان فرماتے ہوئے مجھے کافر بادشاہوں کے دورِ حکومت میں پیدا نہیں کیا جنہوں نے اپنے عہد و پیمان کو توڑا اور تیرے رسولوں کو جھٹلایا، بلکہ تو نے مجھے اس زمانے میں پیدا کیا کہ پہلے ہی سے ہدایت میرے لئے میسر کر دی تھی اور اس میں میری نشو نما کی۔

اے پروردگار میری ولادت سے پہلے تو نے حکومتِ اسلامی قائم کی اور اس کے اندر میری ولادت ہوئی لہٰذا میں اس بات پر تیرا شکر گزار ہوں۔ یہ عمومی نعمت سب کے لئے تھی فقط امام حسین علیہ السلام کے لئے نہیں تھی لیکن سید الشہداء علیہ السلام اس نعمت پر شکرِ خدا ادا کرتے ہیں۔

امام سید الساجدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اے پروردگار تیری نعمتوں پر جو تو نے شکر کی توفیق دی ہے میں اس توفیق پر بھی تیرا شکر گزار ہوں۔

عمومی نعمتوں سے ہماری غفلت

عمومی نعمتوں سے ہم سب غافل ہیں۔ عمومی نعمتوں کو ہم نعمت ہی نہیں شمار کرتے۔ عمومی نعمتوں کو ہم اپنا سمجھتے ہی نہیں ہیں کہ یہ نعمتیں بھی ہمارے لئے ہیں۔ اگر آکسیجن نہ، اگر گردشِ زمین نہ ہو تو جو چیز ہمیں کھانے کیلئے چاہئے وہ پیدا ہی نہیں ہوگی۔ خدا رحمت کرے سعدی پر کہ جو حکیمِ توانا و دانا ہیں۔ ان

کا ایک شعر ہے اس بارے میں کہ یہ سارا نظامِ الٰہی، یہ سورج، چاند، ستارے، کہکشائیں، شرق و غرب سب کس لئے گردش میں ہیں؟

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند

تا تو نانی بہ کف آری و بہ غفلت نخوری.....[1]

جسے نان کا ایک لقمہ مل جائے تو اسے غفلت سے نہ کھائے لیکن ہم اسے کھا لیتے ہیں۔ روٹی کے ایک لقمہ کا تعاقب کریں کہ یہ میرے منہ تک کہاں سے پہنچا؟ اگر ہم بہت ذہن چلائیں تو کہتے ہیں کہ یہ کچن سے آیا ہے۔ کچن میں کہاں سے آیا؟ مارکیٹ سے، مارکیٹ میں کہاں سے آیا؟ کھیت سے، کھیت میں کہاں سے آیا؟ فصل سے، فصل کہاں سے آئی؟ پس اگر ایک لقمہ روٹی کا تعاقب کریں تو آپ کے سامنے خدا کی ساری نعمتیں صف بستہ نظر آجائیں لہٰذا اس سے پہلے کہ وہ روٹی کا لقمہ منہ میں ڈالو، پہلے سجدے میں سر رکھ کر خدا کا شکر ادا کرو کہ اے پروردگار تو کتنا کریم ہے کہ یہ عمومی نعمتیں ہمیں عطا کیں۔

عمومی نعمتوں سے ہماری غفلت

آکسیجن اللہ کی عمومی نعمت ہے لیکن کیا کبھی ہم نے اس پر اللہ کا شکر ادا کیا ہے؟ ہم سوئی گیس کو بڑی نعمت سمجھتے ہیں کیونکہ اس سے ہمارا چولھا جلتا ہے لیکن وہ آکسیجن جس سے ہم زندہ ہیں اسے نعمت ہی نہیں سمجھتے۔ جب سوئی گیس بند ہو جاتی ہے اور بجلی چلی جاتی ہے تو ہمیں یاد آتا ہے کہ یہ بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ اگر گرمی میں ایک گھنٹہ بجلی چلی جائے تو بجلی کو نعمت سمجھتے ہیں لیکن سورج کے طلوع ہونے کو نعمت نہیں سمجھتے۔ رات کی آرامش کو نعمت نہیں سمجھتے، سانس لینے کو نعمت نہیں سمجھتے، گرمی اور سردی کو نعمت نہیں سمجھتے۔ آج پاکستان آشفتہ ہے۔ وہی عمومی نعمتیں جو ساری دنیا کو آسودگی سے میسر ہیں پاکستانیوں سے ایک ایک کر کے ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ سب ناشکری و ناقدری کی وجہ سے ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ امنیت و تحفظ خدا کی ایک نعمت ہے۔ جہاں شکر گزار لوگ نہ رہتے ہوں وہاں خدا ان نعمتوں کو اٹھا لیتا ہے۔

شکر غاصبین سے نہیں بلکہ شاکرین سے سیکھا جا سکتا ہے۔ حضرتِ فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا بتا رہی ہیں

---

[1]..... (گلستان - شیخ سعدی)

کہ راہِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غصب نہیں بلکہ شکر ہے۔ ہماری ساری دوڑ یہ ہوتی ہے کہ میرا اسٹور زیادہ بھرا ہوا ہو، میرا اکاؤنٹ سب سے زیادہ بھرا ہوا ہو، عمومی نعمتیں فراوان ہیں جو ایک ایک کر کے متاسفانہ ہمارے ہاتھ سے ضائع ہو رہی ہیں۔ بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا فدک کے چھن جانے پر بھی فرما رہی ہیں کہ میرا فدک میرے ہاتھ سے چلا گیا لیکن یہ ساری کائنات اور اس کی عمومی نعمتیں اللہ نے ہمارے ہی لئے پیدا کی ہیں۔

ابتدائی نعمتوں پر ثنائے خدا

حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا فرما رہی ہیں:

مِنْ عُمُوْمِ نِعَمٍ اِبْتَدَأَهَا،

اِبْتَدَأَهَا یعنی وہ نعمتیں جو خدا نے ابتداء میں عطا کی ہیں۔ ابتدائی عطا کے کئی معانی ہیں۔ اس جملے کا آسان ترین، سادہ ترین اور عام معنٰی یہ ہے کہ اے پروردگار ان عمومی نعمتوں پر تیری ثناء بجا لاتی ہوں کہ جو تو نے انسانوں کو پیدا کرنے سے پہلے عطا کی ہیں۔ یعنی اس سے پہلے کہ انسان دنیا میں آتا تو نے انسان کے لئے وہ نعمتیں پہلے سے ہی بنا کے رکھی ہوئی تھیں۔ خدا نے پہلے سے ہی ایک نظام بنا کے رکھا ہوا ہے اور ہم اس بنے ہوئے نظام کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔

نعمتوں میں منعم کو نہ بھولیں

کہتے ہیں کہ ایک کنجوس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو وہ بہت پریشان ہوا کہ اب اس بچے کو بھی کھلانا پڑے گا۔ پہلے دو آدمیوں کا خرچہ کم تھا جو اب تیسرا بھی آ گیا۔ چونکہ بخیلوں کی اپنی ایک خاص دنیا ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ بخیل قیامت میں چیونٹی کی شکل میں محشور ہوگا۔ چیونٹی سب سے زیادہ کماتی ہے لیکن اس ڈر کی وجہ سے کہ کہیں یہ ختم نہ ہو جائے سب سے کم کھاتی ہے۔ ورنہ جتنا کماتی ہے اگر اس کا آدھا بھی کھائے تو ہاتھی سے زیادہ بڑی ہوگی۔

چیونٹی بخیل ترین مخلوق اور بخل کا تجسم ہے۔ سارا سال مال جمع کرتی رہتی ہے۔ اگر اس کے بل

میں دیکھیں تو اس نے عجیب وغریب سٹور بنائے ہوئے ہیں لیکن ان میں سے کھاتی نہیں ہے۔ وہ سارا مال آخر میں ضائع ہوجاتا ہے مثلاً سیلاب آجاتا ہے، کوئی اور حشرہ کھاجاتا ہے یا کسی اور وجہ سے ضائع ہوجاتا ہے۔

اسی طرح بخیل کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو بہت پریشان ہوا لیکن اس نے دیکھا کہ بچہ اب ماں کا دودھ پینے لگا ہے تو وہ بہت خوش ہوا کہ چلو بچہ بھی ہوگیا اور اس پر کوئی خرچہ بھی نہیں ہے۔ کچھ عرصہ بعد بچہ بڑا ہوگیا اور اس کے دانت نکل آئے۔ دانت نکلنے کا مطلب یہ ہے کہ اب اسے دودھ نہیں بلکہ غلہ چاہئے لہٰذا پھر پریشان ہوگیا کہ اب تو خرچہ بڑھے گا۔ اس وقت اسے بتایا گیا کہ اے نادان! جس نے بچہ پیدا کیا ہے اور بچے کے منہ میں دانت پیدا کیا ہے اس نے بچے سے پہلے اس کے لئے دانہ پیدا کیا ہے۔ تجھے بچے کا دانت نظر آتا ہے لیکن وہ دانہ نظر نہیں آتا۔ اس کا رازق تو نہیں بلکہ خیر الرازقین ہے۔ اللہ نے ہمیں پیدا کرنے سے پہلے کائنات کو نعمتوں سے بھرا پھر سب سے آخر میں انسان کی خلقت شروع ہوئی۔ ملائکہ، جن، حیوانات، شجر وحجر پہلے پیدا کیے پھر انسان کو پیدا کیا۔ آخر میں کیوں پیدا کیا؟ اس لئے کہ جب انسان آئے تو یہ زمین نعمتوں سے بھری ہوئی ہو اور اس انسان کو کوئی پریشانی وخوف نہ ہو لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمیں اس معدے نے فراموش کروادیا کہ خدا نے اتنی نعمتیں عطا کی ہیں۔

اگر حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نہ ہوتیں تو ہمیں خدا کی نعمتوں کی طرف متوجہ کرنے والا کوئی نہ ہوتا بلکہ ہم بھی غاصبین میں سے ہوتے۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے اس جملہ کے گہرے معانی بھی ہیں لیکن یہاں انتہائی سادہ معنٰی بیان ہوا۔

بغیر مانگے دینے والا مانگنے پر کیا دے گا؟!

بغیر مانگے دینے والا مانگنے پر کیا دے گا؟!

ہمیں چاہئے کہ اللہ کے اس فرمان پر صدقِ دل سے ایمان لے آئیں:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ......[1]

---

[1]......(سورۃ غافر، آیہ ۲۰)

اور تمہارا پروردگار فرماتا ہے: مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔

ہم اس طرح ایمان لے آئیں کہ جو کریم پروردگار مانگے بغیر بہت کچھ دے رہا ہے وہ مانگنے پر کیا عطا نہیں کرسکتا۔ کیا یہ سب کچھ جو آج ہمارے پاس موجود ہے ہم نے خدا سے مانگ کے لیا ہے؟ کیا آپ نے خدا سے آنکھیں مانگی ہیں؟ عقل مانگی ہے؟ اعضاء و جوارح اور قوتیں مانگی ہیں؟ اگر ماں سے کہا جاتا کہ آپ کو اپنے بچے کے لئے کیا کیا چاہئے تو ہماری ماں اس وقت بہت کچھ بھول جاتی۔ کم از کم عقل مانگنا تو بھول ہی جاتی۔ اکثر مائیں بچوں کے لئے صرف گوری رنگت مانگتیں۔ ہمیں اللہ نے جو کچھ مانگے بغیر عطا کیا ہے یہ سب کا سب ابتدائی ہے اور جتنی بھی عمومی نعمتیں خدا نے دیں ان سے خصوصی نعمتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اگر ہم عمومی نعمتوں پر شکرِ خدا بجا نہ لائیں تو عمومی نعمتیں سلب ہو جائیں گی اور ان کے حذف ہونے سے خصوصی نعمتیں بھی چھن جائیں گی۔ جنابِ زہراء سلام اللہ علیہا متوجہ کر رہی ہیں کہ یہ معرفت و علم الہامِ خدا ہے۔

نعمتوں کی فراوانی کا اعتراف

آپ سلام اللہ علیہا نے خطبہ کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

وَ سُبُوْغِ الْاٰلَآءِ أَسْدَاهَا،

حمد و ثناء ہے خدا کی ان فراوان نعمتوں پر جو خداوند تبارک و تعالیٰ نے ہمارے لئے ہر سو عطا کی ہیں۔

سُبُوْغ یعنی فراوانی۔ یہ بھی قرآن مجید کی اصطلاح ہے۔ نعمتوں کی اتنی فراوانی کہ جسے انسان شمار نہ کر سکے۔ خدا نے فراوان، تہہ در تہہ اور حساب سے باہر نعمتیں دی ہیں لیکن انسان ان نعمتوں کی طرف متوجہ نہیں ہے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے پہلے فرمایا: ...... ''مِنْ عُمُوْمِ نِعَمٍ'' ...... اور اب ...... ''وَ سُبُوْغِ اٰلَاءٍ'' ...... کے الفاظ استعمال کئے۔ یہ فصاحتِ فاطمیؑ ہے۔ عُمُوْمِ کی جگہ سُبُوْغِ اور نِعَمٍ کی جگہ اٰلَاءٍ۔ اٰلَآءِ بھی نعمتوں کو ہی کہتے ہیں جیسے سورہِ رحمٰن میں ہے:

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ٥...... [1]

پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

چونکہ انسان ان نعمتوں کو جھٹلاتا ہے۔ یہ سورۂ رحمٰن جسے ہم بہت زیادہ جھوم جھوم کے پڑھتے ہیں اور وہ بھی مُردوں اور ہر مناسبت پر لیکن سورۂ رحمٰن کا پیغام تو سنیں کہ کہہ کیا رہی ہے؟ یہ توبیخ وسرزنش کررہی ہے کہ اے جن، اے انسان، اے ثقلان تم خدا کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے!

انسان کا نعمتوں کو جھٹلانا

ممکن ہے کہ ہم زبان سے نعمتوں کو نہ جھٹلائیں لیکن عمل سے جھٹلا رہے ہیں۔ جس نعمت کو انسان سمجھتا اور درک نہ کرتا ہو وہ اسے جھٹلا رہا ہے، جس نعمت کو سمجھ رہا ہو اور اس کو نعمت کے طور پر قبول نہ کر رہا ہو تو یہ نعمتِ خدا کو جھٹلا رہا ہے، جس نعمت کو اپنے رب کا احسان نہ سمجھتا ہو تو یہ جھٹلا رہا ہے، جس نعمت کو اس راہ میں استعمال نہ کرے جس مقصود کیلئے خدا نے دی ہے تو یہ نعمت کو جھٹلا رہا ہے اور تکذیب کر رہا ہے۔ جب باپ اپنے بیٹے کی توبیخ وسرزنش کرتا ہے تو کہتا ہے کہ تو میری کون کون سی بات کو ٹھکرائے گا؟ میں جو بھی بات کہتا ہوں تو اسے ٹھکرا دیتا ہے۔ تو کتنی نافرمانی کرے گا؟ کتنا ستائے گا؟ کتنی معصیت کرے گا؟ اے انسان تیرے چاروں طرف اللہ کی نعمتیں ہی نعمتیں ہیں لہٰذا تو اللہ کی نعمت کو جھٹلانے کے لئے بھی خدا کی نعمت ہی استعمال کرے گا۔ نعمت کو جھٹلانے کے لئے زبان استعمال کرو گے تو یہ زبان بھی اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے، اپنا ذہن استعمال کرو گے تو یہ ذہن بھی اللہ ہی کی نعمت ہے، کوئی حرکت کرو گے تو یہ حرکت بھی اللہ کی نعمت ہے، کوئی وسیلہ استعمال کرو گے تو یہ وسیلہ بھی اللہ کی نعمت ہے۔ انسان کس قدر گمراہ ہو جاتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو جھٹلانے کیلئے اللہ کی نعمتوں کو ہی استعمال کرتا ہے۔ جیسے بعض لوگ دین سے نکلنے اور دین کی مخالفت کیلئے دین کو استعمال کرتے ہیں۔

---

[1]......(سورۃ الرحمٰن۔ یہ آیت اس سورہ میں ۳۱ بار آئی ہے)

دین کے نام پر دنیاداری

استاد الاساتید علامہ طباطبائیؒ جیسی عظیم ہستی جو انقلابِ اسلامی کے چند دنوں بعد ہی اس دنیا سے رحلت کر گئی ان کا فرمانا ہے کہ سب سے بری دنیاداری وہ ہے جو دین کے نام پر کی جائے۔یعنی جو دنیا کے نام پر ہی دنیادار ہیں، جو دنیا کے چنگل واختیار میں ہیں اور جنہیں دنیا اغوا کر کے لے گئی ہے ان سے برے دنیادار وہ ہیں جو دین کے نام پر دنیاداری کر رہے ہیں۔جو خدا کی نعمتوں کو خدا کی مخالفتوں کے لئے استعمال کر رہے ہیں، خدا کے دین کو خدا کی معصیت کے لئے انتخاب کر رہے ہیں اور اللہ کی راہ سے لوگوں کو ہٹانے کے لئے اللہ ہی کی راہ استعمال کر رہے ہیں یہ سب سے بڑے ظالم ہیں۔یہود کے علماء کی سرزنش سب سے زیادہ اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے لوگوں کو دین سے دور کرنے کے لئے دین استعمال کیا، اللہ کے دین کو جھٹلانے کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کو استعمال کیا۔اس لئے ان سے کہا گیا:

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا......[1]

اور تھوڑی قیمت پر میری آیات کو فروخت نہ کرو......

تفکرِ قارونیت

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا عمومی نعمتوں کی فراوانی پر حمد وشکر بجالا رہی ہیں جبکہ ہم عمومی نعمتیں تو دور کی بات اپنی خصوصی نعمت کو بھی اللہ کی نعمت سمجھ کے یاد نہیں کرتے اور اس پر شکر نہیں بجالاتے۔ بلکہ ہم قارون بن جاتے ہیں۔قارون اسے نہیں کہتے جس کے پاس پیسہ بہت زیادہ ہو۔اگرچہ قارون کے پاس بہت زیادہ پیسہ تھا اور بعض نصوص کے مطابق اس کے خزانوں کی چابیاں اٹھانے کے لئے ایک بڑا لشکر چاہیئے ہوتا تھا لیکن فراوانیٔ مال قارون نہیں بناتی بلکہ قارون تفکر کا نام ہے۔ممکن ہے کہ ایک غریب، فقیر، نادار، عبادت گزار، طالبِ علم اور عالم

---

[1]......(سورۃ البقرہ، آیہ ۴۱)(سورۃ المائدۃ، آیہ ۴۴)

قارون ہوجائے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب ان میں تفکرِ قارونی پیدا ہوجائے۔ فکرِ قارونی یہ ہے کہ جب لوگ اس سے کہتے تھے کہ جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کر تو اس کا جواب یہ ہوتا تھا کہ یہ تو اللہ نے نہیں دیا بلکہ یہ تو میری اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي......[1]

یہ سب مجھے اس مہارت کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھے حاصل ہے......

یہ تو میرے اپنے علم، اپنی زحمتوں، اپنی کوششوں اور اپنی مشقتوں کا نتیجہ ہے۔ ایسی فکر والا انسان قارون بن جاتا ہے۔ جس کے پاس بہت کچھ ہے اور اس کے ذہن میں یہ ہے کہ یہ میں نے خود کمایا، خود بنایا اور خود بچایا ہے وہ قارون ہے۔ یہ ایک دفعہ بھول کے بھی اللہ کا نام نہیں لیتا کہ سب کچھ اللہ نے کیا ہے۔

سب نعمتیں خدا کی عطا

خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا ہے کہ ان باتوں کا تذکرہ لوگوں کے سامنے دہرائیں کہ خدا نے آپ کو کہاں پہنچا دیا:

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ○......[2]

کیا اس نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر پناہ دی؟ اور اس نے آپ کو ناواقف پایا تو راستہ دکھایا؟ اور آپ کو تنگدست پایا تو مالدار کر دیا۔

خدا نے آپ کو یتیم پا کر کہاں پہنچا دیا؟ آپ سائل تھے خدا نے آپ کو کہاں پہنچا دیا؟ یہ سب نعمتیں خدا نے دیں:

وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ○......[3]

---

[1]......(سورۃ القصص، آیہ ۷۸)
[2]......(سورۃ الضحیٰ، آیہ ۶-۸)
[3]......(سورۃ الضحیٰ، آیہ ۱۱)

اور اپنے رب کی نعمت کو بیان کریں۔

یعنی اے نبیؐ اب آپ کا کام کیا ہے؟ لوگوں کو یہ بتائیں کہ یہ سب کچھ اللہ ہی نے دیا ہے۔

پھر اس سورہ کے بعد فوراً ہی دوسری سورہ شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں تسلسل ہے۔ گویا کہ ایک ہی سورہ ہے۔

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ o وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ o الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ o وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ o ......[1]

کیا ہم نے آپ سے آپ کا سینہ کشادہ نہیں کیا؟ اور ہم نے آپ سے آپ کا بوجھ نہیں اُتارا۔ جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا ذکر بلند کر دیا۔

آپؐ لوگوں کو بتائیں کہ آپ کو سب کچھ ہم نے دیا ہے۔

قارون اور عبدِ خدا میں فرق

قارون اور عبدِ خدا میں یہی فرق ہے کہ بندۂ خدا ساری نعمتوں کی طرف متوجہ ہے اور ان نعمتوں کو خدا کی طرف نسبت دیتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی نے دیا ہے، اس میں میرا اپنا کوئی ہنر و کمال نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام و قارون میں یہی فرق تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو ملا انہوں نے کہا یہ خدا نے دیا ہے لیکن قارون کو جو کچھ خدا نے دیا تو قارون نے کہا یہ میں نے خود کمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جو کچھ تھا آپ نے فرمایا کہ یہ اللہ نے دیا ہے۔ آلِ رسول علیہم السلام کے پاس جو کچھ تھا فرمایا کہ یہ اللہ نے دیا ہے۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا یہی بتا رہی ہیں کہ یہ سب اللہ ہی نے دیا ہے۔ اللہ نے کیا دیا؟ عمومی نعمتیں، فراوان نعمتیں، بے تحاشا نعمتیں، نہ ختم ہونے والی نعمتیں اور عدد و شمار سے باہر نعمتیں خدا نے دیں۔ بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا شکر و حمد و ثناء کے ساتھ خدا کی نعمتوں کی طرف متوجہ کروا رہی ہیں کہ ہم جس طرف دیکھیں تیری نعمتیں ہی نعمتیں نظر آتی ہیں۔ یہ پرورش

---

[1]......(سورۃ الشرح، آیہ ۴-۱)

اس بی بیؑ کی تعلیم کا نتیجہ تھی۔ ہم یہ نہ سمجھیں کہ بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کے مدنظر اپنا ایک کھجوروں کا باغ ہی تھا اور کسی چیز کی طرف توجہ نہیں تھی۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہمیں کتنا عظیم مکتب ملا اور ہم بن کیا گئے؟ ابھی ہم میں اور اہل بیت علیہم السلام کی سیرت میں بہت فاصلہ ہے۔

بجا نعمتیں

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں:

وَ سُبُوْغِ اٰلَآءٍ أَسْدَاهَا،

اور وہ فراوان نعمتیں جو تو نے بجا عطا کی ہیں۔

یہاں بسا اوقات مترجم پیچھے رہ جاتے ہیں اور رہ بھی جانا چاہیے۔ ظاہری سی بات ہے کہ خطبہ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کا ہو اور مترجم مجھ جیسا طالب علم ہو تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس معرفت تک پہنچا جا سکے کہ جس نہج پر بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا خطبہ بیان فرما رہی ہیں۔

أَسْدَاهَا یعنی بجا دینا، درست دینا، برموقع دینا، برمحل دینا، اتنا دینا جس کی جتنی ضرورت ہے۔ اے پروردگار تو نے جتنی نعمتیں دیں وہ سب کی سب بجا عطا کی ہیں۔

بسا اوقات لوگ کسی کو ایسی چیزیں تحفہ میں دیتے ہیں جن کی انہیں ضرورت نہیں ہوتی مثلاً بعض جگہوں پر یہ رواج ہے کہ شادی میں دلہا و دلہن کو ضرورت کسی اور چیز کی ہوتی ہے لیکن انہیں دیتے کچھ اور چیز ہیں۔ حتیٰ ماں باپ بھی جہیز میں اسی طرح ہی کرتے ہیں کہ جتنی بھی بے جا چیزیں ہوتی ہیں اس کا بنڈل باندھ کے دلہن کو دے دیتے ہیں لیکن جس چیز کی اسے ضرورت ہوتی ہے وہ عطا نہیں کرتے۔ چونکہ وہ یہ سب کچھ دلہن کو نہیں دیتے بلکہ وہاں پر آنے والے مہمانوں کا منہ بند کرنے کے لئے کچھ چیزیں رکھتے ہیں تاکہ لوگ باتیں نہ بنائیں۔ تماشے اور نمائش کے لئے دلہن کا جہیز بناتے ہیں لیکن دلہن کی ضرورت کی کوئی چیز بھی اس میں نہیں ہوتی۔ یہ ہمارے بے جا رویے ہیں مثلاً اگر گرمیوں کا موسم ہے اور اسے پنکھا چاہیے تو پنکھا نہیں دیں گے

بلکہ ہیٹر خرید کے دے دیں گے یا ان کے پاس بجلی وگیس کا بل دینے کے لئے بھی توانائی نہیں ہے لیکن ڈیپ فریز رخرید کے دیں گے۔

بہت سارے جوان لڑکے ولڑکیاں موجود ہیں جن کی شادی کی عمر ہے لیکن ذہنی خرافات کی وجہ سے ان کی شادیاں نہیں ہورہیں۔ مثلاً لڑکے کی موچھیں سفید ہورہی ہیں لیکن والدین کہتے ہیں کہ ابھی اس کی شادی کی عمر نہیں ہوئی۔ باپ یہ سمجھتا ہے کہ میرا اہم عمر ہو تو اس کی شادی کروں۔ بعض اوقات مالی مشکلات کی وجہ سے کہ ابھی اس نے کمانا شروع نہیں کیا، لڑکا کمائے گا تو پھر اس کی شادی کریں گے، کتنا کمائے گا؟ روزگار لگا ہوا ہے تو کہتا ہے ابھی اس کی تنخواہ تھوڑی ہے، ابھی اس کی ترقی ہوگی تو پھر شادی کریں گے۔ لڑکی کی ابھی تعلیم مکمل نہیں ہوئی، ابھی فلاں کام نہیں ہوا۔ ان بے جا چیزوں کی وجہ سے دین کا ضروری فریضہ ادا نہیں ہوتا۔ یہ وہ خرافات ہیں جن کی وجہ سے زندگیوں میں گناہ بھی فراوان ہورہے ہیں، بے جادباؤ بھی ہیں اور خاندانوں کے اندر الجھنیں ومشکلات بھی۔ دیکھتے سب ہیں لیکن بیان کوئی نہیں کرتا۔ حتیٰ اپنے گھروں میں دیکھتے ہیں لیکن زبان پہ لانے کی جرأت نہیں کرتے۔ بجا ادا کرنا بہت ہی اہم ہے۔ بسا اوقات بعض بہت ہی مہربان ہوتے ہیں اور طالب علم کو موبائل ہدیہ دیتے ہیں کہ یہ بے جا عطیہ ہے۔ یہ طالب علم کیلئے نعمت نہیں بلکہ نقمت ہے۔ مختلف لوگوں مثلاً ایک طالب علم، ایک جوان، ایک خاتون، ایک مرد اور ایک بزرگ کو کیا ہدیہ دینا چاہیے؟ اس کے لئے عقل وشعور چاہیے تاکہ وہ دوسرے کو بجا عطا کرے۔

پس خداوند تبارک وتعالیٰ کی نعمتیں دینے میں یہ اصل بھی موجود ہے کہ خدا جو بھی عطا کرتا ہے بجا عطا کرتا ہے۔

ہماری اور معصومین علیہم السلام کی خواہشات میں فرق

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا فرمارہی ہیں کہ اے پروردگار تونے اتنی فراوان نعمتیں عطا کیں لیکن ان میں سے ایک ذرہ بھی بے جا عطا نہیں کیا۔ چونکہ خدا کی ذات علیم وبصیر ہے۔ اگر ہمیں کہا جائے کہ آپ حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا

کے لئے خدا سے کوئی چیز طلب کریں تو ہم کیا مانگیں گے؟ ہم کہیں گے کہ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی کوٹھی بہت بڑی ہونی چاہیے، ان کے پاس اونٹ، گھوڑے اور نوکر چاکر اور خدم کثیر تعداد میں ہونے چاہئیں، جوڑے اور جوتے بہت زیادہ ہونے چاہئیں۔ یہ وہ طلب ہے جو آج کے مرد و خواتین کی طلب ہوتی ہے لیکن جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کیا فرماتی ہیں؟ یہ سب کچھ اگر مجھے مل بھی جائے تو بجا نہیں ہے، کیوں؟ اس لئے کہ ہر ایک کو اس کے مقام کے مطابق ملنا چاہیے۔

آج امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ولادت پہ کیک کاٹے جاتے ہیں۔ جتنے دن گزرے ہیں اتنے ہی دنوں کا کیک کاٹا جاتا ہے مثلاً اگر چودہ سو سال گزرے ہیں تو چودہ سو پاؤنڈز کا کیک کٹ جاتا ہے۔ کیا علی علیہ السلام اس کیک کو پسند کرتے ہیں؟ دیکھیں یہ بے جا کام ہے۔ اگر امیر المومنین علیہ السلام کے ولادت کے دن دسترِ خوانِ علیؑ بچھا کر چودہ سو فقیروں کا پیٹ بھر و تو اس پر علی علیہ السلام کہیں زیادہ خوش ہوں گے۔ چونکہ کیک کاٹنا تو اسلامی سنت نہیں ہے بلکہ امپورٹڈ سنت ہے۔ ہم اسے اٹھا کر ائمہ علیہم السلام کے لئے بھی لے آئے ہیں۔ اگر آج ہم امیر المومنین علیہ السلام کا لباس تیار کرائیں تو کیسا لباس تیار کرائیں گے؟ شاہانہ لباس لیکن تاریخ میں ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام بازار سے ایک معمولی اور دوسرا قیمتی لباس خریدتے ہیں۔ قیمتی لباس جناب قنبرؓ کو دیتے ہیں اور فرماتے ہیں چونکہ تو ابھی جوان ہے لہٰذا یہ تیرے لیے جچتا ہے۔ اب میری عمر گزر چکی ہے لہٰذا میرے لیے معمولی لباس ہی کافی ہے۔ اگر ہم امیر المومنین علیہ السلام کے لئے جوتا بنوائیں تو کیسا بنوائیں گے؟ ایسا کہ جس پر امیر المومنین علیہ السلام کبھی نگاہ تک نہیں کریں گے چونکہ امیر المومنین علیہ السلام کے جوتے کے بارے میں تاریخ میں لکھا ہوا ہے کہ وہ ایسا جوتا تھا جس کے پیوند پر بھی پیوند لگے ہوئے تھے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی گھریلو مالی حالت

جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کا گھر اس قدر خالی تھا کہ بعض اوقات مہمان کو کھلانے کے لئے بھی کچھ نہیں ہوتا تھا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کی بات ہے، یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب فدک کی درآمد جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو

وصول ہورہی تھی، یہ اس زمانے کی بات ہورہی ہے کہ ابھی فدک غصب نہیں ہوا تھا بلکہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے اختیار وملکیت میں تھا اور اس کی ساری انکم (Income) جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو مل رہی تھی۔ اس زمانے میں بھی سیدہ سلام اللہ علیہا کے گھر بعض اوقات حتیٰ مہمان کے لئے بھی کچھ نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن مسجدِ نبویؐ میں ایک مہمان آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تمام اصحاب کی طرف دیکھ کر کہا کہ کون ہے جو اس مہمان کو ایک رات کیلئے اپنے گھر ٹھہرائے اور اسے کھانا کھلائے۔ حالانکہ وہاں بڑے بڑے مالدار اور سیٹھ بیٹھے ہوئے تھے لیکن کسی نے بھی سر نہیں اٹھایا کہ کہیں مہمان گلے نہ پڑ جائے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس مہمان کو لے کے جاتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مہمان آپ کے حوالے کر دیا۔ امیر المومنین علیہ السلام نے اسے گھر میں بٹھایا اور جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے پوچھا کہ گھر میں مہمان کے کھانے کے لئے کچھ ہے؟ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا نے فرمایا کہ آج تو اپنے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔ اب امیر المومنین علیہ السلام نے ایک شخص سے ایک دینار قرض لیا اور ابھی گھر کی طرف آرہے تھے کہ راستے میں اپنا ہی ایک ساتھی ملا اور اس نے کہا کہ یا علیؑ! میرے گھر میں آج بہت مشکل ہے کہ بچوں کے کھانے کے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔ میں اس لئے آیا ہوں تا کہ آج کی شب آپ سے کوئی مدد طلب کروں۔ امیر المومنین علیہ السلام نے وہ قرض لیا ہوا دینار انہیں عطا کر دیا۔

امام علی علیہ السلام کی قوت کا راز

مولانا روم کے بقول حضرت امام علی علیہ السلام کی قوت کا راز مطبخ میں نہیں ہے۔ علی ※ نے باورچی خانے سے قوت حاصل نہیں کی۔ استاد اور شاگرد یعنی مولانا روم اور علامہ اقبالؒ نے جو جملے امیر المومنین علیہ السلام کی شان میں کہے وہ بہت ہی خوبصورت ہیں۔ علامہ اقبالؒ معنوی شاگرد ہیں ورنہ بیچ میں ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس مضمون کی تکمیل کر دی اور فرمایا:

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر

کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری......[1]

جو کی خشک روٹی باعثِ قوتِ حیدری ہے۔

اصل میں مولا علی علیہ السلام نے نہ گندم سے قوت لی نہ جو سے بلکہ علی علیہ السلام نے اپنے رب سے قوت لی، یہ حضرت امام علی علیہ السلام کے ایمان کی قوت تھی۔ ہم بے جا کام کر کے کچھ اور بنا دیتے ہیں لیکن خدا جو بھی عطا کرتا ہے بجا عطا کرتا ہے۔

بیگانہ وار زندگی اور گمراہی کا آغاز

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا تو کائنات میں پھیلی ہوئی نعمتوں اور ان کی فراوانی پر ثنائے پروردگار بجا لا رہی ہیں لیکن ہم خداوند تبارک وتعالیٰ کے اس نظامِ کائنات میں اجنبی و بیگانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسی بیگانگی و اجنبیت سے انسان کی گمراہی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

گمراہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ کفر، منافقت، شرک اور فسق و فجور گمراہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان گمراہیوں کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ جب انسان اپنی خواہشات، لذتوں و غفلتوں میں مست و غرق ہو کر اس نظامِ ہستی میں اجنبی و بیگانہ وار زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ انبیائے کرام و ائمہ اطہار علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی تعلیمات کا حصہ ہے کی کہ انسان کو اجنبی و بیگانہ نہ رہنے دیں۔ بعد میں آنے والے شاگردانِ مکتبِ انبیاء علیہم السلام و شاگردانِ مکتبِ ائمہ علیہم السلام نے سب سے زیادہ کوشش یہی کی کہ انسان کی اس اجنبیت و بیگانگی کو ختم کریں۔ آخر میں یہ اجنبیت باعث بنتی ہے کہ انسان اپنے آپ سے بھی بیگانہ و اجنبی ہو جاتا ہے۔ آج اس زمانے میں دیکھیں تو لاتعلقی کا اوج ہے۔ انسان اس عالم میں لاتعلق ترین مخلوق کے طور پر زندگی بسر کر رہا ہے اور اس کی سب سے بڑی لاتعلقی خود اپنی انسانیت اور اپنے مقام سے ہے۔

علامہ اقبالؒ جیسے شاگردانِ مکتبِ انبیاء علیہم السلام و شاگردانِ مکتبِ وحی اس نکتہ کی طرف بخوبی متوجہ

---

[1]......(بانگِ درا- علامہ اقبالؒ، میں اور تو، صفحہ ۲۶۴)

ہیں کہ انسان کی گمراہی کے اسباب کیا ہیں؟ اس لئے انہوں نے اپنے مخاطبین اور آنے والی نسلوں کو اس علت سے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ......۱

یعنی یہ زمین، آسمان، کائنات، نظامِ ہستی، مخلوقات، گلزار، چمن وگلستان جو خدا نے سجایا ہے۔

یہ سب تیرے مطالعہ اور غور وفکر کے موضوعات ہیں۔ یہ سب تجھے دعوتِ فکر دے رہے ہیں لیکن ہم یہاں اجنبی بن کے رہتے ہیں۔ ہم فقط یہ دیکھتے ہیں میرے شکم کی اشتہاء کو ان میں سے کون سی چیز بھرتی ہے اور کون سی نہیں۔ انسان جب فقط شہوانی نگاہ سے گلزار ہست و بو مثلاً چاند، سورج وستاروں کو دیکھتا ہے تو اس سے اس کی شہوت کی تسکین پوری نہیں ہوتی لہٰذا ان سے اجنبی و بیگانہ ہوجاتا ہے۔

کائنات پر عارفانہ نظر

آپ کائنات کو عارفانہ نگاہ سے دیکھیں جس میں انسان کائنات کو اپنا سمجھتا ہے۔ قرآن مجید کو کھول کے دیکھیں کہ خود قرآن نے عالمِ غیب اتنا ذکر نہیں کیا جتنا عالمِ شہادت کا کیا ہے۔ کھیت، نہریں، بادل، بارشیں، دن، رات، سورج، چاند وستاروں سے لاتعلق اور اجنبی بن کر زندگی بسر نہ کریں۔

قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْأَرْضِ جَمِیْعًا......۲

وہ وہی اللہ ہے جس نے زمین میں موجود ہر چیز کو تمہارے لیے پیدا کیا......

جو کچھ اس زمین پر موجود ہے وہ تیرا ہے۔ ''لَكُمْ'' یعنی تیرے لئے ہے لیکن شہوانی و ہوس بازی کی

۱......(بانگِ درا - علامہ اقبالؒ، غزلیات، صفحہ ۱۰۸)

۲......(سورۃ البقرۃ، آیہ ۲۹)

نگاہ نے انسان کو اجنبی بنا دیا ہے۔ آج انسان انسان کو اپنا نہیں سمجھتا، مسلمان مسلمان کو اپنا نہیں سمجھتا، مومن مومن کو اپنا نہیں سمجھتا، قرابتدار قرابتدار کو اپنا نہیں سمجھتا۔ کیوں نہیں سمجھتا؟ ان شہوانی نگاہوں، ہوس بازی، طمع اور لالچانہ تعلقات کی وجہ سے۔ اگر انسان عارفانہ نگاہ سے دیکھے تو اسے ہر چیز اپنی نظر آئے گی چونکہ قرآن نے کہا ہے کہ سب کچھ تیرا ہے۔ یہ سب عمومی نعمتیں ہیں اور انہی کے طفیل وتوسط سے ہمیں خصوصی نعمتیں نصیب ہوئی ہیں۔ انسان ایک ایک چیز پر خدا کا شکر بجالائے۔

کلامِ سیدہ سلام اللہ علیہا میں نعمتوں کی خصوصیات

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے نعمتوں سے متعلق تین نکتے بیان فرمائے:

۱۔ نعمتوں کی عمومیت

۲۔ نعمتوں کی سبوغیت

۳۔ نعمتوں کی تمامیت

لیکن یہ تینوں جملے الگ الگ نعمتوں کے لئے بیان فرمائے۔

مِنْ عُمُوْمِ نِعَمٍ اِبْتَدَأَهَا، وَسُبُوْغِ اٰلَآءٍ أَسْدَاهَا، وَتَمَامِ مِنَنٍ اَوْلَاهَا،

نعمت، آلاء اور منن سب کو نعمت کہا جاتا ہے جبکہ ہر مالی چیز اور ہر کام میں آنے والی چیز کو نعمت نہیں کہتے بلکہ نعمت اس شے کو کہتے ہیں جو انسان کو مقصدِ حیات تک پہنچنے میں مدد وسہارا دے۔ جو چیز ہمارے اپنے سفرِ کمالی کیلئے معاون ثابت نہیں ہورہی اس کا شمار نعمتوں میں نہیں بلکہ وبال، رکاوٹوں، موانع اور نقمتوں میں ہوتا ہے۔ دعائے شریفِ کمیلؒ میں امیرالمومنین علیہ السلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ کچھ گناہ ایسے ہیں جو نعمتوں سے محرومی اور نقمتوں کے نزول کا سبب بنتے ہیں لہٰذا انسان ان گناہوں سے دوری اختیار کرے۔

اَلْآءِ سے مراد

وَسُبُوْغِ اٰلَآءٍ أَسْدَاهَا، وَتَمَامِ مِنَنٍ اَوْلَاهَا،

اور وہ وافر نعمتیں جو خداوند تبارک وتعالیٰ نے بجا عطا کی ہیں اور وہ عظیم نعمتیں جو متواتر و پے در پے بغیر وقفے کے خدا نے عطا کی ہیں، یہ کامل نعمتیں تو نے متواتر اور پے در پے عطا کی ہیں۔ اٰلَآءِ بھی نعمت کو ہی کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اٰلَآء کا ذکر ہے لیکن سورہِ مبارکہ رحمٰن میں کثرت سے ہے۔ سورۂ رحمٰن سورۂ اَلَآء ہے جس میں کئی مرتبہ اس کی تکرار ہوئی ہے:

فَبِأَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ٥......[1]

پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

جناب سیدہ سلام اللہ علیہا نے تیسرا لفظ منن کا استعمال کیا ہے۔ منن، منت کی جمع ہے۔ قرآنِ کریم میں خدا فرماتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ...... [2]

خدا نے منت عطا کی، ایمان والوں پر اللہ نے بڑا احسان کیا۔

اردو میں منت کسی کے سامنے جا کر التجاء کرنے کو کہتے ہیں جبکہ عربی میں منت کچھ اور ہے۔ ہم دین کی اصطلاحات عربی میں پڑھتے ہیں لیکن معنیٰ اردو میں کرتے ہیں یا یوں کہیں کہ الفاظ الٰہی دین کے ہیں اور انہیں معانی آبائی دین کے پہناتے ہیں۔

اردو زبان میں کہا جائے گا کہ خدا نے منت کی یعنی معاذ اللہ کسی کو آ کر راضی کیا، التجاء کی کہ مہربانی کریں، کرم کریں، لطف فرمائیں اور میرے لیے یہ کام انجام دیں جبکہ عربی زبان میں منت سب سے عظیم نعمت کو کہتے ہیں۔ نعمتوں کے مختلف درجات ہیں۔ جو نعمتیں بہت ہی عالی اور دوسری نعمتوں سے مافوق ہوں ان

---

[1]......(سورۃ الرحمٰن۔ یہ آیت اس سورہ میں ۳۱ بار آئی ہے)

[2] ......(سورۃ آلِ عمران، آیہ ۱۶۴)

کے عطا کرنے کو منّ کہا جاتا ہے۔ ''منّ''یعنی نعمت دینا۔ منت یعنی نعمتِ عظمیٰ۔ قرآن مجید میں یہ لفظ خداوند تبارک وتعالیٰ نے نعمتِ عظمیٰ کے لئے استعمال کیا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ٥......[1]

ایمان والوں پر اللہ نے بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاکیزہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے جبکہ اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔

خداوند تبارک وتعالیٰ نے نعمتیں وآلاء جن و بشر اور دیگر مخلوقات کو دیں لیکن منتیں فقط مومنین کو ہی عطا کیں۔ ان نعمتوں میں سے بھی سب سے عظیم نعمت وجودِ گرامی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ قرآن نے بعثت مبارکِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے عظیم نعمت قرار دیا ہے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ نعمتیں تین صفات رکھتی ہیں:

عمومیتِ نعم، سبوغیتِ نعم وتمامیتِ نعم۔

خدانے یہ نعمتیں ناقص نہیں بلکہ حد درجہ تمامیت واکمالیت کے ساتھ دیں۔

اتمامِ نعمت واکمالِ دین

اتمامِ نعمت واکمالِ دین

قرآن نے آیہ غدیر میں اس کا ایک نمونہ بھی ذکر کر دیا ہے:

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ......[2]

آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی......

---

[1]......(سورۃ آلِ عمران، آیہ ۱۶۴)

[2]......(سورۃ المائدۃ، آیہ ۳)

خداوند تبارک وتعالیٰ کی بعض نعمتیں تدریجی ہیں جو درجہ بدرجہ عطا ہوتی ہیں اور کچھ چیزیں یکجا دے دی جاتی ہیں۔جس طرح حیات ایک نعمتِ تدریجی ہے جو درجہ بدرجہ عطا ہوتی ہے۔ جوں جوں انسان کے اندر صلاحیت ،اہلیت ولیاقت پیدا ہوتی جاتی ہے اسی کے مطابق اس کو نعمت کا وہ درجہ عطا کر دیا جاتا ہے۔ جیسے علم نعمتِ تدریجی خدا ہے جو عام انسانوں کو یکجا نہیں دی جاتی کیونکہ ان کے اندر صلاحیت نہیں ہوتی۔ جب وہ ایک درجۂ علم کے قابل ہوتے ہیں تو وہ درجہ مل جاتا ہے پھر جب اگلے درجے کی قابلیت آتی ہے تو ایک اور بالاتر درجہ انہیں عطا ہوتا ہے اس طرح تدریجاً یہ نعمت اپنے کمال واوج تک پہنچتی ہے۔ دین بھی نعمتِ تدریجی ہے۔ خدا نے یہ نعمت یکجا نہیں دی بلکہ انسان کو تدریجاً کمال تک پہنچایا۔

حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے کے لوگوں کو دین کا پہلا مرتبہ عطا کیا گیا اس لئے کہ بشریت فکر وشعور کے لحاظ سے پرائمری سٹیج پر تھی۔ جوں جوں زمان آگے بڑھتا گیا درجہ دین بھی بڑھتا گیا۔ ہر نبی دین کا ایک درجہ لے کر آیا اس لئے کہ نسلِ انسان بتدریج قابل تر ہوتی جارہی تھی۔ پھر خداوند تبارک وتعالیٰ نے اپنے کامل ترین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے دین کا کامل ترین درجہ عطا کیا اور آیت نازل فرمائی:

اَلْیَوْمَ أَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ......

آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا......

دین وشریعت کا فرق

دین زیادہ نہیں ہیں بلکہ یہ شروع سے ایک ہی ہے اور قرآن نے بھی اسے بیان فرمایا ہے:

إِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَامُ......[1]

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے......

اگرچہ ہم اصطلاحی طور پر ادیان کا لفظ استعمال کرتے ہیں لیکن قرآن نے کہیں بھی ادیان کا لفظ

[1] ......(سورۃ آلِ عمران، آیہ ۱۹)

استعمال نہیں کیا۔ دین ایک ہے لیکن شریعتیں مختلف ہیں۔

عربی زبان میں شرعہ گھاٹ کو کہتے ہیں۔ دریا سے پانی لینے کی مخصوص جگہ ہوتی ہے ہر جگہ سے پانی نہیں لیا جاسکتا۔ وہ جگہ جہاں سے دریا تک لوگوں کی رسائی ہوتی ہے اس جگہ کو گھاٹ کہتے ہیں۔

دین ایک حقیقت کا نام ہے جس کا آغاز خلقت بشر سے ہوا اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری ہے لیکن اسی ایک حقیقت پر انسان کی نسلیں بدل رہی ہیں، اسی دریا پر اترنے والی نسلیں بدل رہی ہیں۔ جس طرح آپ کے ملک میں بہنے والے دریا اب کچھ تو خشک ہو گئے لیکن جو باقی ہیں ان پر کتنی نسلیں ابھی تک زندگی بسر کر چکی ہیں۔ دریائے سندھ جو صدیوں سے بہہ رہا ہے اس پر ہزاروں نسلیں زندگی بسر کر چکی ہیں۔ سب نے دریائے سندھ سے پانی پیا ہے لیکن سب نے گھاٹ اپنی اپنی بنائی ہیں۔ پس دریا ایک ہی رہا لیکن گھاٹ نسلوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا......[1]

ہم نے تم میں سے ہر ایک (امت) کے لئے ایک دستور اور طرز عمل مقرر کیا ہے......

ہم نے دین اسلام مقرر کیا اور اس سے ہدایت لینے کے لئے گھاٹیں مقرر کیں۔ ہر نسل کے لئے اس کا الگ حصہ و درجہ مقرر کیا اور اسی کو اس کی شریعت کہا جاتا ہے۔

آج کی رائج زبان میں کہیں گے کہ دین خداوند تبارک وتعالیٰ کی جانب سے ہدایت کا آئین ہے اور شریعت اس دین سے نکلی ہوئی آئیڈیالوجی کا نام ہے۔ ہر نسل کو ایک آئیڈیالوجی یا مکتبی دین کی تفسیر کی ضرورت ہے لیکن ایک الگ دین کی ضرورت نہیں ہے۔ انبیاء علیہم السلام ایک ہی دین کے اندر نئی شریعت لاتے تھے ان کی ضرورت، حالات اور زمانے کے مطابق انہیں دین کی نئی فہم عطا کرتے تھے۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح علیہم السلام کے زمانے کے لوگ ایک جیسے نہیں تھے بلکہ ان کے حالات، ضرورتوں اور تقاضوں میں فرق تھا لہٰذا ان کے لئے الگ دین نہیں بنایا بلکہ الگ شریعتیں بنائیں۔ دین ایک ہی

---

[1] ......(سورۃ المائدۃ، آیہ ۴۸)

تھا جو شروع آدمؑ کے زمانے سے ہوا اور مکمل خاتمؐ کے زمانے میں۔

خاتمیت سے مراد

ختم الرسلؐ یعنی جہاں پر انبیائے کرام علیہم السلام کا سلسلہ اختتام پذیر ہوا۔ ہم عموماً خاتمیت کا معنیٰ اینڈ (End) کرتے ہیں جبکہ خاتمیت کا مطلب اینڈ نہیں بلکہ تکمیل (Completion) ہے۔ چونکہ کوئی تحریر ختم وہاں ہوتی ہے جہاں مضمون مکمل ہوجاتا ہے، نہ کہ جہاں پہ روک دیں۔ جہاں روک دیں وہیں اینڈ ہوجاتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ جو چیز جہاں اینڈ و گئی ہو وہاں مکمل (Complete) بھی ہوگئی ہو۔ بہت سارے کام ایسے ہوتے ہیں جن کا اینڈ ہوجاتا ہے لیکن وہ ابھی مکمل نہیں ہوتے۔ خاتمیت کا معنیٰ انتہاء نہیں بلکہ اتمام واکمال ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام کے ذریعے جو عمارت تعمیر ہوئی تھی وہ، اذنِ الٰہی سے حضرت خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک سے تکمیل ہوگئی۔ حضرت خاتمؐ نے تمام انبیاءؑ کی محنت کو تکمیل کیا جبکہ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا نے حضرت خاتمؐ کی محنت کو تکمیل کیا یعنی اسے درجہ کمال تک پہنچادیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی مشاہدہ ہوا کہ وہ جہت جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دے کر گئے تھے اس جہت کی طرف رخ نہیں ہوا، وہ سمت ابھی معین نہیں ہورہی لہٰذا آپ نے امت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتائی ہوئی سمت موڑنا چاہا۔

پس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کے بعد اب نئی شریعت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ جامع ترین شریعت وآئیڈیالوجی قیامت تک آنے والی بشریت کی ضرورت کو پورا کرسکتی ہے لیکن اس شریعتِ خاتم کو ہر نسل کے ساتھ منطبق کرنے کے لئے بابِ اجتہاد رکھ دیا گیا ہے جس کا کام شریعت کو نسلوں کے ساتھ منطبق کرنا اور نسلوں کے تقاضوں کو شریعت سے دریافت کرنا ہے۔ چونکہ بہرحال نسلوں میں فرق تو آرہا ہے۔ چودہ سو سال پہلے کی انسانیت اور آج کی انسانیت میں فرق ہے لیکن اب شریعت نہیں بدلے گی بلکہ اجتہاد کے ذریعے آج کی نسل کی ضرورت کے مطابق اس شریعت کی تطبیق بدلے گی۔

اتم نعمتیں وہ ہیں جنہیں خداوند تبارک وتعالیٰ نے پہلی نسلوں کو ان کے درجات کے لحاظ سے عطا کیا

خاتمیت سے مراد

لیکن اس نسل پر خدا نے اپنا لطف واحسان کیا کہ نعمتوں کا اتمام بھی کیا اور اکمال بھی۔

شکرِ خدا، جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے سیکھیں

حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا فرما رہی ہیں کہ اے پروردگار میں ان نعمتوں کی تمامیت پر تیری شکر گزار ہوں۔ انسان جو غرقِ شہوات، اقتدار پرست، قدرت طلب، ہوس باز، لالچی، حاسد اور ہزاروں آفات میں مبتلا ہے اسے ان آفتوں سے نکالنے کے لئے اولیائے خدا معرفتِ توحید کا درس دیتے ہیں۔ جس وقت دوسرے لوگ دین کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے وسیلے کے طور پر استعمال کرنا چاہ رہے تھے اس وقت جناب سیدہ سلام اللہ علیہا نے ان کے سامنے خطبہ دیا اور نعمتوں کی تتمیم و اکمال پر پروردگار کا شکر ادا کر کے ان کی توجہ مبذول کروائی کہ خواہشات کی تکمیل نہیں بلکہ نعمتوں کی تمامیت باعثِ شکر ہونی چاہیے جبکہ ہم خواہشات کی تکمیل پر شکرِ خدا ادا کرتے ہیں۔ دس آدمیوں کا حق کھا کے کہتے ہیں:

هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ......[1]

یہ میرے پروردگار کا فضل ہے......

خواہشات کی تکمیل پر شکرِ خدا اور نعمتوں کی تکمیل پر شکرِ خدا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

آج کا انسان اگر شاکر بننا چاہے تو شکر کا طریقہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے سیکھے۔ اس ظلم و بربریت، قتل وغارت گری، جہالت، دہشت گردی، شیطانیت، استکباریت، استعماریت و استحماریت کے دور میں خدا نے مومنین کو پھر ولایت کا سایہ عطا کیا ہے۔ کیا ہمیں خداوند تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں شاکر نہیں ہونا چاہئے؟

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی مَا أَنْعَمَ، وَ لَهُ الشُّكْرُ عَلٰی مَا أَلْهَمَ، وَ الثَّنَاءُ بِمَا قَدَّمَ مِنْ عُمُوْمِ نِعَمٍ اِبْتَدَأَهَا، وَ سُبُوْغِ اٰلَاۤءٍ أَسْدَاهَا، وَ تَمَامِ مِنَنٍ اَوْلَاهَا،

اے پروردگار! ان نعمتوں پر تیرے شکر گزار ہیں جو تو نے تکمیل تک پہنچائیں اور وہ بھی متواتر،

---

[1]......(سورۃ النمل، آیہ ۴۰)

اَوْ لَاهَا یعنی پے در پے، موالات کے ساتھ، کسی وقفے کے بغیر ایک کے بعد ایک نعمت تو نے عطا کی۔

اس خطبے کے اندر بہت دقائق ہیں، یہ بہت ہی لطیف خطبہ ہے۔ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا نے تقریباً نو تعبیریں اسی ابتدائے حمد میں بیان فرمائی ہیں لیکن ہم معذور ہیں چونکہ گفتگو کا حق ادا نہیں ہو رہا۔

خدا کی نعمتوں کا شمار ممکن نہیں

اب تین جملے توصیفِ نعمت یعنی ان نعمتوں کی خصوصیات کے بارے میں ہیں:

جَمَّ عَنِ الْإِحْصَاءِ عَدَدُهَا،

یہ عمومی نعمتیں، یہ متواتر نعمتیں، یہ فراوان نعمتیں جو تو نے عطا کی ہیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کے عدد کو شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔ سارے جن و انسان مل کر بھی تیری نعمتوں کے عدد کو شمار نہیں کر سکتے۔

اگر انسان اپنے گھر کے چھوٹے سے ماحول میں موجود نعمتیں یا حتیٰ اپنے وجود میں موجود نعمتیں شمار کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ ایک تو یہ کہ یہ عدد میں بہت زیادہ ہیں۔ نعمت کے اندر نعمت ہے۔ ہر عضو ایک نعمت ہے مثلاً آنکھ ایک عضو ہے۔ یہ آنکھ جن اجزاء سے مل کر بنی ہے وہ اجزاء بھی نعمت ہیں۔ اگر ان اجزاء کو کھولیں تو ان کے اندر مزید چھوٹے چھوٹے اجزاء موجود ہیں۔ اس طرح تہہ در تہہ ان میں اتنے اجزاء موجود ہیں کہ آپ ان کی انتہاء تک نہیں پہنچ سکتے اور پھر اگر یہ نعمتیں دے کے رک چکی ہوتیں، سلسلہ عطائے نعمت ختم ہو گیا ہوتا تو جتنی نعمتیں اب تک آ چکی ہیں انہیں پھر حساب کیا جا سکتا ہے۔ آج انسان نے الیکٹرانک سسٹم سے بڑے سے بڑا حساب کرنے والی مشینیں بنا لی ہیں لیکن اللہ کی نعمتوں کو ان الیکٹرانک مشینوں سے بھی حساب میں نہیں لا سکتے۔ حساب کیوں نہیں کر سکتے؟ اس لئے کہ وہ چیزیں جو آ چکی ہیں ان کا تو حساب کیا جا سکتا ہے لیکن جب آپ حساب کرنے بیٹھتے ہیں، نیت کرتے ہیں تو اس نیت کرنے کے دوران خدا کی بے انتہاء نعمتیں تمہارے شاملِ حال ہو چکی ہوتی ہیں۔ آپ اتنی نعمتیں شمار نہیں کرتے جتنی آپ کو مزید عطا ہو چکی ہوتی ہیں۔

فَبِأَيِّ الَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ o ......[1]

پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا اور عارفانہ اظہارِ عجز

بعض روایات کے مطابق بہترین شکرِ نعمت یہ ہے کہ انسان عاجزی کا اظہار کردے کہ اے پروردگار تیری نعمتیں اتنی فراوان ہیں کہ میں ان کا شمار نہیں کرسکتا۔ یہ جو جناب سیدہ سلام اللہ علیہا فرما رہی ہیں:

جَمَّ عَنِ الْاِحْصَاءِ عَدَدُهَا وَنَآی عَنِ الْجَزَاءِ أَمَدُهَا، وَتَفَاوَتَ عَنِ الْاِدْرَاکِ أَبَدُهَا،

یہ عمومی، متواتر اور فراوان نعمتیں جو تو نے عطا کی ہیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کے عدد کو شمار کرنا ممکن نہیں ہے، ان نعمتوں کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ان کی جزاء نہیں دی جاسکتی، اور یہ نعمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی کوئی انتہاء معین نہیں کی جاسکتی۔

یہ عارفانہ عجز ہے اور بہترین معرفت ہے۔

جنابِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان تعقیبِ نماز کے مستحب اذکار میں سے ہے:

مَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ، وَمَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ......[2]

اے پروردگار جو تیری معرفت کا حق ہے اس طرح سے تیری معرفت حاصل نہیں ہوسکی۔

مَا عَرَفْنَاکَ یعنی میں نہیں پہچان سکا۔ جو تیری معرفت کا حق ہے وہ ادا نہیں ہوسکا۔

ائمہ اطہار علیہم السلام کا فرمانا ہے کہ سب سے عالی ترین معرفت خدا یہی جملہ ہے کہ

مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ......

اے پروردگار! جو تیری معرفت کا حق ہے وہ ادا نہیں ہوسکا، جو تیرے شکر کا حق ہے وہ ادا نہیں ہوسکا۔

---

[1]......(سورۃ الرحمٰن۔ یہ آیت اس سورہ میں ۳۱ بار آئی ہے)

[2]......(بحار الانوار-علامہ مجلسیؒ، الجزء ۶۸، صفحہ ۲۳)

امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

سُبۡحَانَکَ مَاعَبَدۡنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ...... [1]

نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے فرشتگانِ خدا کی بہت تعریف کی اور کہا کہ وہ تمام مخلوق سے زیادہ تیری معرفت رکھتے ہیں اور سب سے زیادہ تیرے مقرب ہیں لیکن اس مقام ومنزلت، عبادت میں فراوانی اور تیرے احکام میں عدم غفلت کے باوجود اگر تیری قدرت کے رازوں کی اس تہہ تک پہنچ جائیں کہ جو ان سے پوشیدہ ہیں تو یہ جان لیں گے کہ

لَمۡ یَعۡبُدُوۡکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَ لَمۡ یُطِیۡعُوۡکَ حَقَّ طَاعَتِکَ...... [2]

انہوں نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا اور نہ کماحقہ تیری اطاعت کی ہے......

پس:

مَاعَبَدۡنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ، وَ مَاعَرَفۡنَاکَ حَقَّ مَعۡرِفَتِکَ......

جو تیری عبادت و بندگی کا حق ہے وہ ادا نہیں ہوسکا اور جو تیری معرفت کا حق ہے وہ ادا نہ ہوسکا، یہ عاجزی حق ادا ہونے کے لئے بہترین ہے۔

کاہلانہ عجز سستی اور عارفانہ عجز معرفت کا نتیجہ

آپ یہ جملہ کثرت سے سنتے ہیں کہ کچھ لوگ کہتے ہیں: یہ کام ہم نہیں کر سکتے، یہ کام ہم سے ہو ہی نہیں سکتا۔ جس طرح ابھی ملتِ پاکستان کہہ سکتی ہے کہ پاکستان میں بہتری نہیں آسکتی، پاکستان میں تبدیلی نہیں آسکتی، پاکستان کے حالات ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ یہ عجز کا اظہار ہے لیکن یہ عاجزی سستی، کمزوری، ضعف، ذلت، ناتوانی، تھکاوٹ اور غلامی کا نتیجہ ہے۔ عموماً جن لوگوں کے اندر اعتمادِ نفس نہیں ہوتا، جن کے ارادے قوی

---

[1]......(صحیفہ سجادیہؑ، ملائک عرش کیلئے دعا)

[2]......(نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۷)

نہیں ہوتے، جن کے عزم بلند نہیں ہوتے، جن کی ہمتیں عالی نہیں ہوتیں وہ چھوٹے چھوٹے کام کرنے سے بھی اظہارِ عجز کرتے ہیں۔ اس وقت ہمیں اپنے ملک کے اندر لوگوں میں ضعف، کمزوری، ناتوانی اور اس کے نتیجے میں اظہارِ عجز کا عنصر نظر آتا ہے۔ چونکہ ساتھ احساسِ ضعف اور احساسِ زبونی و ذلت کر رہے ہیں لہٰذا کہہ دیتے ہیں کہ یہ کام ہم نہیں کر سکتے۔ آپ کسی سے کہیں کہ فلاں آدمی کا ایک کلو سامان اٹھا کے وہاں رکھ دو تو یہ کہتا ہے میں نہیں کر سکتا۔ یہ عاجزی ضعف، سستی اور ارادے کی کمزوری کا نتیجہ ہے لیکن ایک عارفانہ عجز ہوتا ہے جو کہ معرفت کا نتیجہ ہے۔ یعنی انسان ایک راہ پہ چل کر اس کی انتہاء تک پہنچتا ہے اور انتہاء پہ پہنچ کر اعتراف کرتا ہے کہ یہ کام میں نہیں کر سکتا۔ کیوں نہیں کر سکتا چونکہ اس کی عظمت کو دیکھتا ہے اور اپنی ناتوانی کو دیکھتا ہے پھر اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ کام میں نہیں کر سکتا۔

اگر کسی کو کہیں کہ بھائی یہ کتاب پڑھو تو وہ کہتا ہے کہ میں یہ کتاب نہیں سمجھ سکتا۔ یہ ارادے کی سستی و زبونی ہے لیکن ایک ایسا انسان ہے جو کتاب کو لے کر پڑھ لیتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ یہ کتاب میں نہیں سمجھ سکتا تو یہ عارفانہ عجز ہے۔ کتاب پڑھنے سے پہلے کہہ دینا کہ میں یہ نہیں سمجھ سکتا جاہلانہ عاجزی ہے۔ مثلاً بہت سارے سست انسان ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ خدا کی حقیقت کو نہیں سمجھا جا سکتا لیکن ان کی یہ عاجزی جاہلانہ عاجزی ہے۔ یہ درست جملہ ہے کہ حقیقتِ خدا کو درک نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ جاہلانہ، کافرانہ و مشرکانہ عاجزی کا جملہ ہے، کیوں؟ اس لئے کہ سمجھے بغیر، معرفت کی وادی میں اترے بغیر اور حقیقتِ خدا کے قرب کے بغیر کہہ رہے ہیں۔ جب خدا کی حقیقت کے قریب ہو کے دیکھو تو بھی یہی جملہ نکلے گا کہ خدا کی حقیقت قابلِ ادراک، قابلِ شناخت و قابلِ فہم نہیں ہے لیکن یہ عارفانہ جملہ ہے، یہ حقِ معرفت ہے۔ اس لئے کہ جب اس حقیقت کے قریب ہو کر اس کی عظمت و کبریائی اور اپنی محدودیت کو دیکھا تو انسان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلتا ہے کہ یہ ہستی قابلِ ادراک نہیں ہے۔

سُستی، سب سے بڑی نحوست

'میں یہ کام نہیں کر سکتا'، یہ جملہ سست عناصر کی زبان سے نکلتا ہے کہ جو اس وقت ہماری اجتماعی و

انفرادی حالت بن چکی ہے۔ سستی ہمارا کلچر، سوچ عبادت و دین بن چکی ہے۔ چونکہ سست ہیں لہٰذا سست ہونے کی وجہ سے آج ہمارا یہ حال ہوا ہے کہ ہم سست ترین ملت بن چکے ہیں۔ ارادے سست، افکار سست، ہمتیں سست، سوچیں سست، حرکات میں سستی، اہداف میں سستی غرضیکہ سستی سرایت کر گئی ہے۔ جنتری نے ہمیں بہت ساری نحوستیں بتائی ہیں کہ بلی بھی نحس ہے، کوا بھی نحس ہے، فلاں پرندہ بھی نحس ہے، جو صبح بولے وہ بھی نحس ہے، جو شام کو بولے وہ بھی نحس ہے۔ ہندوستان سے جنتری کے ذریعے بہت سی منحوس چیزیں آئی ہیں مثلاً فلاں فلاں دن نحس ہیں۔ یہ جنتری کی نحوستیں ہیں۔ دین ان میں سے کسی کو بھی منحوس نہیں سمجھتا۔ جانور یا حلال گوشت ہیں یا حرام گوشت لیکن ان میں سے کسی کو منحوس نہیں کہا جاتا۔

جو چیز دین کے اندر نحوست ہے اور وہ نحوست جب انسان کے اندر آجائے تو وہ انسان کو بھی نحس بنا دیتی ہے، وہ سستی ہے۔ سستی ام النحوست وام النحاس ہے۔ جس گھر کے اندر سست لوگ رہتے ہوں گے اس گھر کے اندر نحوست موجود ہے۔ جس ادارے کے اندر سست لوگ رہتے ہوں گے وہ ادارہ منحوسوں کا گڑھ ہے، جس ملک کے اندر سست قوم رہتی ہوگی وہ ملک نحوست کی آماجگاہ ہے۔ سستی انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہے۔ سستی انسان کو مقصد سے دور کر دیتی ہے۔ سستی انسان کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ سستی صلاحیتوں کا قبرستان ہے۔ دنیا میں بہت با صلاحیت انسان موجود ہیں لیکن سستی کی وجہ سے ان کی ساری صلاحیتیں غرق و نابود ہو چکی ہیں۔ انہیں خود نہیں معلوم کہ ان کے اندر کتنی صلاحیتیں موجود ہیں۔ یہ اپنی ایک روٹین بنا لیتے ہیں اور اسی روٹین کے اندر چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر جتنی صلاحیتیں موجود ہیں ان کا دو فیصد بھی استفادہ نہیں کر رہا۔ اب یہ میں کسی پر اتہام نہیں لگا رہا بلکہ کسی معیار پر گفتگو کر رہا ہوں۔ تمام انسانوں کی اٹھانوے فیصد صلاحیتیں زنگ آلود ہو کر ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ صلاحیتیں ظاہر ہی نہیں ہوتیں اور سامنے ہی نہیں آتیں۔

قوموں میں سستی کی سرایت

قوموں میں سستی فتنہ سامانیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ آج

پاکستان عالمی سطح پر دہشت گردی، کرپشن اور لوٹ مار میں نمبرون ہے۔ دنیا میں ہر سال ٹاپ سرمایہ داروں کی ایک فہرست جاری ہوتی ہے لیکن آپ دیکھیں کہ پاکستانی سرمایہ دار ملک کو اتنا لوٹنے کے باوجود اس لسٹ میں بھی اپنا نام ڈلوانے سے قاصر ہیں یعنی لوٹنے میں بھی سست ہیں۔ کم از کم اتنا تو لوٹو کہ دنیا کے نمبرون سرمایہ دار بنو، تم لوٹ کے بھی پیچھے ہو۔ چند سال قبل دنیا کے دس ٹاپ کلاس سرمایہ داروں کی لسٹ میں چھ بھارت اور باقی چار امریکہ، چائنا و روس کے تھے۔ پاکستان کی زمین قدرتی وسائل سے مالا مال ہے لیکن سست عناصر سستی کی وجہ سے بجلی بنانے سے بھی قاصر ہیں جبکہ لوگ بجلی کے انتظار میں ہیں۔ میں ایک جگہ گیا تو وہاں بائیس گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ ہوتی تھی۔ سردیوں کا موسم تھا لیکن فقط دو گھنٹے بجلی آتی تھی اور وہ بھی متصل دو گھنٹے نہیں بلکہ آدھا آدھا گھنٹہ کر کے لیکن وہاں کے لوگ تسلی سے بیٹھے رہتے تھے۔ جب آدھ گھنٹے کیلئے بجلی آتی تھی تو یہ اس وقت اتنے خوش ہوتے تھے کہ جشن کا سماں ہوتا تھا۔ پھر آدھ گھنٹے بعد جب بجلی چلی جاتی تو خاموشی سے بیٹھ جاتے تھے۔

سستی کے اثرات

اس وقت پاکستان میں کروڑوں کی تعداد میں شیعہ موجود ہیں لیکن سستی نے اس قوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے؟ اب تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ چن چن کے مارتے ہیں بلکہ اصلاً چننے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہر شہر میں قتلِ عام ہو رہا ہے۔ یہ سب سستی کا ہی نتیجہ ہے۔ ملک سستی کی وجہ سے غرق، قوم سستی کی وجہ سے غرق، مذہب سستی کی وجہ سے غرق۔ ملک میں کئی پارٹیاں موجود ہیں لیکن ان کے پاس سوائے اپنی سستی پر پردے ڈالنے کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ہر برائی ایک دوسرے کے گلے میں ڈالتے ہیں کہ فلاں کی وجہ سے کچھ نہ ہو سکا۔ یہ سیدھا اعتراف کریں کہ ہم سست ہیں۔ ہم سب کر سکتے تھے لیکن نہیں کیا، ہمارے ارادے سست تھے، ہمتیں سست تھیں، افکار سست تھے، عمل سست تھا۔ اس وجہ سے ہم نحوست میں مبتلا ہیں۔

پس سست آدمی کی زبان سے یہ جملہ نکلے کہ خدا کی نعمتوں کو شمار نہیں کیا جا سکتا تو یہ جاہلانہ عجز ہے لیکن ایک عارف جو خدا کی نعمتوں کا شناسا ہے، جس نے حقیقتِ نعمت کو درک کیا ہے، جس نے خدا کی تمام نعمتوں پہ نظر

ڈالی ہے اور پوری دنیا کو سمجھایا ہے کہ یہ نعمتیں خدا کی دی ہوئی ہیں، جس نے تمام نعمتوں کے عرفان کا حق ادا کر دیا ہے، جسے معلوم ہے کہ نعمتوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے اگر وہ کہے کہ خدا کی نعمتیں قابلِ شمار نہیں ہیں تو یہ عارفانہ عجز ہے۔

جَمَّ عَنِ الْإِحْصَاءِ عَدَدُهَا......

اے پروردگار تیری نعمتوں کے عدد کو کوئی شمار نہیں کر سکتا۔

نعمتوں کا وسیع دائرہ

وَنَآی عَنِ الْجَزَاءِ أَمَدُهَا،

اور تیری نعمتوں کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ کوئی اس کی جزا نہیں دے سکتا۔

حتیٰ کوئی انسان تیری ایک نعمت کی جزا نہیں دے سکتا۔ یعنی اس کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہے۔ بہترین شکرِ نعمت، نعمت کی شناخت ہے اور شناختِ نعمت کے بعد یہ اظہار ہے کہ اے پروردگار تیری نعمتیں اس قدر فراوان ہیں میں ان کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔

اَمَدُ، دائرۂ نعمت کو کہتے ہیں۔ نَآی یعنی بعید ہونا، دور ہونا، دسترس سے باہر ہونا۔ دائرۂ نعمت اتنا وسیع ہے کہ اس کا شمار میری عقل و فہم کی دسترس میں نہیں ہے۔

وَتَفَاوَتَ عَنِ الْإِدْرَاكِ أَبَدُهَا،

اور تیری نعمتوں کا سلسلہ اتنا متصل و مسلسل ہے کہ اس کی کوئی انتہاء و حد نہیں ہے کہ کہاں پہ ختم ہوگا۔

ابد یعنی نہ ختم ہونے والا زمانہ، جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ تیری نعمتوں کی ابد بہت دور ہے، کوئی بھی انسان اس کا احاطہ نہیں کر سکتا کہ تیری نعمتوں کا سلسلہ کس حد تک جاری ہے۔

محدود ذہن، محدود تصورِ کائنات

انسان نے اپنے چھوٹے سے ذہن سے کائنات، خالقِ کائنات اور نظامِ کائنات بنایا ہوا ہے۔ ایک

بہت معروف دانشور کا قول ہے کہ ہر انسان کی دنیا وکائنات الگ ہے۔سب ایک ہی کائنات میں نہیں رہتے بلکہ ہر ایک نے اپنی وسعت کے لحاظ سے اپنی ایک الگ کائنات بنائی ہوئی ہے۔کسی کی کائنات اس کا بستر ہے،کسی کی کائنات اس کا کمرہ ہے،کسی کی کائنات اس کا گھر ہے،کسی کی کائنات کچن ہے،کسی کی کائنات بیڈروم ہے،کسی کی کائنات اس کا آفس ہے،کسی کی کائنات اس کا مال ہے،کسی کی کائنات اس کی کتابیں ہیں غرضیکہ جہاں جو مشغول ہے وہی اس کی کائنات ہے اور جہاں سے لاتعلق واجنبی ہے وہ اس کا جہان شمار نہیں ہوتا۔ایسا انسان کنویں کا مینڈک ہے۔ہم سب نے اپنی چھوٹی چھوٹی سی دنیائیں آباد کر رکھی ہیں۔

ذہنی تصور خدا نہیں

لوگوں نے اپنے محدود ذہن سے معاذ اللہ خدا بھی بنالیا ہے۔اس کائنات کے اندر لوگ خود حاکم ہیں یا کسی بڑی مخلوق کو خدا متصور کرتے ہیں جیسے انسان بچپن میں ایسی باتیں کرتا ہے لیکن بڑا ہو کر بھول جاتا ہے یا اگر چھوٹے بچوں کو آپس میں باتیں کرتے دیکھیں تو ان کے ذہن میں آبائی دین کے باعث یہ تصور بیٹھا ہوتا ہے کہ خدا حجم اور طول وعرض میں بہت بڑا ہوتا ہے۔چونکہ ماں باپ نے انہیں ایسا ہی خدا سمجھایا ہے جبکہ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

كُلُّمَا مَيَّزْتُمُوهُ بِأَوْهَامِكُمْ فِي أَدَقِّ مَعَانِيهِ، مَخْلُوقٌ مَصْنُوعٌ مِثْلُكُمْ، مَرْدُودٌ إِلَيْكُمْ......[1]

جب بھی تم خدا کے معانی میں سے دقیق ترین معنیٰ کے ذریعے اپنے اذہان میں خدا کا جو تصور قائم کرتے ہو (وہ درحقیقت خدا نہیں ہے)،وہ تمہاری طرح کی ہی مخلوق ہے جو تمہاری ہی طرف لوٹ رہی ہے۔

یعنی تم اپنے ذہن کی دقتوں سے خدا کا جو تصور قائم کرتے ہو وہ خدا نہیں بلکہ تمہاری اپنی مخلوق ہے جبکہ خدا ایک حقیقت ہے نہ کہ ذہنی تصور۔اس حقیقت کا کہنا ہے:میں تیرے اندر ہوں،تیری رگ حیات سے زیادہ تیرے قریب ہوں،مجھے اپنے اندر لمس کر،مجھے اپنے اندر حس کر،مجھے اپنی چشمِ بصیرت سے دیکھ۔

[1]......(بحار الأنوار-الشيخ محمد باقر المجلسیؒ،الجزء ۶۶،صفحہ ۲۹۳،والجزء ۱۱۰،صفحہ ۳۴)

خدا کا دیدار چشمِ بصیرت کے ساتھ

امیر المومنین علیہ السلام سے کسی نے سوال کیا: کیا آپؑ نے اللہ کو دیکھا ہے؟ فرمایا:

وَيْلَكَ مَا كُنْتُ لِأَعْبُدَ رَبًّا لَمْ أَرَهُ......[1]

تجھ پر ویل ہو، تو مجھے اپنے جیسا سمجھتا ہے، تو یہ سمجھتا ہے کہ میں سنے سنائے خدا کی بات کرتا ہوں۔ میں ایسے خدا کی عبادت نہیں کرتا ہوں جسے دیکھا نہ ہو لیکن میں نے خدا کو آنکھ سے نہیں بلکہ ایمان کی بصیرت سے دیکھا ہے۔

فرزندِ زہراء سید الشہداء علیہ السلام دعائے عرفہ میں فرماتے ہیں:

مَتٰى غِبْتَ حَتّٰى تَحْتَاجَ اِلٰى دَلِيلٍ يَدُلُّ عَلَيْكَ......[2]

اے میرے پالنے والے تو غائب ہی کب ہوا ہے کہ میں تجھے ڈھونڈنے نکلوں۔

وہ جاہل ہیں کہ جن کا خدا گم ہو گیا ہے۔ جو گم شدہ خدا کی تلاش میں کبھی کتابوں، کبھی بحثوں اور کبھی مناظروں میں خدا کے ہونے پر دلیل مانگتے ہیں۔ یہ خود ایک اندھا پن ہے۔ جیسے دو چمگادڑیں دوپہر کو مناظرہ کر رہی ہوں۔ ایک کہے سورج ہے جبکہ دوسری کہے کہ سورج نہیں ہے۔ جو سورج اثبات کر رہی ہے وہ بھی اتنی ہی چمگادڑ ہے جو سورج کا انکار کر رہی ہے۔ آخر دوپہر کو سورج کے ہونے کی دلیل چاہیے؟ خدا غائب، اوجھل اور مخفی ہی کب ہوا ہے؟

---

[1]...... (دراسات في الحديث والمحدثين - هاشم معروف الحسيني > یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ وارد ہوئی ہے مثلاً نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۷ میں درج ہے۔ اسی طرح دیگر منابع یہ ہیں: (روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی - شہاب الدین محمود بن عبد اللہ الحسینی الألوسی الجزء ۳، صفحہ ۷۳) (أهل البيت في تفاسير أهل السنة) (مختصر بصائر الدرجات - الحسن بن سلیمان الحلی) (مستدرك سفينة البحار - العلامة آية الله الشيخ علی النمازی، الجزء ۳، صفحہ ۴۴۰) (إرشاد القلوب - الحسن بن أبی الحسن محمد الدّیلمیؒ)

[2]...... (مفاتیح الجنان) (بحار الانوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء ۶۴، صفحہ ۱۴۲، والجزء ۹۵، صفحہ ۲۲۶)

شدتِ نورانیت نے ہماری آنکھوں کو چندھیا دیا ہے۔ جب نور بہت شدید ہوجاتا ہے تو پھر وہ نور نظر نہیں آتا۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ ویلڈنگ کے شعلوں کو دیکھنے کے بعد آپ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آجاتا ہے۔ باقاعدہ منع کرتے ہیں کہ اس کی طرف نہ دیکھا کرو ورنہ آنکھیں خراب ہوجائیں گی۔ آنکھیں نورِ شدید کو متحمل نہیں کرسکتیں۔ نورِ خدا میں اتنی شدید نورانیت ہے کہ ہماری بصیرتیں چندھیا گئی ہیں۔ ورنہ خدا غائب کب ہوا ہے؟

لوگوں کی معرفتِ توحید، حقیقت سے دور

پس اللہ کی نعمتوں کی انتہاء کی تشخیص ناممکن امر ہے لیکن لوگوں نے اپنی ذہنی کاوشوں سے فرض کی ہوئی ہے یعنی جب ہم نہیں تھے تو کچھ بھی نہیں تھا اور جب نہیں ہوں گے تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بعض سوال بھی کرتے ہیں کہ خدا تو پھر اکیلا ہوجائے گا۔ جب فقط خدا تھا تو اس وقت خدا کا وقت کیسے گزرتا تھا؟ آج کل تو وہ مشغول ہے اور بندوں کی فعالیت دیکھتا رہتا ہے۔ جبرئیلؑ اور ملائکہ اللہ تک دیس دیس کی خبریں پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ سوال اسی لئے اٹھتے ہیں چونکہ ایسا خدا ہمارے ذہن کی مخلوق ہے۔ خدا نے یہ عالم اس لئے خلق نہیں کیا کہ معاذ اللہ خدا کا دل بہلتا رہے اور تنہائی سے نکل سکے۔ یہ وہ بڑی مخلوق ہے جس کو تو نے خدا کا درجہ دے دیا ہے جبکہ حقیقتِ خدا یہ نہیں ہے۔ یہ لوگوں نے اپنی جہالت و نادانی کے ذریعے خود بنالی ہے۔ آپ توحیدی معارف کی طرف آئیں۔

تشیع، مکتبِ توحید

تشیع کا دامن توحیدی معارف سے پُر ہے۔ میں یہ ذمہ داری کے ساتھ ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے عرض کررہا ہوں کہ توحید کا جس قدر اوج وعروج تشیع کے اندر موجود ہے اتنا پوری کائنات کے مکاتیب میں موجود نہیں ہے۔ آپ عرفانی مسلک لے آئیں، توحید کے بڑے بڑے دعویداروں کو لے آئیں

حتیٰ جنہوں نے توحید کی وجہ سے موحدین کا قتلِ عام شروع کیا ہوا ہے ان سے توحید کے بارے میں بات کر کے دیکھ لیں لیکن توحید کا عالی ترین عروج، معرفت کا عالی ترین ذخیرہ جو تشیع کے اندر موجود ہے کہیں اور نہیں ملے گا۔ تشیع کے ہر باب سے توحید ٹپک رہی ہے۔ تشیع توحیدی مذہب ہے۔ توحید تشیع کا تشخص ہے۔ توحید کا عروج تشیع کا امتیاز ہے۔ آپ نہج البلاغہ، خطبۂ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا، خطباتِ امامِ مجتبیٰ علیہ السلام و خطباتِ سید الشہداء علیہ السلام، صحیفۂ سجادیہ، تعلیماتِ صادقین علیہما السلام یا تشیع کے کسی بھی امامؑ کے خطبات اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو ہر طرف توحید کے جلوے نظر آئیں گے۔ جن منصف علماء نے ان متون کی طرف رجوع کیا اور انہیں یہ توحیدی جلوے نظر آئے تو پھر انہیں چھوڑ نہیں سکے۔ وہ ان کے اندر فانی ہوگئے۔ توحیدی جلوے تشیع سے سمجھیں، خطبہ فاطمیہؑ سے سمجھیں کہ خدا کی حقیقت کیا ہے اور خدا کی ذات کیا ہے؟

خطبہ فاطمیہ سلام اللہ علیہا میں نظم و ترتیب

اب خطبہ کا چوتھا حصہ شروع ہوتا ہے۔ خطبہ کے پہلے پیراگراف میں چار حصے ہیں اور پھر ان کے اندر تین تین جملے ہیں:

پہلا حصہ تین جملوں کے ساتھ حمد و ثنائے پروردگار پر مشتمل ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی مَا أَنْعَمَ، وَ لَہُ الشُّکْرُ عَلٰی مَا أَلْھَمَ، وَ الثَّنَاءُ بِمَا قَدَّمَ......

پھر تین جملے ان معارف کے بارے میں ہیں جن کی وجہ سے حمد، شکر و ثناء بجالا رہی ہیں۔

مِنْ عُمُوْمِ نِعَمٍ اِبْتَدَأَھَا، وَ سُبُوْغِ اٰلَآءٍ أَسْدَاھَا، وَ تَمَامِ مِنَنٍ اَوْلَاھَا،

نعمتوں کی عمومیت، نعمتوں کی فراوانی اور نعمتوں کی تمامیت پر یہ حمد و ثناء ہے۔

پھر اس کے بعد تین جملے بہت ہی مسجع و مکفہ ان نعمتوں کی خصوصیات اور معرفت سے عجز کے اظہار پر مشتمل ہیں:

جَمَّ عَنِ الْاِحْصَاءِ عَدَدُھَا وَ نَایٰ عَنِ الْجَزَاءِ أَمَدُھَا، وَ تَفَاوَتَ عَنِ الْاِدْرَاکِ أَبَدُھَا،

تیری نعمتیں اتنی وسیع وفراوان ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا، ان کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ان کی جزاء نہیں دی جاسکتی اوران کی انتہاء تشخیص نہیں دی جاسکتی۔

پھراس کے بعد تین جملے ان نعمتوں کے مقابل وظائف وفرائض کے بارے میں بیان فرمائے ہیں یا یوں کہیں کہ ان نعمتوں کی حکمت وفلسفہ کے بارے میں بیان فرمائے ہیں کہ یہ نعمتیں خدا نے دی کیوں ہیں؟

وَ نَدَبَهُمْ لِاِسْتِزَادَتِهَا بِالشُّكْرِ لِاِتِّصَالِهَا وَ اسْتَحْمَدَ إِلَى الْخَلَائِقِ بِإِجْزَالِهَا وَ ثَنّٰى بِالنَّدْبِ إِلٰى أَمْثَالِهَا،

اور خدا نے اپنے بندوں کو شکر کر کے نعمتیں زیادہ کرانے کی طرف رغبت دلائی ہے تاکہ نعمتیں مسلسل رہیں اور نعمتوں کے جزیل ہونے کی وجہ سے مخلوقات پر اپنی حمد کی فرمائش کیا اور پھر انہیں دنیوی نعمتوں کی طرح آخرت کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی جانب مائل فرمایا۔

یہ بہت اہم پہلو ہے لیکن اس کی وضاحت آپ کی خدمت میں انشاء اللہ پھر کسی اور فرصت میں ہوگی۔

محبت، مستحبات کی بنیاد

وَ نَدَبَهُمْ لِاِسْتِزَادَتِهَا بِالشُّكْرِ لِاِتِّصَالِهَا......

خدا نے اپنے بندوں کو شکر کر کے نعمتیں زیادہ کرانے کی طرف رغبت دلائی تاکہ نعمتیں مسلسل رہیں۔

خداوند تبارک وتعالیٰ نے مخلوق کو، اپنے بندوں کو دعوت دی ہے۔ اردو میں ندب کا لفظ مندوب کے طور پر استعمال ہوتا ہے مثلاً فلاں ملک کا مندوب۔ مندوب یعنی نمائندہ جو کہیں جا کر پیغام پہنچائے اور ترجمانی کرے۔ آج عربوں کی سیاسی اصطلاح میں بھی مندوب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مستحبات کو بھی ندب کہتے ہیں۔ ندبی عبادتوں کے بارے میں بارہا تاکید کی گئی ہے۔ واجبات بھی عظیم ہیں لیکن مستحبات عظیم تر ہیں۔ مستحبات وہ عبادت ہے جو انسان محبت کی بنیاد پر انجام دیتا ہے۔ استحباب و مستحبی سجدہ یعنی وہ سجدہ جو محبت کرواتی ہے۔ ہم مستحبات ونوافل کو اہمیت ہی نہیں دیتے، ان کی پرواہ ہی نہیں کرتے بلکہ چھوڑ دیتے ہیں۔

عادت بنانے کا نقصان

میں ایک علاقے میں گیا تو وہاں کے مومنین نے شکوہ کیا کہ ہمارے ہاں دو دو نمازیں ملا کے پڑھنے کا رواج اور روٹین بن گئی ہے۔ احادیث میں آیا ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے زرارہؒ نے دو نمازیں ملا کر پڑھنے کا مسئلہ پوچھا لیکن امامؑ نے اس مجلس میں جواب نہیں دیا بلکہ بعد میں قاصد بھیج کے جواب دیا۔

زرارہؒ امام صادق علیہ السلام کے بہت ہی جید صحابی ہیں۔ امامؑ نے کہا کہ شاید ہمارا یہ شاگرد ناراض ہو گیا ہو چونکہ جہاں اس نے سوال پوچھا تھا میں نے وہاں اس کو جواب نہیں دیا۔ البتہ وہاں جواب نہ دینے کی کچھ اور وجہ تھی۔ زرارہ نے پوچھا تھا کہ آیا ہم بغیر کسی مجبوری کے، بغیر کسی اضطرار کے ظہر وعصر، مغرب وعشاء ملا کر پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ امامؑ نے قاصد کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ آپ بغیر مجبوری کے بھی ملا کے پڑھ سکتے ہو لیکن اسے روٹین نہ بنانا۔ مجبوری کی وجہ سے تو پڑھ سکتے ہیں چونکہ تمام مکاتیب بشمول اہلِ سنت کے فقہاء کا فتویٰ ہے کہ اگر مجبوری ہو تو ظہر وعصر، مغرب وعشاء ملا کر پڑھ سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام نے یہ نمازیں ملا کے پڑھی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ تذکر دیا ہے کہ پڑھ تو سکتے ہو لیکن اسے روٹین نہ بنانا۔ روٹین بن جانے کا ایک ضرر یہ ہوا کہ نوافل حذف ہو گئے۔ خصوصاً ظہر وعصر کے نوافل عموماً نہیں پڑھتے۔ نمازِ ظہر کے فوراً بعد اقامت پڑھ کر نمازِ عصر پڑھی اور فوراً اٹھ کر چلے گئے۔ ہم مستحبات یعنی محبت آمیز عبادت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ واجبات اگر نہ پڑھیں تو سزا ملے گی لیکن جس عبادت اور جس سجدے کی طرف محبت کھینچ کے لاتی ہے وہ مستحبات ہیں۔

عادت بنانے کا نقصان

مستحب کا بے روح معنیٰ کرنا

ہماری ایک اور مشکل یہ ہوتی ہے کہ ہم نے مستحبات کا معنیٰ ایسا کیا ہے کہ انہیں بے معنیٰ کر دیا ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ آپ ان کا ترجمہ، معنیٰ اور تفسیر ہی ایسی کریں کہ ان کی روح ہی نکال دیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ مستحبات وہ ہیں جنہیں انجام دو تو بہتر ہے اور اگر انجام نہ دو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں ٹھیک ہے اگر کوئی حرج نہیں ہے تو ان کو انجام ہی کیوں دیں۔ چونکہ بے حرج ہیں اس لئے انجام نہیں دیتے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حرج ہے۔ محبت آمیز کام نہ کرنے میں حرج ہے مثلاً آپ اپنے بچے سے محبت نہ کریں تو اس میں حرج ہے یا نہیں؟ بچے کو بوسہ نہ دیں تو آپ جہنم نہیں جائیں گے لہٰذا یہ کام چھوڑ دیں۔ ہر چیز کا حرج فقط جہنم تو نہیں ہے۔ جس شخص کے ساتھ اظہارِ محبت ضروری ہے اس کے ساتھ اظہارِ محبت کریں، اگر نہیں کریں گے تو حرج ہے۔ حرج یہ ہے کہ وہ آپ کی محبت کا احساس نہیں کرے گا اور جب وہ آپ کی محبت کا احساس نہیں کرے گا تو وہ آپ کے ساتھ محبت انگیز سلوک نہیں کرے گا۔ جن بچوں کے ساتھ آپ محبت سے پیش نہیں آتے وہ بھی آپ کے ساتھ احترام سے پیش نہیں آتے۔ محبت کا جواب محبت ہے۔ خدا کی محبت آمیز عبادتیں کریں تاکہ خدا بھی آپ سے محبت کرے۔ اللہ کی محبت سے محروم ہو جانے میں کیا کوئی حرج نہیں ہے؟ شدید حرج ہے۔

خدا کا قانونِ تبدّل

اس وجہ سے خدا نے کہا ہے کہ جب تھکے ہوئے، خستہ حال اور اکتاہٹ والے مومنین دین میں آجائیں گے اور میرے دین کو چھوڑ دیں گے تو میں ان کے بدلے نئی قوم پیدا کروں گا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ٥......[1]

اے ایمان والو! تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ بہت جلد ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اللہ سے محبت کریں گے اور جن سے اللہ محبت کرے گا، مومنین کے ساتھ نرمی سے اور کافروں کے ساتھ سختی سے پیش آنے والے ہوں گے، راہ خدا میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا، بڑا علم والا ہے۔

جب تھکے ہوئے مومن اس طرح میری عبادتیں کریں گے تو میں انہیں چھوڑ کر نئی قوم لے آؤں گا۔

---

[1]......(سورۃ المائدۃ، آیہ ۵۴)

جو مجھ سے محبت کرتے ہوں گے اور میں ان سے محبت کرتا ہوں گا، جن کا میرے ساتھ رابطہ تاجرانہ نہیں ہوگا، جو ہمیشہ کچھ مانگنے نہیں آئیں گے، جو ہمیشہ خواہشات کا ڈھیر میرے سامنے نہیں لگائیں گے بلکہ وہ خدا سے محبت کی بنیاد پر آئیں گے اور اللہ بھی ان سے محبت کرے گا۔

علم محبتِ خدا میں رکاوٹ نہ بنے

کہیں ایسا نہ ہو کہ مدرسئی باتوں یعنی علمی باتوں سے محبت کم ہوجائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم مدرسہ میں کتاب سے محبت کی تعریف تو پڑھیں لیکن دل سے محبت کی حقیقت نکل جائے۔ حرج نہیں ہے کہ یہ واقعہ بھی بیان کردیں۔ یہ پنجاب کے ایک شہر کا حقیقی واقعہ ہے۔ کسی مومن کے ایک بہت ہی پاکیزہ فطرت والے بچہ کا روز کا معمول تھا کہ وہ نمازِ صبح سے ایک گھنٹہ قبل اٹھتا، مسجد کھولتا، نمازِ تہجد پڑھتا، نمازِ تہجد پڑھ کر صبح کی اذان دیتا، اذان دے کر پھر جا کر مولانا کو جگاتا اور پھر وہ آ کر جماعت کرواتے تھے۔ مسجد کا سارا دارومدار اس بچے پر تھا۔ اس بچے کی رغبت، شوق اور عشق دیکھ کر اس کے والد نے چاہا کہ کیوں نہ میں اس بچے کو دین کی راہ میں ڈال دوں اور پھر انہوں نے اسے اپنے شہر میں موجود دینی مدرسے میں بھیج دیا۔

ایک یا تین مہینے بعد جب بچہ چھٹی پر گھر آیا تو گھر میں آ کر کھانا کھا کے سوگیا۔ نمازِ تہجد کے لئے نہیں اٹھا، نمازِ صبح کے لئے بھی نہیں اٹھا بلکہ آرام سے آٹھ نو بجے اٹھا اور اٹھ کے ناشتہ مانگا۔ اب والد نے بچے کو دیکھا تو بہت پریشان ہوئے اور اس دن اس دکھ کی وجہ سے ڈیوٹی پہ نہیں گئے کہ یہ میرے ساتھ کیا ہوا؟ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ بیٹھا رہا تاکہ دیکھوں کہ اس کے بعد یہ کیا کرتا ہے۔ روٹین کے مطابق ناشتہ کرکے پھر کہیں جانے کا ارادہ کیا تو والد نے بٹھالیا کہ بیٹا آج تم نے نمازِ صبح نہیں پڑھی، کہا ہاں جی میں نے نہیں پڑھی اس لئے کہ میں سویا رہا۔ والد نے کہا: سویا رہنا تو کوئی عذر نہیں ہے۔ آپ کو تو صبح کی نماز پڑھنی چاہیے تھی۔ کہا: نہیں اگر سویا ہوا انسان نہ جاگے تو کوئی حرج نہیں ہے، اگر اس کی صبح کی نماز قضا ہو بھی جائے تو خدا معاف کردیتا ہے۔ اگر کوئی جاگتے ہوئے نہ پڑھے تو یہ گناہ ہے لیکن اگر سوتا رہے اور آنکھ ہی نہ کھلے تو اس میں کوئی

حرج نہیں ہے، بعد میں اس کی قضا کرلو۔ والد نے پوچھا کہ یہ کس نے بتایا؟ کہا: یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے اور میں نے مدرسے میں پڑھا ہے۔ اس کے لئے باقاعدہ فتویٰ ہے پھر ساتھ یہ بھی کہا کہ مدرسے میں تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ کچھ لوگ سوئے رہتے ہیں اور ان کی نماز قضا ہو جاتی ہے لیکن پھر بعد میں قضا پڑھ لیتے ہیں۔

معاملہ یہ ہوا کہ اس مدرسئی بحث نے بچے کے دل سے محبتِ خدا نکال دی۔ اس کی پاک فطرت کے اندر ایک نکتہ ڈال دیا، اسے جواز دے دیا اور بہانہ دے دے کر خدا سے دور کر دیا۔ ان مدرسوں کی تعلیم خدا پرست نہیں بلکہ پیشہ ور بناتی ہے۔

قرآن میں علماء کی صفت

قرآن مجید میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے علماء کی صفت یہ ذکر کی ہے:

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ......[1]

اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی اس سے ڈرتے ہیں......

عالم اسے کہتے ہیں جس کے اندر خوفِ خدا ہو۔ قرآن کے نزدیک بڑا عالم اسے نہیں کہتے جس کی معلومات سب سے زیادہ ہوں، جس کی کتابیں سب سے زیادہ ہوں، جس کے شاگرد سب سے زیادہ ہوں بلکہ بڑا عالم وہ ہے جس کے اندر خوفِ خدا سب سے زیادہ ہو اور خوف کی اپنی علامتیں ہیں۔ چونکہ خدا وحدہ لاشریک ہے، خدا کسی جگہ بھی شریک قبول نہیں کرتا حتیٰ خوف میں بھی شریک قبول نہیں کرتا لہٰذا جو خدا سے ڈرے اور پھر غیرِ خدا سے بھی ڈرے تو یہ مشرکانہ خوف ہے۔ حقیقی عالم وہ ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے کسی اور سے نہیں ڈرتا۔

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝......[2]

جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور

---

[1]......(سورۃ فاطر، آیہ ۲۸)

[2]......(سورۃ الاحزاب، آیہ ۳۹)

محاسبے کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔

محبتِ خدا دل سے نکلنا حرج ہے، محبتوں کی عبادت نہ کرنا حرج ہے، محبتوں کے سجدوں سے محروم ہوجانا بڑا شدید حرج ہے۔ فقط تجارت کے سجدوں اور غلامی کے سجدوں کو نہ دیکھیں بلکہ علویؑ سجدوں کو بھی دیکھیں۔ علویؑ سجدے محبت کے سجدے ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَا عَبَدْتُکَ خَوْفًا مِنْ نَارِکَ، وَلَا طَمَعًا فِیْ جَنَّتِکَ وَلٰکِنْ وَجَدْتُکَ أَهْلًا لِلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُکَ......[1]

میں نے تیری عبادت جہنم کی آگ کے خوف سے نہیں کی اور نہ جنت کی لالچ میں کی بلکہ میں نے تجھے لائقِ عبادت پایا تو تیری عبادت کی......

اے خدایا تو جنت نہ بھی بناتا، جہنم نہ بھی بناتا تو علیؑ پھر بھی تیری بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتا۔

جناب سیدہ سلام اللہ علیہا رسولؐ کی بیٹی ہونے کی وجہ سے فاطمہؑ نہیں بنیں بلکہ خدا کی معرفت وقرب کی وجہ سے فاطمہؑ بنی ہیں۔ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کس طرح سے خطبہ توحیدی بتا رہی ہیں؟

نعمتیں دینے کا فلسفہ

اب خطبہ سیدہ سلام اللہ علیہا اس مرحلہ میں ہے کہ خدا نے یہ نعمتیں کیوں عطا کیں؟

وَنَدَبَهُمْ لِإِسْتِزَادَتِهَا بِالشُّکْرِ لِإِتِّصَالِهَا......

''**نَدَبَهُمْ**'' یعنی خدا نے مخلوق کو بلایا۔

لِإِسْتِزَادَتِهَا بِالشُّکْرِ لِإِتِّصَالِهَا......

تو نے اس لئے نعمتیں دیں تا کہ تیرے بندے تیرے شکر گزار ہو جائیں۔

نعمتیں دینے کا فلسفہ

---

[1]......(بحار الأنوار-علامه مجلسیؒ، الجزء۶۷، صفحه۱۹۷)(مستدرك نهج البلاغة-آية الله العظمیٰ الشيخ هادی کاشف الغطاءؒ)

نعمت انسان کے اوپر ذمہ داری لے کر آتی ہے۔ خدا نے یہ نعمتیں اس لئے عطا کی ہیں تا کہ تجھے شاکر بنا دیا جائے۔ شاکر ہمارے لئے ایک لفظ ہے لیکن درحقیقت ایک اعلیٰ مقامِ انسانی ہے۔ یہ ہمارے نزدیک عادتوں میں سے ہے لیکن درحقیقت خدا کی طرف سے سلوک کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ علمائے اہلِ معرفت جنہوں نے انسان کے لئے سیر و سلوک کی منزلیں ذکر کی ہیں اس میں ایک منزل شکر بیان کی ہے۔ انسان خدا کے قرب میں ایک ایسے مقام پہ پہنچ جاتا ہے کہ جہاں وہ شاکر کہلاتا ہے۔

مفاتیح میں مناجات خمس عشر کے نام سے سید الساجدین علیہ السلام کی عرفانی مناجات موجود ہیں لیکن ہم انہیں بھی تجارت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مناجاتِ خمس عشر بہت ہی عالی مضمون کی دعائیں ہیں۔ کم از کم ہفتے میں ایک دفعہ ان مناجات کی تلاوت کریں اور ان کے معانی پر غور کریں۔ ان مناجات میں آپ دیکھیں گے کہ کس عاجزی کے ساتھ سید الساجدین علیہ السلام بارگاۂ خدا میں حاضر ہوتے ہیں۔ عملاً امام سید الساجدین علیہ السلام کے مذہب پہ آ جائیں۔ ہم امام چہارمؑ کو اپنا امام تو مانتے ہیں لیکن ابھی تک ان کی امامت میں نہیں آئے۔ اگر امامتِ امامِ چہارم میں آئے ہوتے تو آج تشیع سے بڑھ کر، ایک شیعہ سے بڑھ کر توحید کا پرچار کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ ان مناجاتِ خمس عشر میں سے ایک مناجات شاکرین کے نام سے موجود ہے۔ اس میں ملاحظہ کریں کہ شاکرین کی زبان کیا ہوتی ہے؟ شاکرین ہوتے کیسے ہیں؟ شاکرین سوچتے کیسے ہیں؟ شاکرین زندگی کیسے بسر کرتے ہیں؟ شاکرین بولتے کیسے ہیں؟ شاکرین کی زندگی کے آداب کیا ہوتے ہیں؟ شاکرین کا لہجہ کیسا ہوتا ہے؟

وَ اسۡتَحۡمَدَ إِلَى الۡخَلَائِقِ بِإِجۡزَ الِهَا......

خداوند تبارک وتعالیٰ نے حمد کا حکم دیا ہے کہ تسبیح و حمدِ خدا کرو لیکن کیوں؟ تا کہ نعمتوں کا سلسلہ متصل و جاری رہے، یہ کٹ نہ جائے، منقطع نہ ہو جائے۔

وَ ثَنّٰى بِالنَّدْبِ إِلٰى أَمْثَالِهَا......

صناعتِ ادبی کے لحاظ سے اب یہ خطبہ بہت اوج پہ جا پہنچا ہے۔ ایک صناعت لف و نشر مرتب ہے۔ لف و نشر صناعتِ عربی ہے جو اہلِ ادب ہی سمجھتے ہیں لہٰذا یہاں لوگوں کے ذائقوں کو خراب نہ کیا جائے۔

خداوند نے فرمایا ہے کہ آؤ میری حمد وتعریف کروتا کہ ان جیسی نعمتیں مسلسل عطا کرتا رہوں اور یہ سلسلہ نعمت رکنے نہ پائے۔

کفرانِ نعمت سے نعمتوں کا ختم ہوجانا

خدا بہت ساری نعمتیں اس وقت اٹھالیتا ہے جب بندے شاکر نہیں ہوتے۔ یہ بہت ہی اہم موضوع ہے کہ خدانے پاکستان کی سرزمین سے بہت ساری نعمتیں اٹھالی ہیں۔ مثلاً اس امت کے درمیان سے نعمتِ امن وامان، نعمتِ حکومتِ صالحہ، نعمتِ ہمدردی، نعمتِ اخوت، نعمتِ وحدت واتحاد، نعمتِ حسنِ ظن ونعمتِ اعتماد اٹھالی گئی ہیں۔ آج شیعہ شیعہ پہ اعتماد نہیں کرتا، سنی سنی پہ اعتماد نہیں کرتا، مسلمان مسلمان کو بھائی نہیں سمجھتا، شیعہ سنی میں نفرت ہے، پاکستانی پاکستانی کے ساتھ عناد رکھتا ہے۔ خدانے کتنی ایسی نعمتیں ہمارے درمیان سے اٹھالیں۔

جناب سیدہ سلام اللہ علیہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امت کو متوجہ کیا کہ خبردار! جب بھی تم نے خدا کی نعمتوں کا شکر چھوڑ دیا اسی دن خدا تم سے نعمتیں اٹھالے گا۔ وہ اخوت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہارے اندر پیدا کی تھی تو ایسا نہیں ہے کہ اب وہ نعمت تم سے واپس نہیں لے گا۔ یہ نعمتیں کسی سبب سے دی تھیں لیکن جس دن وہ سبب اٹھ گیا اسی دن یہ نعمتیں بھی اٹھ جائیں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے خدا نے امت کو وحدت جیسی نعمت دی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس امت کے اندر اخوت و بھائی چارہ قائم کیا، انہیں ایک دوسرے کا بھائی، خیرخواہ، ہمدرد اور ساتھی بنایا، انہیں ایک دوسرے پر ایثار کرنے والا بنایا، ایک دوسرے کا فداکار بنایا لیکن اسی امتِ رسول ؐ کا حصہ آج پاکستان میں رہ کر قتل وغارت گری عبادت سمجھ کر کررہا ہے۔ یہ قوم اخوت ووحدت کی شکرگزار نہیں ہوئی اس لئے خدا نے یہ نعمت اٹھالی۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے اپنے خطبہ کے ذریعہ قیامت تک آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دیا کہ الحذر!، ہوشیار! خبردار! یہ نعمتیں جو میرے بابا کی وجہ سے خدا نے تمہیں دیں اگر تم شاکر نہ ہوئے تو یہ تمہارے درمیان سے اٹھالی جائیں گی۔ بی بیؑ فرماتی ہیں کہ مجھے تمہارے اس پہلے اقدام سے نظر آرہا ہے کہ تم ناشکری

اور کفران کی راہوں پر چل نکلے ہو۔ پس راہِ فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا شکرِ نعمت وحبِ خدا ہے۔

آج بھی اگر ہم شاکر بن جائیں تو خدا وہ نعمتیں پھر سے ادا کر دے گا۔ جیسے انقلابِ اسلامی کی صورت میں خدا نے دی بھی ہے۔ پہلے ملتِ ایران ناشکری ترین ملت تھی۔ آج ہمارے ملک کے جو حالات ہیں، ان سے کہیں زیادہ بدتر وہاں کے حالات تھے۔ امریکہ، پاکستان کی نسبت ایران میں کہیں زیادہ مسلط تر تھا اور وہاں اس کا اثر ورسوخ بہت زیادہ تھا۔ یہ ملت کہیں زیادہ غلام وذلیل تھی۔ ان کے اندر تفرقہ، نفاق، کجروی، بے راہ روی، گمراہی، فسق وفجور اور فاحشہ تھا کیونکہ یہ شکرگزار نہیں تھے۔ حسینؑ حسینؑ کرتے تھے، حرم میں زیارات بھی کرتے تھے لیکن شاکر نہیں تھے۔ امام خمینیؒ نے ان میں بیداری پیدا کی، انہیں ولایت جیسی عظیم نعمت کی طرف توجہ دلائی، اس نعمت کی قدردانی وشکرگزاری کی طرف مائل کیا اور پھر دنیا نے دیکھا کہ اسی ملت نے اپنی سرزمین میں عظیم الشان انقلابِ اسلامی برپا کیا۔ ہمیں خدا کی بارگاہ میں شکرگزار ہونا چاہئے کہ اس نے ہمیں عصرِ امام خمینیؒ وعصرِ انقلابِ اسلامی میں پیدا کیا لیکن ساتھ ساتھ اپنی سرزمین میں اسی راہِ امام خمینیؒ، اسی نظامِ ولایت کیلئے کوششیں بھی کرنی چاہئیں۔

مقاماتِ شکر

شکر کے مختلف مقامات ہیں:

شکرِ نعمت کا پہلا مرتبہ: خدا کی نعمت کا تذکرہ زبان پہ لانا، زبان سے اظہار کرنا کہ یہ نعمتِ خدا ہے۔

شکرِ نعمت کا دوسرا مرتبہ: اس نعمت کو کام میں لانا، عمل میں لانا اور اختیار کرنا۔

شکرِ نعمت کا تیسرا مرتبہ: جو نعمت دی ہے اس سے متعلق ذمہ داری بھی ادا کرنا۔

حضرتِ بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا فرمارہی ہیں کہ نعمت انسان کے اوپر ذمہ داریاں ڈالتی ہے۔ کوئی نعمت ایسی نہیں ہے جو اپنے ساتھ ذمہ دایاں نہ لائی ہو۔ اگر خدا نے بچہ دیا ہے تو ذمہ داریاں بھی ساتھ لے کر آیا ہے۔ اگر خدا نے علم دیا ہے تو یہ علم ذمہ داریاں ساتھ لے کر آیا ہے۔ یوں نہیں کہ انسان علم لے لے ذمہ

ذمہ داریاں چھوڑ دے، بچہ لے لے ذمہ داریاں چھوڑ دے، منصب لے لے ذمہ داریاں چھوڑ دے، مال لے لے ذمہ داریاں چھوڑ دے۔ یہ سب کے سب غاصبِ حقِ فاطمہؑ ہیں کہ جنہیں خدا نے نعمتیں دی ہیں لیکن وہ اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کر رہے۔

بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا ان غاصبوں کو اسی چیز کی طرف متوجہ کر رہی تھیں کہ تم نے نعمتیں لے لیں لیکن ذمہ داریاں چھوڑ دیں۔ اب یوں تو نہیں ہے کہ فدک لینے والا غاصب ہو اور خمس کھانے والا غاصب نہ ہو۔ اگر اللہ نے آپ کو اولاد دی ہے تو اس سے متعلق ذمہ داریاں بھی دی ہیں۔ یہ تو شکرِ نعمت نہیں ہے کہ آپ حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا اور امام حسین علیہ السلام کا واسطہ دے کر اللہ سے اولاد لے لیں اور پھر اس کو لیبر بنا کر شیطانی نظام کیلئے بھیج دیں۔ ہم نے اللہ سے اولاد تو لے لی لیکن اسے بھیجا کہاں؟

محبتِ اہل بیت علیہم السلام اور اس کا حق

خداوند تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اتم اور کامل ترین نعمتوں میں ایک نعمت یہ عطا کی ہے کہ ہمارے دلوں میں محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و خاندانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ڈال دی ہے۔ اب اس محبت کی بھی ذمہ داریاں اور تقاضے ہیں۔ جناب سیدہؑ و اولادِ فاطمہؑ سے محبت کرنا کوئی معمولی نعمت نہیں ہے بلکہ اس کی قدر جانیں۔

ایک شخص امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر شکوہ کرنے لگا کہ مولاؑ میں فقیر ہوں، میں نادار ہوں، میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ امامؑ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تو بہت غنی ہے۔ وہ کہنے لگا میرے تن پہ کپڑا نہیں ہے، میرے پاس رہنے کے لئے گھر نہیں ہے، میرے پاس کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے لیکن آپؑ فرما رہے ہیں کہ میں بہت غنی ہوں۔ امامؑ نے فرمایا کہ تو یہ بتا کہ تیرے دل میں ہماری محبت ہے یا نہیں ہے؟ کہنے لگا مولاؑ دل میں تو آپؑ کی محبت ہے۔ امامؑ نے فرمایا کہ جس دل میں اہلبیت علیہم السلام کی محبت ہو وہ کبھی فقیر نہیں ہو سکتا بلکہ فقیر وہ انسان ہے کہ جس کے دل میں خدا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آلِ رسول علیہم السلام کی محبت نہ ہو۔

شیعہ غنی لوگ ہیں لہٰذا اس نعمت کا شکر ادا کریں۔ ایک شکرانۂ نعمت یہ ہے کہ مختلف مناسبتوں

سے ذکرِ ایامِ فاطمیہؑ، ذکرِ ایام علویؑ، ذکرِ ایامِ حسینیؑ وذکرِ ایامِ مہدویؑ کریں اور اس ذکرِ معرفت کو عام کریں۔ دنیا درِ اہلبیت علیہم السلام پہ آئے گی تو اسے خدا کی معرفت حاصل ہوجائے گی۔ جب تک لوگ درِ اہلبیت علیہم السلام پہ نہیں آتے اس وقت تک ہدایت نہیں پا سکتے۔

فصل پنجم:

خطبہ فاطمی میں شہادتِ توحید

اور

اس کے مراحل

شہادتِ توحید، اساس و رکنِ اسلام

رحلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد جب دین کا سب سے اہم ترین رکن منہدم ہوا اور لوگ اُس سے غافل ہوئے تو سیدہ طاہرہ سلام اللہ علیہا نے اپنے حماسی خطبے کے اندر اس نکتہ کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔ آپؑ نے سب سے پہلے معارف توحیدی پیش کئے جو اساس و رکن اسلام ہیں۔ خطبہ کا پہلا حصہ ہم بیان کر آئے ہیں۔

اُس کے بعد بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا شہادتِ توحید سے اپنے خطبہ کو جاری رکھتے ہوئے فرماتی ہیں:

وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ كَلِمَةٌ جُعِلَ الْإِخْلَاصُ تَأْوِيْلَهَا، وَضُمِّنَ الْقُلُوْبُ مَوْصُوْلَهَا (وَضَمَّنَ الْقُلُوْبَ مَوْصُوْلَهَا)، وَأَنَارَ فِي التَّفَكُّرِ مَعْقُوْلَهَا (درمتن بحار: وَأَنَارَ فِي الْفِكْرَةِ مَعْقُوْلَهَا)، اَلْمُمْتَنِعُ مِنَ الْأَبْصَارِ رُؤْيَتُهُ، وَمِنَ الْأَلْسُنِ صِفَتُهُ، وَمِنَ الْأَوْهَامِ كَيْفِيَّتُهُ......

میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور کوئی اُس کا شریک نہیں ہے۔ یہ کلمۂ توحید و وحدانیتِ خداوند تبارک وتعالیٰ وہ حقیقت ہے جس کی تاویل اخلاص ہے، اس کلمہ کی حقیقتِ عینی اخلاص ہے۔ جس کا ربط و تعلق دلوں کے ساتھ قرار دیا گیا ہے، اس کلمۂ نورانی توحید کی حقیقت دلوں کے اندر رکھ دی گئی ہے اور جس کے فہم و تصور سے عقلوں کو منور کیا گیا ہے، جس کا معنیٰ و مفہوم عقول کے لئے نورانیت قرار دیا ہے۔ وہ ذات جس کی رویت بصارت و آنکھ کے ذریعے محال ہے۔ جس کی صفت بیان کرنے سے زبانیں عاجز و ناتوان ہیں اور عقلیں و اوہام جس کی کیفیت و حقیقت کو درک کرنے سے عاجز ہیں۔

احیائے مکتبِ توحید

بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا سکوت توڑ رہی ہے اور اپنی ناراضگی کا اظہار کر کے انقلاب کی بنیاد رکھ رہی ہیں۔ آپؑ احیائے مکتبِ توحید، احیائے مکتبِ رسولؐ و احیائے مکتبِ ولایت ان الفاظ کے ساتھ کر رہی ہے:

وَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ......

میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ ایک ہے اور اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

ایک ایک لفظ جو بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا نے اس خطبے کے اندر بیان کیا ہے وہ تبرکاً نہیں ہے۔ جیسے آج کل رواج کہ ہے خطیب جب اپنا خطبہ شروع کرتا ہے تو بہت سارے حمد وثنائے پروردگار اور درود وسلام کے کلمات تبرکاً پڑھتا ہے ورنہ یہ جملے اُس کی غرض اور گفتگو کا حصہ نہیں ہوتے۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے یہ خطبہ اس لئے شروع نہیں کیا کہ اللہ کا نام لوں، شہادت دوں تا کہ برکت آجائے پھر بعد میں اصل بات کروں گی کہ یہ پراپرٹی میری ہے۔ اصل میں بی بی سلام اللہ علیہا کے یہی الفاظ مقصود تھے، یہی خطبہ سنانا مقصود تھا، یہ شہادت و گواہی سنانے گئیں تھیں۔ انقلاب کی بنیادیہیں پر رکھ رہی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ شہادت کیا تھی؟ بی بی سلام اللہ علیہا کس بات کی شہادت دے رہی ہیں؟ حقیقتِ شہادت کیا ہے؟ توحید کیا ہے؟ تاویلِ توحید کیا ہے؟ بی بی سلام اللہ علیہا کیا بیان کرنا چاہ رہی ہیں؟ کیا بنیادیں رکھ رہی ہیں؟ اپنے انقلابی وحماسی خطبے کے ذریعے کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟ کس بنیاد پر اپنے موقف کی بنیاد رکھ رہی ہیں؟ یہ گواہیاں وشہادتیں قیامِ فاطمیؑ میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

شہادت، دین میں داخلے کا پہلا قدم

حضرتِ بی بی زہراء سلام اللہ علیہا نے حمد وثنائے پروردگار کے بعد سب سے پہلی چیز گواہی وشہادت دی۔ شہادت رکن واساسِ دین ہے۔ قرآنِ مجید، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، نہج البلاغہ اور روایاتِ معصومین علیہم السلام میں شہادتِ وحدانیتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے لوگوں کو دین میں لانے کیلئے جو مراحل مقرر فرمائے ہیں اُن میں پہلا قدم شہادت ہے۔ انسان شہادت سے دین میں داخل ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی آئین ایسا نہیں ہے جس میں شہادت دینی پڑے۔ شہادت دین اور خصوصاً دین اسلام میں ہے۔

اللہ کی وحدانیت وعدالت، نبوت، امامت وقیامت کی شہادت وگواہی سے انسان کا قدم دین میں

بڑھتا ہے۔ اگر شہادت ادا نہ کر سکے تو دین سے باہر سمجھا جائے گا۔ وہ دین جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ترویج کیا اس کا آغاز شہادت سے کیا۔ پھر تدریجاً دین میں شہادت کی جگہ متبادل چیزیں آنا شروع ہوگئیں۔ شہادت کا معنیٰ ومفہوم فراموش ہوا، بدل گیا اور تدریجاً دین کی معلومات، دین کی معرفت اور دین کا علم جانشینِ شہادت ہوگئے۔ پھر آہستہ آہستہ معلومات اور علم ومعرفت نے بھی دین میں داخل ہونے کی جگہ چھوڑ دی اور اُس کی جگہ فقط اظہار و اقرارِ لسانی دین میں داخل ہونے کا معیار بن گیا۔ لا الہ الا اللہ زبان سے کہہ دو تو تم دین دار ہوگئے اگرچہ لا الہ الا اللہ کی معرفت نہ بھی ہو پھر بھی دین میں جا سکتے ہو اور پکے دین دار ہو چونکہ تم نے زبان سے کہہ دیا ہے جبکہ خود دین کہتا ہے کہ انسان کہنے اور معلومات سے نہیں بلکہ شہادت سے دین میں قدم رکھتا ہے۔ درِوُرودِ دین شہادت ہے۔

مقامِ شہادت، مقصدِ امت

دین کے ہر بنیادی رکن کو شہادت چاہیے۔ قرآنِ مجید میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے اُمت اسلامیہ کو اسی عنوان سے ممتاز قرار دیا ہے۔ مقصدِ امت مقامِ شہادت تک پہنچنا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا......[1]

یعنی ہم نے آپ کو اُمتِ وسط بنا دیا تا کہ تم اُمتِ شہداء بنو، تم لوگوں پر شہداء بنو اور رسول تم پر شہید بنیں۔

قرآنِ کریم میں خداوند تبارک وتعالیٰ امت سے فرما رہا ہے کہ تم ہو ہی شہادت کیلئے۔ سورۂ نساء میں فرمایا کہ تمہارا فریضہ شہداء بننا ہے۔

---

[1]......(سورۃ البقرہ، آیہ ۱۴۳)

مقامِ شہادت، مقصدِ امت

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ...... ۱

اے ایمان والو! انصاف کے سچے داعی بن جاؤ اور اللہ کے لئے شہداء بنو......

سورۂ مائدہ میں یہی مضمون تھوڑے سے الفاظ آگے پیچھے کر کے پھر قرآن نے ذکر فرمایا کہ تمہارا کام شہداء بننا ہے، تمہیں شہادت کے مقام تک پہنچنا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ...... ۲

اے ایمان والو! اللہ کیلئے بھرپور قیام کرنے والے اور انصاف کے ساتھ شہادت دینے والے بن جاؤ......

تم قوامین بنو، قائم بنو، اہل قیام بنو اہل قعود نہ بنو۔ جس طرح ایک اور آیت کریمہ جو امام خمینیؒ کے اصولوں میں سے ایک اصول بن گئی اس میں اللہ تعالیٰ کا فرمانا ہے:

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ أَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى...... ۳

یعنی کہہ دیجئے کہ میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ خدا کیلئے قیام کرو، اکیلے ہو تو بھی قیام کرو اگر دو ہو تو بھی قیام کرو۔ کس نے خدا کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اکیلے قیام کیا؟ فقط حضرت زہراء سلام اللہ علیہا نے۔

شہادت کے حصول کیلئے اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے سورہ مبارکہ حج میں فرماتا ہے:

مِلَّةَ أَبِيْكُمْ إِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ...... ۴

یہ تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے۔ اسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا اس (قرآن) سے پہلے اور اس (قرآن) میں بھی تاکہ یہ رسول تم پر گواہ رہے اور تم لوگوں پر گواہ رہو......

۱......(سورۃالنساء، آیہ ۱۳۵)
۲......(سورۃالمائدۃ، آیہ ۸)
۳......(سورۃسبا، آیہ ۴۶)
۴......(سورۃالحج، آیہ ۷۸)

جس طرح قرآن کا حکم ہے:

وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ......[1]

اور تم میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہئے......

تمہیں اُمت بننا ہے۔ یہ امر اور حکمِ خدا ہے کہ تم اُمت بنو۔ اُمت کیسے بنو گے؟ شہادت سے۔ پس ہمیں شہداء بننا ہے۔ ہم شہادت کا ترجمہ گواہی کرتے ہیں۔ اس مقام پر شہادت کے معنیٰ کو سمجھنے کی ضرورت ہے چونکہ دین میں داخل ہونے کی شرط، طریقہ اور پروسیجر (Procedure) شہادت ہے جو خود دین بتا رہا ہے۔ ہمیں دوسروں نے بتایا ہوا ہے کہ نعرہ بھی اعلیٰ حد تک پہنچا تا ہے، ذکر بھی اعلیٰ حد تک پہنچا تا ہے، اظہار بھی اعلیٰ حد تک پہنچا تا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن خود دِین و قرآن کیا کہہ رہا ہے:

كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ......[2]

اللہ کیلئے بھرپور قیام کرنے والے اور انصاف کے ساتھ شہادت دینے والے بن جاؤ......

كُوْنُوْا یعنی حکم ہے کہ شہداء ہو جاؤ۔ شہداء بننا واجب ہے۔ شہادت کے مقام پر پہنچنا فریضہ ہے۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝......[3]

اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے محمدؐ) آپ کو ان لوگوں پر بطور گواہ پیش کریں گے۔

تم وہ اُمت ہو جو شہداء محشور ہو گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تم شہداء کے اوپر شاہد بلایا جائے گا۔ ہمیں اس مقام تک پہنچنا ہے کہ دُنیا میں مریں تو شہداء ہوں اور اُٹھائے جائیں تو شہداء ہوں۔ ہم توحید پر دلیلیں دیتے ہیں لیکن پڑھ پڑھا کر بھی توحید کے شاہد نہیں بنے۔

مقامِ شہادت، مقصدِ امت

---

[1]......(سورۃ آل عمران، آیہ ۱۰۴)

[2]......(سورۃ المائدۃ، آیہ ۸)

[3]......(سورۃ النساء، آیہ ۴۱)

شہادت سے مراد

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں:

وَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ......

میں گواہی دیتی ہوں، میں شہادت دیتی ہوں وحدانیت خداوند تبارک وتعالیٰ کی۔

لفظِ شہادت اور اس کے مشتق الفاظ مثلاً شاہد، شہید، شہداء اور مشھود قرآنِ مجید میں فراوان استعمال ہوئے ہیں۔قرآن نے لفظِ شہادت غیب کے مقابلے میں استعمال کیا ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ......[1]

(وہ) پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا جاننے والا ہے......

عربی میں شہادت حضور و وجود کو کہتے ہیں یعنی ایسا وجود جو محسوس ہو، جو حاضر ہو، جو دیکھا جا سکے، جو غائب واوجھل نہ ہو بلکہ قابلِ حس وقابلِ لمس حد تک قابل درک وفہم ہو۔غیب بھی وجود ہے لیکن وہ وجود محسوس نہیں ہے۔اگر آپ کوئی چیز اس طرح سامنے لائیں جو دوسروں کو نظر آئے، جسے آنکھوں سے دیکھ سکیں، کانوں سے سن سکیں، ہاتھ سے لمس کر سکیں اور عقل سے درک کر سکیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ نے اُس چیز کو حاضر کر دیا ہے۔اُس شے کا وجود اتنا نمایاں ہو چکا ہے کہ اب وہ مشہود ہو کر قابل لمس، قابل حس وقابل فہم بن گیا ہے۔اس کے مقابلے میں ایسا وجود جو قابل لمس، قابل دید قابلِ حس وقابلِ درک نہیں ہے اس کا تعلق عالمِ غیب سے ہے۔

دوسرے الفاظ میں شہادت ایک ایسا عمل ہے کہ جس چیز کی آپ شہادت دے رہے ہیں اُس کو اتنا مجسم، نمایاں و ظاہر کریں کہ دوسروں کیلئے قابلِ دید، قابلِ لمس، قابلِ حس، قابلِ احساس و قابلِ فہم ہو جائے۔ہم اسے گواہی دینا کہتے ہیں لیکن اظہار کرنے کو گواہی دینا نہیں کہتے۔فرض کریں میں آپ کے سامنے کتاب شرحِ خطبہ حضرتِ زہراء سلام اللہ علیہا اس طرح پیش کرتا ہوں کہ آپ سب اسے دیکھ لیں تو میں نے

---

[1]......(سورۃ الانعام، آیہ ۷۳)(سورۃ التوبہ، آیہ ۱۰۵، ۹۴)(سورۃ الرعد، آیہ ۹)(سورۃ المومنون، آیہ ۹۲)(سورۃ السجدہ، آیہ ۶)(سورۃ الزمر، آیہ ۴۶)(سورۃ الحشر، آیہ ۲۲)(سورۃ الجمعہ، آیہ ۸)(سورۃ التغابن، آیہ ۱۸)

آپ کو کتاب کی شہادت دی ہے یعنی کتاب کو آپ کیلئے مشہود بنا دیا ہے، کتاب کا وجود اتنا ظاہر کیا ہے کہ اگر پڑھنا چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں، دیکھنا چاہیں تو دیکھ سکتے ہیں، لمس کرنا چاہیں تو لمس کر سکتے ہیں اور حاصل کرنا چاہیں تو حاصل کر سکتے ہیں۔

علم تصویر اُتارنا ہے مثلاً فرض کریں میں آپ کے سامنے ولایت کی تشریح وتفسیر کرتا ہوں اور اُس کے نتیجے میں آپ کو ولایت سمجھ آجاتی ہے یعنی ولایت کا معنیٰ آپ کے ذہن میں آجاتا ہے تو یہ ولایت کی شہادت نہیں دی بلکہ ولایت کی تشریح وتفسیر کی ہے۔ یہ تفہیمِ ولایت ہے نہ کہ شہادتِ ولایت۔ اسی طرح ولایت سنادینا، ولایت ولایت کرنا، ولایت پر تقریر وسخن رانی کرنا تاکہ دوسرے سنتے رہیں تو یہ تقریر ولایت ہے۔ یہ دونوں کام اگر میں کر بھی لوں تو بھی میں نے ابھی دین کے رکن کو انجام نہیں دیا ہے چونکہ دین مجھ سے اظہارِ قولی، معنیٰ، مفہوم وتفہیم نہیں مانگ رہا بلکہ شہادت مانگ رہا ہے۔

ولایت کی پہچان اور مقام

ابھی پاکستان میں شیعہ حیران ہے اور دو گروپ بن گئے ہیں کہ ہم ولایت کا کیا کریں؟ ''علی ولی اللہ'' کو کہاں رکھیں۔ عرصۂ دراز تک تو کتابوں میں رہا، اب خیال آیا کہ اسے کتابوں سے نکال کر نماز میں لے آئیں، کچھ عرصے بعد کہیں گے کہ نماز بھی اس کی مناسب جگہ نہیں بلکہ حج میں رکھیں، پھر اختلاف پیدا ہوگا کہ اسے روزے میں رکھیں اور پھر زکوۃ وخمس میں۔ پس کبھی ولایت کتابوں، کبھی منبروں، کبھی بحثوں، کبھی زبانوں، کبھی نمازوں، کبھی روزوں، کبھی حج اور کبھی زکوۃ وخمس میں لے جائیں گے۔ مقامِ ولایت اُس وقت تک سمجھ نہیں آئے گا جب تک ولایت کی شہادت نہیں دیں گے۔ جب ولایت کی شہادت دیں گے تو اُس وقت آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ ولایت کا مقام حکومت ہے۔

بعض اوقات آپ گھر میں ایسی چیز خرید کر لے آتے ہیں یا کوئی دوست آپ کو کوئی Antique قسم کی چیز تحفتاً دے دیتا ہے تو گھر والوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ہے کیا چیز اور اسے رکھنا کہاں ہے؟ یہ ڈرائنگ روم،

ڈائننگ روم، بیڈروم یا واشنگ روم کی چیز ہے یا کسی اور روم کی؟ چنانچہ آپ اسے ہر روز نئی جگہ رکھا دیکھیں گے مثلاً ایک دن ڈرائنگ روم میں رکھی ہوتی ہے، دوسرے دن ڈائننگ روم میں، تیسرے دن بیڈ روم میں اور چوتھے دن واش روم میں۔ پہلے اُسے سمجھیں اور گھر والوں کو بتائیں کہ یہ ہے کیا چیز تا کہ انہیں پتا چلے کہ اسے رکھنا کہاں ہے اور اس سے کرنا کیا ہے۔ اسی طرح ہم ولایت کو نہیں سمجھے۔ صدیوں تک کتابوں میں رہی پھر تقریروں میں لے آئے پھر خیال آیا کہ اسے اُٹھا کر نماز میں رکھیں شاید اس کا حق ادا ہوجائے لیکن جب دیکھا کہ یہاں بھی فٹ نہیں ہوتی تو اب حیران ہیں کہ کدھر رکھیں۔

پہلے ولایت کو سمجھیں کہ ولایت ہے کیا چیز؟ اقرار و تقریرِ ولایت سے ولایت کو مطلوبہ مقام نہیں ملتا بلکہ شہادت سے ملتا ہے۔

توحید شہادت کی طلبگار

توحید پر کتاب لکھ دینے اور توحید کی معلومات جمع کرنے سے انسان موحد نہیں ہوجاتا بلکہ شہادتِ توحید سے انسان موحد ہوتا ہے۔ زبان سے کہہ دینا شہادت نہیں ہے۔ توحید قول نہیں شہادت مانگتی ہے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں......[1]

آج تمام مسلمان فرقے زبان سے لا الہ کہتے ہیں لیکن انہیں کیا حاصل ہوا؟ اس لئے کہ توحید کی شہادت دینے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ توحید کی شہادت کون دے گا؟ جو اُمت کے اندر، انسانوں کے اندر وحدانیتِ خدا کو ایسا وجود دے کہ لوگوں کو آنکھوں سے وحدانیتِ خدا نظر آنا شروع ہوجائے، لوگ وحدانیتِ خدا کو لمس کرنا شروع کر دیں۔ لیکن ذاتِ خدا قابل لمس و قابل بصر نہیں ہے، اللہ کی ذات آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی پھر وحدانیتِ ذاتِ خدا، وحدانیت ربوبیتِ خدا، وحدانیتِ خالقیتِ خدا، وحدانیت حاکمیتِ خدا،

---

[1]......(ضربِ کلیم-علامہ اقبالؒ، صفحہ ۴۷)

وحدانیتِ مالکیتِ خدا آنکھوں سے کیسے دکھائی دے؟

اے بشر! تیری زندگی لوگوں کیلئے قابل مشاہدہ ہے، تیری زندگی قابلِ سماعت، قابلِ بصارت، قابلِ لمس و قابلِ فہم ہے، لوگ تجھے دیکھ سکتے ہیں، تیرا عمل دیکھ سکتے ہیں، تیرا نظام دیکھ سکتے ہیں لہٰذا تو اپنی زندگی ایسی بنا کہ تیری زندگی میں لوگوں کو خدا کی وحدانیت نظر آجائے۔ جب تیری زندگی میں لوگوں کو وحدانیتِ خدا نظر آئے تو نے خدا کی وحدانیت کی شہادت دے دی ہے۔ توحید کا حق اقرارِ لسانی، تقریر، کتابت اور تفہیم سے نہیں بلکہ شہادت سے ادا ہوتا ہے۔ انسان اس طرح سے موحد و معتقدِ عقیدۂ خدا بنے اور وحدانیتِ خدا اس طرح سے اختیار کرے کہ لوگ اسے دیکھ کر وحدانیتِ خدا کو آنکھوں سے دیکھیں، انسان نظر نہ آئے بلکہ خدا کی وحدانیت، ربوبیت، حاکمیت و مالکیت نظر آئے۔ یعنی اُمت اس طرح دین کو اپنائے کہ دوسروں کے سامنے دین خدا کو مجسم طور پر لے آئے۔ اگر انسان کی زندگی، نظام، ملک و مملکت دیکھنے سے لوگوں کو اللہ کی ربوبیت نظر آتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے خدا کی ربوبیت کی گواہی و شہادت دے دی ہے۔

وجود خود شہادت دیتا ہے

ابھی ہم نے زبان سے لا الہ الا اللہ کہا ہے لہٰذا توحید کو اپنا مقام و حق نصیب نہیں ہوا اور اسی لئے ہماری زندگی میں طاغوتیت آگئی۔ اس وقت ہمارے وجود اور ہماری زندگیاں گواہی دے رہی ہیں۔ ہر ایک کا وجود کسی شے کو قابل لمس بنائے ہوئے ہے مثلاً آپ جو کپڑے پہنتے ہیں ان کپڑوں سے اگر قربت نظر آتی ہے تو یہ کپڑے قربت کی گواہی دے رہے ہیں، اگر آپ کے کپڑوں سے امارت نظر آرہی ہے تو کہنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ آپ کا لباس گواہی دے رہا ہے کہ آپ امیر ہیں۔ اسی طرح آپ کی گاڑی، گھر، حالت، چہرہ، انداز اور گھریلو نظام گواہی دے رہے ہیں۔ ہم چپ رہیں لیکن ہمارا وجود کچھ نمایاں کر رہا ہے۔ جو کچھ ہم زبان سے کہہ رہے ہیں وہ اظہار ہے، جو کچھ ہم ذہنوں سے سمجھ رہے ہیں وہ مفہوم ہے اور جو کچھ ہمارے وجود سے ٹپک رہا ہے، نمایاں ہو رہا ہے اور لوگ محسوس کر رہے ہیں وہ ہماری گواہی ہے۔

مثلاً ایک شیعہ جب میدان میں آ کر ماتم وعزاداری کرتا ہےتو کیا لوگ اسے دیکھ کر یہ پوچھتے ہیں کہ ماتم کرنے والے بتاؤ تمہارا مذہب کیا ہے؟ مذہب پوچھنا ضروری نہیں کیونکہ اس کا عمل گواہی دے رہا ہے۔ ایک آدمی مسجد میں ہاتھ سینے یا پیٹ پر باندھا ہوا ہوتو کیا آپ اُس سے یہ پوچھتے ہیں کہ تم شیعہ ہو؟ اُس کے بندھے ہوئے ہاتھ گواہی دے رہے ہیں یعنی ہاتھ باندھنے نے اُس کے عمل اوراس کے مذہب کومحسوس اور قابلِ دید بنادیا ہے۔ایک شیعہ اگر بھول کر مسجد چلا جائے اور ہاتھ کھول کرنماز پڑھ رہا ہوتو اُس کے کھلے ہاتھ دیکھ کر کوئی نہیں پوچھتا کہ تم کون ہو؟ اگر کوئی عباءقباء پہنے ہوئے ہوتو کیا آپ اُس سے پوچھتے ہیں کہ آپ کون ہیں؟ البتہ لاہور میں پوچھ لیتے ہیں۔میں عباءقباء پہنے ہوئے تھا اور سر پر کالا عمامہ بھی تھا لیکن لاہوریوں میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی ذات کیا ہے؟ حالانکہ جان پہچان بھی تھی اور کاملاً آشنائی تھی لیکن پھر بھی پوچھا۔پس لاہور میں بعید نہیں ہے یہاں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔محرم میں آپ کالے کپڑے پہنتے ہیں اور ماحول کو سیاہ پوش بناتے ہیں تو کیا پوچھنا پڑتا ہے کہ یہ سیاہ پوشی کیوں ہے؟ اس سیاہ پوشی سے آپ سوگ کومجسم اور آنکھوں سے دیکھنے کے قابل بنادیتے ہیں۔آپ جس چیز کو بھی اتنا معرضِ رویت میں لے آئیں کہ دوسرے اسے چلتے پھرتے دیکھ سکیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے گواہی وشہادت دی ہے۔

پاکستان میں الیکشن کے اندر جو کچھ اُمت کرے گی یہ گواہی ہے۔آپ الیکشن میں میکاوَلیت کومجسم کریں گے یعنی اس کی گواہی دیں گے۔میکاوَلی (Machiavelli) ایک اٹالین پولیٹیکل سائنس کا ماہر امامِ سیاست ہے جس نے جمہوریت کا نظام وضع کیا اور کہا کہ جمہوریت وہ لچکدار نظام ہے جس میں آپ مکار بنو، دھوکا دو، شیطنت کرو، فراڈ کرو، فریب دو، جھوٹ بولو، درندگی کرو کہ یہ سب سیاست ہے۔یہ میکاوَلی کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے کہ اخلاق انسان کی کمزوری ہے۔کمزور لوگ بااخلاق ہوتے ہیں، ویلیوز (Values) کمزوروں کی علامتیں ہیں ورنہ طاقتور درندے ہوتے ہیں۔دوسرے الفاظ میں طاقت کی علامت درندگی ہے اور ضعف کی علامت اخلاق وویلیوز ہیں۔پس پہلے یہ دیکھیں کہ آپ گواہی کس چیز کی دے رہے ہیں؟

الفاظ، مفاہیم و معلومات شہادت نہیں

فقط توحید کے متعلق کتابیں پڑھ کر، لکھ کر یا الٰہی معلومات بچوں کو دے کر کوئی الٰہی نہیں ہوجاتا ورنہ جسے انڈیا کے بارے میں معلومات ہوں وہ ہندی اور جسے یونان کی معلومات ہوں وہ یونانی ہوجائے گا۔ اتفاقاً سوفسطائی نامی ایک مسلک و مذہب ایسا بھی گزرا ہے، ایسی الجھی ہوئی کھوپڑیاں علماء کے نام سے گزری ہیں کہ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت نہیں ہے۔ اسی طرح بعض دیگر شبہات بھی پیدا کئے۔ یہ بحث اہلِ فلسفہ جانتے ہیں کہ جب ہم کسی چیز کو سمجھتے ہیں تو ہمارے ذہن میں اس کی حقیقت نہیں بلکہ مفہوم آتا ہے۔ ورنہ جب ہم آگ کو سمجھتے ہیں تو ذہن گرم ہوجانا چاہیے اور جب برف کو سمجھتے ہیں تو ذہن ٹھنڈا ہوجانا چاہئے۔ بھینس کہہ دینے سے وہ ذہن میں نہیں آجاتی ورنہ اگر یہ بھینس ذہن میں آجائے تو کیا حشر ہوگا۔ جب ہم ایمان کا تصور کرتے ہیں تو مومن ہوجانا چاہئے اور جب کفر کا تصور کریں تو ذہن میں کفر آجانا چاہئے۔ اگر کوئی انسان سمجھنا چاہتا ہے کہ منافق کیا ہوتا ہے؟ تو جس طرح بولنے کیلئے لفظِ منافقت زبان سے ادا کرنا ضروری ہے اسی طرح سمجھنے کیلئے منافقت کا مفہوم بھی ذہن میں لانا ضروری ہے لیکن سوفسطائی کہتے ہیں کہ بیشک آپ منافقت منافقت کرتے رہیں آپ کے ذہن میں مفہوم بھی نہیں آئے گا ورنہ جس کے ذہن میں منافقت کا معنیٰ ہے وہ منافق ہوجائے گا لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ذہن میں کچھ بھی نہیں آتا۔

درحقیقت ہمارے ذہن میں کسی چیز کا مفہوم آتا ہے حقیقت نہیں آتی۔ ہماری کتابوں، زبانوں اور ذہنوں میں بھی اللہ کا نام و مفہوم آتا ہے لیکن جب تک ہم شہادت نہیں دیں گے موحد نہیں بنیں گے۔ جس طرح ہم پاکستانی کہیں بھی چلے جائیں لیکن چہرہ دیکھ کر لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ آپ پاکستانی ہیں۔ اگرچہ شناختی کارڈ آپ نے یونان کا بنایا ہوا ہو لیکن آپ کا چہرہ شہادت دے رہا ہوتا ہے کہ آپ وہاں کے نہیں ہیں۔ پاکستان میں رواج ہے کہ شناختی کارڈ میں چھوٹی عمر والے بڑی عمر لکھوا لیتے ہیں اور بڑی عمر والے چھوٹی۔ نادرا کو دھوکا دینا بھی پاکستانیوں کا ایک کام ہے چونکہ ہمیں داخلوں سے سروکار ہے۔ چہرہ دیکھو تو چالیس سال کا ہے لیکن شناختی کارڈ پر بیس سال کا لکھا ہوا ہے۔ آپ معلومات، تحریر اور اقرار کو مانیں گے یا شہادت کو۔ پس انسان

جب تک وحدانیت خدا کی گواہی نہیں دیتا مسلمان نہیں ہوتا۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا ایک ایسے طبقے کے سامنے جا کر کھڑی ہوئیں جس نے زبان سے لا الہ الا اللہ کہہ دیا تھا لیکن عمل خدا کی وحدانیت کی شہادت و گواہی نہیں دے رہا تھا۔اس لئے کہ جو نظام قائم کیا ہے یہ نظام الٰہی نہیں ہے۔ایسی حکومت قائم کرو جس کے قیام سے گواہی ملے کہ اس حکومت کے تحت رہنے والے خدا پرست ہیں۔

زبانی اظہار شہادت نہیں

زبانی اظہار شہادت نہیں

زبان سے اظہار کرنے کو شہادت و گواہی نہیں کہتے۔عدالتوں میں جو گواہی دیتے ہیں وہاں بھی جج پوچھتا ہے کہ کیا تم نے دیکھا ہے؟ جب وہ کہتا ہے کہ میں نے خود دیکھا ہے تو پھر جج وکیل سے کہتا ہے کہ جرح کرو۔وکیل جرح سے یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس گواہ نے جو منظر دیکھا ہے اُسے اس طریقے سے جج کے سامنے عدالت میں پیش کرے کہ گویا ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔اس لئے کہتے ہیں گواہی وہ دے جس نے آنکھوں سے دیکھا ہے اور وہ اس منظر کو ایسے بیان کرے کہ جو اس معرکہ و موقع پر موجود نہیں تھا اُس کو بھی یقین آجائے، وہ بھی یہ احساس کرنے لگے کہ میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے۔عدالت میں گواہی دیتے ہیں نہ کہ معلومات۔انفارمیشن اور گواہی میں فرق ہے لیکن عدالت میں دی جانے والی گواہی حقیقی نہیں بلکہ مجازی اور گویا شہادت ہے۔جو گواہی دین مانگ رہا ہے، جو شہادت توحید، رسالت و امامت کیلئے چاہئے وہ گویا عدالتی شہادت نہیں بلکہ حقیقی شہادت ہے۔یعنی آپ نے ان عقیدوں کو اپنی زندگی میں وجود عطا کرنا ہے۔ایسا وجود عطا کریں کہ دیکھنے والوں کو نظر آجائے کہ یہ توحید، رسالت اور امامت و ولایت کا معتقد جا رہا ہے۔

ابھی ہم نے بہت ساری چیزیں نمایاں کی ہوئی ہیں مثلاً لوگ شلوار قمیض دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ہندی جا رہا ہے، ہمارا وجود گواہی دیتا ہے کہ ہم ہندی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔شکل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ پاکستانی جا رہا ہے، لہجے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں، آپ انگلش بول رہے ہوتے ہیں لیکن دوسرا کہتا ہے کہ آپ پشتون ہیں کیونکہ آپ کا لہجہ گواہی دے رہا ہے یعنی آپ کی علاقائیت

آپ کے لہجے میں مجسم ہوکر سامنے آ گئی ہے۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں گواہی ہو وہاں معلومات اور فارم فل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

کائنات کا ہر ذرہ وحدانیتِ خدا کا گواہ

جہانِ ہستی کی ہر چیز اس بات پر گواہ ہے کہ وہ وحدہ لاشریک ہے۔ اگر کوئی دیکھنے والا ہو تو ہر موجود اپنے وجود میں خدا کی وحدانیت کو نمایاں کر رہا ہے۔ بقول مولانا روم:

ہر گیاھی کہ از زمین روید
وحدہ لا شریک لہ گوید

ہر پودا جو زمین سے نکلتا ہے وہ اپنے وجود سے وحدہ لاشریک کہہ رہا ہے۔ اُس کا وجود میں آنا گواہی ہے۔ اگر خدا کی ذات وحدہ لاشریک نہ ہوتی تو کوئی چیز موجود نہ ہوتی۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللهُ لَفَسَدَتَا ......[1]

اگر اس آسمان و زمین میں اللہ کے سوا دوسرا خدا ہوتا تو دونوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

اگر خدائے واحد نہ ہوتا، الٰہ ایک نہ ہوتا تو نہ زمین ہوتی نہ آسمان اور نہ ہی اُن کے اندر کوئی چیز ہوتی بلکہ فساد، نیستی، نابودی، عدم، ظلمت و تاریکی ہوتی۔ فسادِ عالم سے مراد اخلاقی فساد نہیں بلکہ فسادِ عالم یعنی یہ کائنات موجود نہ ہوتی۔ ان کا ہونا اُس کی وحدت پر گواہی و شہادت ہے۔

مومنِ مشرک کون؟

انسان نے دو گواہیاں دینی ہیں ایک اپنے ہونے سے اور ایک گواہی اپنے شعور، آگہی، عمل اور رویے سے۔ بعنوانِ رب خدا کے ایک ہونے کی گواہی سب سے دشوار گواہی ہے۔ اس لئے قرآنِ مجید میں

---

[1]......(سورۃ الانبیاء، آیہ ۲۲)

اکثریت کو جو زبان سے اظہارِ ایمان کرتی ہے مشرک کہا گیا ہے:

وَمَا یُؤْمِنُ أَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ إِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ٥......[1]

اور ان میں اکثر لوگ اللہ پر ایمان لائے بھی ہیں تو اس کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں۔

یہ نہیں کہا کہ جو اکثریت بت پرست، ملحد و خدا فراموش ہوگئی ہے بلکہ کہا کہ یہ اکثریت جو ایمان لائی ہے مشرکانہ ایمان لائی ہے۔ ان کا ایمان شرک آلود ہے۔ یعنی زبان سے کہہ رہے ہیں کہ اللہ ہے، ان کے دل میں بھی خدا ہے لیکن ان کا عمل وحدانیتِ خدا کی گواہی نہیں دیتا۔ ان کا عمل، زندگی، چال چلن، رویے، ردِعمل، عکس العمل، انتخاب، نظام، توقعات، اُمیدیں، خوف، تعلقات، روابط اور وابستگیاں مشرکانہ ہیں۔

یہ لا الہ الا اللہ کو منصۂ شہود تک نہیں پہنچا سکے۔ یہ عمل سے لا نہیں کہہ سکے بلکہ ان کے عمل میں ہاں ہے۔ انہوں نے عمل میں خدا کے ساتھ شریک ٹھہرائے ہیں۔ اس لئے:

وَمَا یُؤْمِنُ أَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ إِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ٥

یہ جو ایمان کا اظہار کر رہے ہیں اور دعویٰ ایمان رکھتے ہیں ان میں سے اکثر مشرک ہیں۔

شرک کی غیر محسوس سرایت

اور اس شرک کی طرف ان کی توجہ بھی نہیں ہوتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

إِنَّ الشِّرْکَ أَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ، عَلٰی صَفَاۃٍ سَوْدَاءَ، فِیْ لَیْلَۃٍ ظَلْمَاءَ......[2]

یعنی بے شک شرک اس سے زیادہ خفی (چھپا ہوا) ہوتا ہے جتنا ایک چیونٹی تاریک رات میں صاف ستھرے سیاہ پتھر پر چلتی ہے۔

شرک غیر محسوس طور پر انسان کے دل میں داخل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح جس طرح کسی ٹائل یعنی

---

[1]......(سورۃ یوسف، آیہ ۱۰۶)

[2]......(بحار الانوار، علامہ مجلسیؒ، الجزء ۲۹، ص ۹۳) (وسائل الشیعہ-شیخ حر العاملیؒ، الجزء ۱۶، ص ۲۵۴)

شفاف وہموار پتھر کے اوپر چیونٹی رینگ جاتی ہے لیکن محسوس نہیں ہوتا۔ چونکہ چیونٹی کا وزن نہیں ہوتا اور گرد وغبار نہ ہونے کے باعث پتھر بھی شفاف ہے جس پر چیونٹی کے قدموں کے نشان بھی نہیں پڑتے لہٰذا دھمک وآہٹ کے بغیر کتنی آرام سے گزر جاتی ہے۔ اسی طرح شرک بھی انسان کے ایمان میں غیر محسوس طور پر سرایت کر جاتا ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ میں ابھی بھی مؤمن ہوں۔

مرتدِ اعتقادی ومرتدِ عملی میں فرق

ارتدادِ اُمت کا معنٰی یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد سارے لوگ ملحد، کافرونجس ہو گئے تھے بلکہ قرآن انہیں قومِ مرتد شمار کررہا ہے جو مومن بھی ہیں اور مرتد بھی۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ پروردگار ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ...... [1]

اے ایمان والو! تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ بہت جلد ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اللہ سے محبت کریں گے اور جن سے اللہ محبت کرے گا......

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم میں سے جو بھی مرتد ہو گیا، یعنی اس نے دین چھوڑ دیا و ترک کر دیا تو کیا ہوگا؟ خدا تمہیں نہیں پوچھے گا، تمہیں چھوڑ دے گا اور تمہاری بجائے ایک قومِ جدید، ایک نسل جدید لائے گا، وہ خدا کو چاہتے ہوں گے اور خدا اُنہیں چاہتا ہے، وہ خدا کی راہ میں نہ تھکنے والے ہوں گے۔ اُن کا رابطہ خدا کے ساتھ تمہارے جیسا نہیں ہے۔ ان کا خدا سے رابطہ حاجات کا رابطہ، لالچ کا رابطہ، طمع کا رابطہ، تجارتی و سوداگرانہ رابطہ نہیں ہے بلکہ عاشقانہ رابطہ ہے۔ یہ کون لوگ ہوں گے؟

أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ○

---

[1] ......(سورۃ المائدۃ، آیہ ۵۴)

مومنین کے ساتھ نرمی سے اور کافروں کے ساتھ سختی سے پیش آنے والے ہوں گے، راہ خدا میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا، بڑا علم والا ہے۔

علمِ کلام یا فقہ میں مرتد ہونے کا معنیٰ الگ ہے اور اس کے احکام ہیں کہ جو معاذ اللہ خدا، نبوت، قیامت و مسلماتِ دین کا انکار کردے وہ مرتدِ اعتقادی ہے۔ سورۂ مائدہ میں اس مرتدِ اعتقادی کی بات نہیں ہو رہی جو منکرِ خدا، منکرِ معاد، منکرِ رسالت و امامت، منکرِ دین اور ملحد و دہریہ ہو جائے بلکہ مرتدِ عملی کی بات ہو رہی ہے۔ وہ مرتد جو خداوند تبارک و تعالیٰ کے بتائے ہوئے فرائض کا میدان ترک کر جائے یعنی زبان سے مؤمن ہو چونکہ قرآن اس آیت میں مومنوں سے خطاب کر رہا ہے۔ مومن جب میدانِ دین چھوڑ جاتا ہے، معیارِ دین ترک کر جاتا ہے، دستورِ دین چھوڑ جاتا ہے اور راہ خدا کے علاوہ کسی اور راہ کو بھی ساتھ اپنا لیتا ہے تو یہ شخص مرتد ہو جاتا ہے۔ پس مرتد وہ ہیں جو اللہ کے نظام کو چھوڑ کر کسی اور نظام کی طرف چلے گئے ہیں۔ اُس وقت خدا اس کے علاوہ نسلِ دیگر لے آتا ہے جو خدا کے لئے قیام کرتے ہیں اور اُن کے ذریعے سے خدا اپنا نظام استوار، قائم اور برقرار کرتا ہے۔

جو مسلّماتِ دین میں سے کسی مسلّم چیز کا کھلم کھلا انکار کرے وہ ایسا مرتد ہے کہ دین میں اُس مرتد کی سزا موت ہے لیکن جو دین چھوڑ دے، فرائض دینی انجام نہ دے انہیں قتل کرنے کا نہیں کہا گیا بلکہ فرمایا کہ اسے اپنے حال پر چھوڑ دو، خدا بھی ایک قومِ دیگر لے آئے گا۔ ان لوگوں کا زبانی اعتقاد تھا لیکن عملاً ثابت نہیں کر سکے۔ جو زبان سے لا الہ الا اللہ کہے لیکن مربوب غیر خدا کا بھی بنا ہوا ہو، ربوبیتِ عملی میں غیر خدا کی طرف رجوع کرتا ہو اور عملاً غیر خدا کو بھی اپنا ربّ مان لے یہ مرتدِ عملی ہے۔

خالص حاکمیتِ خدا کی شہادت

ایک چیز جس کی شہادت کی ضرورت ہے اور جو وحدانیتِ خدا کا حصہ ہے وہ حاکمیتِ خدا ہے۔ حاکم خدا ہے و حاکمیت خدا کی جانب سے ہے۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ......[1]

اقتدار تو صرف اللہ کے پاس ہے۔

حکومت و حاکمیت فقط خدا کی و حکم فقط خدا کا ہے۔اس حکومت و حاکمیتِ خدا کو منصۂ شہود تک پہنچانا شہادتِ عملی ہے اور اگر نہ پہنچا سکے، عملی شکل نہ دے سکے، ظہور نہ دے سکے، وجود نہ دے سکے، محسوس نہ بنا سکے، ملموس نہ بنا سکے، چشم دید نہ بنا سکے، دُنیا کے سامنے قابلِ رویت نہ بنا سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شہادت کو چھوڑ دیا یا یہ شہادت نہیں دے سکے۔قرآن میں خداوند تعالیٰ ایمان لانے والوں کیلئے فرماتا ہے:

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ ۝......[2]

اوران میں اکثر لوگ اللہ پر ایمان لائے بھی ہیں تو اس کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں۔

انہوں نے عبادت خدا کی کی، اقرار خدا کا کیا ہے لیکن حاکمیت غیر خدا کی قبول کر لی ہے۔

حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا اس خطبے کے اندر جس قوم کو مخاطب قرار دے رہی ہیں انہیں فرما رہی ہیں:

أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ كَلِمَةٌ جُعِلَ الْإِخْلَاصُ تَأْوِيلَهَا،

اخلاص توحید کی تاویل ہے یعنی خالص دین، خالص وجودِ توحید، خالص حاکمیتِ توحید ہونی چاہئے۔یہ تم نے کیسی حاکمیت بنالی ہے؟ تم کہاں چل پڑے ہو؟ زبان سے لا الہ الا اللہ کا اقرار بھی کر رہے ہو اور پھر اللہ کی حاکمیت کو چھوڑ بھی دیا۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے رویے میں شدت کی وجہ

حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے رویے میں اتنی شدت اس لئے آئی کہ مسئلہ بہت شدید تھا اور اس پر حساسیت زیادہ تھی اور پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی فرمان ہے:

---

[1]......(سورۃالانعام،آیہ۵۷)(سورۃیوسف،آیہ۴۰)(سورۃیوسف،آیہ۶۷)

[2]......(سورۃیوسف،آیہ۱۰۶)

إِذَا ظَهَرَتِ الْبِدَعُ فِيْ أُمَّتِيْ فَلْيُظْهِرِ الْعَالِمُ عِلْمَهُ فَمَنْ لَمْ يَفْعَلْ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ......[1]

جب بدعتیں ظاہر ہونا شروع ہوجائیں تو عالم کے اوپر واجب ہے کہ اپنے علم کا اظہار کرے، اُس کو بروئے کار لائے اور اگر اُس نے بدعت کے خلاف قیام نہیں کیا تو یہ ملعون ہے۔

علمائے یہود و بنی اسرائیل پر خدا نے قرآن میں اس لئے لعنت کی ہے کہ بدعتیں ظاہر ہوجاتی تھیں لیکن وہ اپنے علم کا اظہار کرکے اُنہیں روکتے نہیں تھے بلکہ ان بدعتوں سے پیسے کماتے تھے۔ سیدالشہداء امام حسین علیہ السلام نے علمائے اسلام کو یہ آیات سنائیں اور فرمایا کہ یہ لعنت علمائے یہود و علمائے بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ہر اُس فرد کو شامل ہے جس کی آنکھوں کے سامنے یہ منظر تکرار ہو رہا ہو اور وہ ردِعمل نہ دکھائے۔

نظامِ الٰہی کی شہادت

شہادتِ وحدانیتِ خدا کا ایک اہم شعبہ نظامِ خدا، حکومتِ الٰہی و حاکمیت الٰہی ہے۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا ایسے طبقے کے سامنے آئیں جس نے زبان سے لا الہ الا اللہ کہا تھا لیکن حاکم ووٹ سے چنا۔ حاکم ووٹ سے چننا گواہی دیتا ہے کہ وحدانیتِ خدا کے قائل نہیں ہیں کیونکہ غدیر گواہی دے رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا اعلان کیا تھا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کے سامنے عملاً شہادت دے کر فرمایا تھا:

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ......[2]

جس کا میں مولا ہوں پس یہ علی اس کا مولا ہے۔

یہ بھی وحدانیتِ خدا کی گواہی تھی چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں کہا کہ یہ مولا میں نے چنا ہے بلکہ فرمایا کہ یہ مولا خدا نے تمہارے لئے چنا ہے۔

---

[1]...... (الکافی - الکلینیؒ، باب البدع والرأي والمقائیس)

[2]...... (تفسیر القمی - علی بن ابراهیم القمیؒ) (الکافی - الکلینیؒ) (الخصال - الشیخ الصدوقؒ)

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے خطبے کا آغاز کیا کہ میں وحدانیتِ خدا کی گواہی دیتی ہوں یعنی میں یہاں نظامِ خدا کیلئے آئی ہوں۔ حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کا وجود اور خطبہ خدا کی وحدانیت کی شہادت ہے۔ آپؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں کہہ رہی ہوں، میں بول رہی ہوں، میں کلام کر رہی ہوں بلکہ فرمایا میں گواہی دے رہی ہوں۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی زندگی، بولنا، دیکھنا، انداز، مطالبہ اور سوچ ہر چیز سے آپ کو الٰہیت و نظامِ خدا کا وجود نظر آئے گا۔ اس لئے فرماتی ہیں کہ میں وحدانیتِ خدا کی گواہی دیتی ہوں۔

پس اے اُمتِ اسلامیہ! اے مومنو! آپ نے شہداء بننا ہے:

كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ......[1]

ہمیں قرآن نے یہ حکم دیا تھا لیکن ہم بن کیا گئے؟ ہم خطباء، مقررین، ذاکرین وسیاستدان بن گئے۔ ہماری زندگیوں میں اس طرح سے نظامِ خدا آجائے کہ ہماری زندگیاں گواہی دیں۔ آج معاشرے گواہی دے رہے ہیں کہ کس سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں؟ تشیع کا وجود آج کس بات کی گواہی دے رہا ہے؟ آئے دن ہمارا عمل کس بات کی گواہی دے رہا ہے۔ انتخابات میں آپ کا عمل کس بات کی گواہی دیتا ہے؟

شہادت، امت کے لئے دشوار مرحلہ

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے ان کی بنیادی مشکل کو درک کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دین سن تو لیا، قرآن کا فرمان سن تو لیا لیکن یہ امت گواہی نہیں دے سکی۔ اگر نظامِ خدا کی شہادت دیتی تو کبھی بھی ولایت کو چھوڑ کر حاکم انتخاب نہ کرتی تھی۔ اسی کیلئے اسوۂ فاطمیہؑ کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمیں صرف فاطمہؑ کی شفاعت کی ضرورت ہے۔ ہمارے وجود شہادت دے رہے ہیں کہ ہم اسوہ وسیرتِ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے دور ہیں۔ آپ ہر اُس شخص سے ناراض گئیں جو نظامِ خدا سے دور ہو گیا اور جس نے نظامِ خدا کو پسند نہیں کیا۔ آپ کو نہ اُن کا رونا پسند ہے، نہ اُس کی عیادت پسند ہے، نہ اُس کی تسلیت پسند ہے اور نہ اُس کا پرسہ پسند ہے۔ وہ لوگ

---

[1]......(سورۃ المائدۃ، آیہ۸)

بعد میں امیر المومنین علیہ السلام کے پاس پرسہ دینے کیلئے، رسم ادا کرنے کیلئے آتے تھے لیکن امیر المومنین علیہ السلام اُنہیں بتا دیتے تھے کہ پرسہ دینے والو! فاطمہ تم سے ناراض ہوکر گئی ہیں۔

اگر آج بھی فدک لوٹ کر آجائے تو جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا راضی ہوسکتی ہیں اور امامِ ہفتم حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے مطابق فدکِ سیدہ سلام اللہ علیہا حکومتِ الٰہی ہے۔ دین کے نظام میں حکومت ولایت ہے اور جس دن جس سرزمین پر ولایت کا نظام قائم ہوگیا اُس دین سے حضرتِ زہراء سلام اللہ علیہا راضی ہیں۔

شہادت کے تین اہم ابواب

شہادت کا لفظ تین اہم ابواب میں استعمال ہوتا ہے:

ا۔ ایمان شہادت کے ذریعے آتا ہے

۲۔ راہِ خدا میں قتل ہونا

۳۔ عدالت میں جا کر کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف شہادت دینا

اس کے علاوہ بھی شہادت کے ابواب ہیں لیکن یہ تین مہم ہیں۔

اقسام بنانے کا مشغلہ

علماء نے بحث کر کے شہادت کو قولی، لفظی، قلبی، عملی اور پتا نہیں کتنی قسموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یعنی جتنی بن سکتی تھیں بناتے گئے۔ کچھ کام ایسے ہیں کہ آپ بناتے اور کاٹتے جائیں وہ ہوتے جائیں گے۔ مثلاً آپ کپڑا پھاڑتے جائیں اور اس کی سو قسمیں کر دیں۔ درزی بھی کپڑا پھاڑتا ہے لیکن ضرورت کے تحت ٹکڑے کرتا ہے۔ لیکن ایک آدمی بیکار بیٹھا ہوا ٹائم پاس کر رہا ہے یا کھیلتے ہوئے کپڑا پھاڑ رہا ہے تو یہ بے شمار ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اسی طرح کتابوں و مدرسوں کے اندر بھی یہ کام ہوتا ہے کہ ٹائم پاس کرنے کیلئے قسمیں بناتے رہتے ہیں مثلاً توحید کی قسمیں اور دین کی قسمیں۔

رہبر معظم انقلابِ اسلامی حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای دام ظلہ العالی جب حضرتِ امام خمینیؒ کے زمانے میں دوسری مرتبہ پریذیڈنٹ منتخب ہونے لگے تو قم کا دورہ کیا اور وہاں طلاب کے درمیان تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

میری طالب علمی کے زمانے کا ایک دوست قم میں رہتا ہے۔ جب ہم مبارزے میں مصروف تھے تو وہ حوزے میں بیٹھ کر پڑھ پڑھا رہا تھا اور تحقیقات میں مشغول تھا۔ اب میری اس سے بیس تیس سال بعد ملاقات ہوئی تو میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا کر رہے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ میں تحقیقاتِ علمی انجام دے رہا ہوں۔ ہم نے پوچھا کیا تحقیقاتِ علمی انجام دی ہیں تو انہوں نے کہا کہ علم اجمالی پر تحقیقات کیں ہیں۔ عام مومنین کو اس علم کی خبر نہیں ہے۔ اساتید جانتے ہیں کہ علم اجمالی ایسا علم ہے جس میں انسان کو کچھ پتا ہو اور کچھ نہ پتا ہو مثلاً آپ کو یہ پتا ہو کہ میری ایک نماز چھوٹ گئی ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ ظہر کی چھوٹی ہے یا عصر کی۔ یا آپ کو یہ پتا ہے کہ میں نے کسی کا قرض دینا ہے لیکن یہ نہیں پتا کہ کس کو دینا ہے؟ اس طرح کی حالتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ آپ کہتے ہیں میں نے دعوت تو دے دی ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ کس کو دی ہے۔ یا آپ کبھی کہتے ہیں کہ آپ کی امانت تھی لیکن میں نے کسی کو دی تھی اور پتا نہیں زید کو دی تھی یا عمرو کو۔ ایک علم علمِ تفصیلی ہے کہ میں نے امانت دی تھی اور یہ بھی معلوم ہے کہ کس کو دی تھی۔ علم اجمالی کی کافی قسمیں ہیں۔ رہبر معظم دام ظلہ العالی فرماتے ہیں جب میں نے اُس طالب علمی کے زمانے کے دوست سے پوچھا جو مدرسے کے اندر محقق بن چکا تھا کہ بھائی آج کل کیا کر رہے ہو؟ تو کہنے لگا کہ تحقیقات کر رہے ہیں۔ کیا تحقیقات کر رہے ہو؟ کہا: علم اجمالی کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے علم اجمالی کی سو قسمیں تھیں لیکن ہم نے بڑھا کر اڑھائی سو کر دی ہیں۔

یہ اڑھائی سو قسمیں کس کام آئیں گی؟ نہ یہ آپ کے مقلدین کے کام آئیں گی، نہ عورتوں کے کام آئیں گی، نہ مردوں کے کام آئیں گی، نہ طالبعلموں کے کام آئیں گی؟ نہ، دُنیا، قبر و آخرت میں کسی کے کام آئیں گی۔ پھر اتنی قسمیں کیوں بنائی ہیں؟ چونکہ بنتی گئیں لہٰذا ہم بھی بناتے گئے۔

ٹائم پاس کرنے کیلئے یہ کام ہوتا ہے کہ جتنی قسمیں بنتی جائیں بناتے جائیں۔ پس توحید کی جتنی قسمیں بنتی گئیں بناتے گئے مثلاً توحید مشرقی، توحید مغربی، توحید علوی، توحید پائین، توحید جنوبی و توحید شمالی۔ اسی طرح

شہادت کی اقسام بھی بناتے گئے کہ شہادتِ قولی، شہادتِ عملی، شہادت حسی، شہادتِ قدیمی، شہادتِ جدید، شہادتِ لیلی، شہادتِ نہاری وغیرہ وغیرہ لیکن شہادت کی صرف ایک ہی قسم ہے کہ آپ کسی حقیقت کو جو لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہے، جس سے لوگ نا آشنا و محروم ہیں اُس حقیقت کو لوگوں کے سامنے اس طرح مجسم کریں کہ اُنہیں آنکھوں سے نظر آنا شروع ہو جائے چونکہ خدا نظر نہیں آتا لہٰذا وحدانیت بھی نظر نہیں آتی لیکن اب آپ کا کام ہے کہ شہادت دیں یعنی توحید غیر محسوس کو توحید محسوس بنا دیں۔ توحید کو اپنی زندگی و میدانِ عمل میں اس طرح مجسم کریں کہ دیکھنے والے کو آپ کے عمل کے اندر خدا کی وحدانیت نظر آ جائے۔ زبان سے توحید توحید کرنا شہادت نہیں بلکہ تذکرۂ توحید، علمِ توحید، مفہومِ توحید، لفظِ توحید و معنیٰ توحید ہے۔ توحید کو شہادت کی ضرورت ہے اور انسان شہادتِ توحید سے مومن ہوتا ہے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا اقدام، شہادتِ توحید

حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا دربار میں آجانا وحدانیتِ خدا پر گواہی ہے۔ اگر مسجد میں بیٹھے لوگوں نے بھی ایک عمل انجام دیا اور بی بی سیدہؑ بھی مسجد آئیں لیکن اُن کا مسجد میں آنا کس کے دفاع کیلئے تھا اور بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کس کے دفاع کیلئے مسجد میں آئیں۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا عمل نظامِ الٰہی و نظامِ ولایت کیلئے تھا اور جب حق کیلئے ایک قدم اُٹھایا جاتا ہے تو وہ قدم بتا رہا ہوتا ہے کہ قدم اُٹھانے والا خدائے وحدہ لاشریک پر ایمان رکھتا ہے۔ چونکہ خدا وحدہ لاشریک کے حکم کے علاوہ کسی اور کی طرف اس کی رغبت نہیں ہے لہٰذا یہ عمل وحدانیتِ خدا کی شہادت ہے لیکن جن کا عمل گواہی دیتا ہو کہ ان کے کئی خدا ہیں وہ توحید کی شہادت نہیں دے سکتے۔

منافق اور کاذب شہادتیں

ہم اپنے اعمال، خوف، اُمیدوں، احساسات، اقدامات و رجحانات کو دیکھیں تو کیا یہ سب کے سب خدا کے وحدہ لاشریک ہونے کی گواہی دیتے ہیں؟ ہم تو اتنی چیزوں سے ڈرتے، ان کی پرواہ کرتے اور

اُمیدیں باندھتے ہیں کہ ہمارا ہر عمل گواہی دیتا ہے کہ ہمارے ہزار رب ہیں۔

خداوند تبارک وتعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

إِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ إِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَکٰذِبُوْنَ ۝......[1]

منافقین جب آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کو بھی علم ہے کہ آپ یقیناً اس کے رسول ہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے یہ منافقین یقیناً جھوٹے ہیں۔

منافق کا عمل بتاتا ہے کہ وہ آپ کو رسول نہیں مانتا یعنی اُس کی زندگی، طرزِ زندگی، طور طریقہ اور سوچ بتاتی ہے کہ وہ آپ کو رسول نہیں مانتا۔ اُس کی زندگی میں آپ کی رسالت پر ایمان مجسم نہیں ہے اس لئے یہ جھوٹا ہے۔ یہ کہنا کہ رسول، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں یہ تو جھوٹ نہیں ہے بلکہ دُنیا کا سب سے بڑا سچ ہے لیکن اللہ کہہ رہا ہے کہ یہ بھی جھوٹ ہے۔ اگر منافق ''نشھد'' کی بجائے ''نقول'' کہتے تو پھر کبھی یہ آیت نازل نہ ہوتی کہ جھوٹ بول رہے ہیں کیونکہ قول ٹھیک ہے۔

ولایتِ علی علیہ السلام کی منافقانہ شہادت

خداوند تعالیٰ، اشہد ان علی ولی اللہ کی گواہی اُس وقت قبول کرے گا جب ہماری زندگیاں بھی ولایتِ علیؑ کی گواہی دیتی ہوں۔ کیا واقعاً ہماری حکومتیں، ہمارے نظام و اقدامات گواہی دیتے ہیں کہ علیؑ ولی خدا ہیں؟ اب جہاں بھی علیؑ کی ولایت کی گواہی دیں گے تو خطاب آئے گا:

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَکٰذِبُوْنَ ۝

اے علیؑ! اللہ جانتا ہے کہ تم ولی ہو لیکن یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اس لئے کہ کتنے عرصے سے بغیر ولایت کے زندگی بسر کر رہے ہیں، اپنی مملکت میں ولایت کا نام تک نہیں لیتے، بلکہ اتنے جری ہو گئے ہیں کہ

---

[1] ......(سورۃ المنافقون، آیہ ۱)

اس معاملہ میں اللہ سے ڈرتے بھی نہیں ہیں۔

منافقت کی علامت

منافقت کی علامت یہ ہے کہ اس نے رسالت و ولایت کو اپنے رویے میں محسوس نہیں کیا ہے۔ جو رسولؐ کی رسالت کی گواہی دیتا ہے اُس کا اٹھنا، بیٹھنا، سوچنا، سونا، جاگنا، نماز، روزہ، معیشت، سیاست، حکومت، تعلیم اور گھر رسالت کے مطابق ہوتا ہے۔ جس کی زندگی رسالت کے مطابق نہ ہو اور وہ بار بار ڈھیٹ بن کر کہے کہ......نَشۡهَدُ إِنَّکَ لَرَسُوۡلُ اللهِ......تو ایسے ڈھیٹ کو خدا جواب دیتا ہے کہ اللہ جانتا ہے تو اللہ کا رسولؐ ہے لیکن......وَاللّٰهُ يَشۡهَدُ إِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ لَكٰذِبُوۡنَ......کیونکہ ان کی کوئی چیز رسالت کے مطابق نہیں ہے۔ اُس وقت شہادتِ ثانیہ کا جھگڑا تھا اور ابھی شہادتِ ثالثہ کا جھگڑا ہے۔ لیکن اللہ نے بتا دیا ہے کہ شہادت دے کر بھی کوئی نجات نہیں پا سکتا جب تک ان کی زندگی میں رسالت و ولایت نظر نہیں آتی۔

ولایت فروشی اور شہادتِ ولایت میں فرق

آج ولایت کہاں نظر آتی ہے؟ ولایت فروشی سے انسان ولایت کا قائل نہیں ہو جاتا۔ یہود رسالت فروشی کرتے تھے، رسول بیچتے تھے، رسالت بیچتے تھے، اور آیاتِ خدا بیچتے تھے لہٰذا قرآن نے اُن کو تنبیہ کی:

وَلَاتَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِيۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا......[1]

اور تھوڑی قیمت پر میری آیات کو فروخت نہ کرو......

آیت فروشی، دین فروشی، کتاب فروشی و رسول فروشی نہ کرو۔ ولایت فروشی اور شہادتِ ولایت میں بہت فرق ہے۔ ولایت کی شہادت دیجئے۔ شہادت کا میدان تمہاری زندگیاں و نظام ہے۔ تعلیم علویؑ، سیاست علویؑ،

---

[1] ......(سورۃ البقرہ، آیہ ۴۱) (سورۃ المائدۃ، آیہ ۴۴)

حکومت علویؑ، نظامِ علویؑ، معیشت علویؑ، عدالت علویؑ نافذ کریں۔ اُس وقت خدا کہے گا کہ تم شہداء ہو:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّ سَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ......[1]

اوراسی طرح ہم نے تمہیں امتِ وسط بنا دیا تا کہ تم لوگوں پر گواہ رہو......

اگر یہ نظامِ علویؑ یعنی ولایت کا نظام نافذ کئے بغیر اور اپنائے بغیر ہم پکار پکار کر کہیں کہ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ الله تو وہ ذات جواب دے گی:

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝......[2]

''لَا'' کہنے کی قیمت

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی رنجش کلمۂ طیبہ کے ''لَا'' کی تفسیر ہے۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے عمل میں ''لَا'' مجسم ہوگیا۔ ''لَا'' اگر لفظی شکل میں آئے تو لام اور الف لکھ کر بنا دیا جاتا ہے لیکن اگر گواہی و شہادت بن جائے تو سیرتِ زہراء سلام اللہ علیہا بن جاتا ہے۔ اُس وقت بھی اگر کچھ لوگ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے ہمراہ ہوجاتے اور اُن کے اندر بھی یہ ناراحتی منتقل ہوجاتی جو جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے اندر تھی تو اُسی وقت حالت بدل جاتی، اُسی وقت انقلاب برپا ہوجاتا اور اُسی وقت جو انحراف وقوع پذیر ہونے جارہا تھا اور ہوگیا، رُک جاتا لیکن یہ رنجش فقط قلبِ نورانی حضرت زہراء سلام اللہ علیہا میں باقی رہی اور اُس وقت موجود لوگوں نے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی تقلید نہیں کی۔

قیامِ فاطمی سلام اللہ علیہا کو مختلف رنگ دینے کی کوشش

اُمت نے قیامِ حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو دوسرے رنگ دے دیئے۔ ایک رنگ یہ دیا کہ یہ فقط جائیداد کا مطالبہ تھا جو ایک باغ کے چند درختوں کے اندر منحصر تھا، وہ حکومت و نظام پر اعتراض نہیں تھا، اُمت کو

---

[1] ......(سورۃ البقرہ، آیہ ۱۴۳)

[2] ......(سورۃ المنافقون، آیہ ۱)

خطاب نہیں تھا اور یہ ناراضگی ذاتی رنجش تھی۔ جس طرح بعض اوقات انسان کسی سے ناراض ہوجاتا ہے اور اُسے معاف نہیں کرتا۔ رنجش اتنی گہری وسنگین ہوتی ہے کہ وہ معافی بھی مانگے لیکن معاف نہیں کیا جاتا۔ جس طرح رنجورو زودرنج لوگ کسی کا کینہ ونفرت دل میں رکھ لیتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی معاف نہیں کرتے۔ گویا یہ اسی قسم کی ایک معاذ اللہ ذاتی رنجش تھی اور اس کا سنت وسیرت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ صدیوں سے جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کا یہ قیام اسی طرح سے تفسیر ہوتا آیا ہے۔

اہم واقعات کی گوسفندی تفسیریں

قرآن، دین، کربلا اور ہر اہم نکتہ و ماجرا جو اُمت کی ہدایت کیلئے تھا اُس کی اسی طرح گوسفندی تفسیریں کی گئی ہیں۔ خصوصاً غدیر وولایت کی تفسیر کہ اُسی روزِ اعلان سے یہ معنٰی کیا گیا کہ ولایت دوستی کیلئے ہے اور مولا دوست ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمت کا دوست متعارف کروایا ہے اور اُمت سے مطالبۂ دوستی و محبت کیا ہے۔ صدیوں سے ولایت دوستی اور محبت کے معنٰی میں استعمال ہوئی اور آج تک جاری ہے۔

اگر قرآنی آیات، قیامِ فاطمیؑ، کربلا اور غدیر کا درست معنٰی وصحیح تفسیر ہوتی تو آج مسلمانوں، مومنوں، پاکستان اور انسانیت کی یہ صورتحال ہوتی۔ یہ موجودہ حالت معلول ہے ان تفسیروں کی جنہیں علامہ اقبالؒ نے گوسفندی مذہب و گوسفندی افکار سے تعبیر کیا ہے جو قوموں کی شخصیت، تشخص، شناخت، جرأت، دلیری و پہچان اُن سے چھین لیتا ہے، اُن سے راہیں چھڑا لیتا ہے اور اُن کے اہداف و مقاصد سے اُن کو دور کر دیتا ہے۔ جو تفسیریں قیام فاطمیؑ کو صرف جائیداد کا مطالبہ، حماسہ کو ذاتی رنجش اور سنت وسیرتِ فاطمیہؑ کو ذاتی مسئلہ قرار دیں گوسفندی تفسیریں ہیں۔

مظہرِ رضاوغضبِ خدا ہونے کا معیار

رِضائے فاطمہؑ میں اللہ کی رِضا ہے اور زہراء سلام اللہ علیہا کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی ہے۔ خدا کسی

کے ساتھ ذاتی رنجش نہیں رکھتا اور نہ ہی اسے اپنی ناراضگی و رِضا کا مظہر قرار دیتا ہے جو الٰہی معیاروں کے بغیر ناراض ہوتا ہو۔ آج اگر کسی کو معلوم ہو کہ جسے میں اپنی رضا و ناراضگی کا مظہر قرار دے رہا ہوں وہ معمولی مسائل، بے منطق اور غلط فہمیوں کی وجہ سے بھی ناراض ہو جاتا ہے، اس کی ناراضگی کا کوئی معیار نہیں ہے، یہ کسی بھی وقت کسی سے بھی ناراض ہو جاتا ہے تو اُس وقت ایک عام آدمی بھی اپنی رضا اور ناراضگی کو اُس کے سپرد نہیں کرتا۔ جب اللہ کی ذات حکیم ہے اور اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہے لہٰذا وہ ذاتِ حکیم، ذاتِ علیم، ذاتِ خبیر، ذاتِ لطیف و ذاتِ عزیز اگر اپنی رِضا و ناراضگی کو فاطمہؑ کی رِضا و ناراضگی میں قرار دے تو یہ اُس وقت ممکن ہے جب حکمتِ خدا ایسا کرنا چاہ رہی ہو۔

ہم نے یہ جملہ امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں بہت سنا ہوا ہے کہ جنگِ خندق میں امیر المومنین علیہ السلام نے عمرو بن عبدود کو پچھاڑا۔ جب اسے ضرب لگائی وہ زخمی ہو کر گر پڑا اور امیر المومنین علیہ السلام اُس کی گردن تن سے جدا کرنے کیلئے اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ اچانک اُس نے گستاخی و توہین کی اور تھوک دیا۔ جوں ہی اُس نے توہین کی امیر المومنین علیہ السلام اُس کے سینے سے ہٹ گئے اور چند قدم ٹہل کر پھر لوٹ آئے۔ وہ زخمی حالت میں پڑا رہا کیونکہ کاری ضرب کے باعث اُٹھ نہیں سکتا تھا۔ اسے تعجب ہوا اور پوچھنے لگا کہ آپ نے مجھے چھوڑ کیوں دیا حالانکہ میں نے یہ گستاخی اس لئے کی تھی تا کہ آپ کو مشتعل کروں اور غصہ دلاؤں تا کہ آپ میرا سر جلدی قلم کر دیں۔ چونکہ میں نہیں چاہتا کہ اپنے حریف و دشمن کے ہاتھ میں زیادہ دیر تک زندہ رہوں۔

دلیر آدمی مسلمان ہو یا غیر مسلمان ذلت برداشت نہیں کرتا۔ عمر بن عبدود کو پسند نہیں تھا کہ میں زیادہ دیر اپنے حریف کے پنجے کے اندر زندہ رہوں چونکہ یہ ذلت ہے۔ کہنے لگا کہ میں نے اس لئے توہین کی تا کہ وہ کام جو آپ کو دیر سے کرنا ہے جلدی انجام دے دیں گے اور میں یہ ذلت زیادہ دیر برداشت نہیں کروں گا۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس لئے تیرے سینے سے ہٹ گیا کہ جب تو نے گستاخی کی تو میرے دل میں حقیقتاً اشتعال آ گیا، غصہ و غضب آ گیا کہ تو نے میری توہین کی ہے لیکن میں تجھے اپنے اس نفسانی غضب، ذاتی ناراضگی و رنجش سے نہیں مارنا چاہتا تھا بلکہ اللہ کی خاطر مارنا چاہتا تھا۔

جب انسان اس مقام پر جا پہنچتا ہے کہ اپنے غضب و محبت کو خدا کے غضب و محبت میں فانی کر دیتا

ہے تو خدا اسے اپنی ناراضگی ورضا کا مظہر قرار دے دیتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام کسی کو اپنی خواہش کے تحت نہیں چاہتے بلکہ اُسی کو چاہتے ہیں جس کو خدا چاہتا ہے اور اپنی خواہش کے تحت کسی کو دشمن نہیں بناتے بلکہ اُسی کو دشمن بناتے تھے جو دشمنِ خدا ہوتا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ فاطمہؑ کی رِضا اللہ کی رِضا ہے اور اللہ کی ناراضگی فاطمہؑ کی ناراضگی میں ہے تو یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی رنجش ذاتی رنجش نہیں تھی بلکہ یہ اللہ کی ناراضگی تھی۔ جنابِ سیدہ کی ناراضگی کا ایک معیار تھا۔ فقط کچھ شخصیتوں سے رنجش نہیں تھی بلکہ درحقیقت ایک نظام سے ناراضگی، بیزاری، برأت ونفرت تھی چونکہ چند افراد نے وہ ناپسندیدہ اقدام کیا جو اللہ کو پسند نہیں تھا اس لئے حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا ان سے ناراض گئیں۔

قلبی ناراضگی، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا پہلا مرحلہ

پس انسان کے انحراف وگمراہی کے مقابلہ میں پہلا عکس العمل قلبی ناراضگی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جو اسلام کا اہم ترین ستون وفریضہ ہے لیکن اسے بھلا دیا گیا۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے درجات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وائمہ اطہار علیہم السلام نے بیان فرمائے ہیں اور ان کا پہلا مرحلہ ناراحتی قلبی وناراضگی قلبی ہے۔ جو منکرات کے اوپر دل سے ناراض نہیں ہوتا وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر نہیں کرسکتا۔

ناراضگی کیلئے قلبی بصیرت وپاک فطرت کی ضرورت

یہ ناراضگی آسانی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس ناراضگی کیلئے بصیرت واعلیٰ فطرت چاہئے۔ ہر فطرت منکرات سے ناراض نہیں ہوتی۔ ہم اپنی آنکھوں سے بہت سارے منکرات دیکھتے ہیں لیکن ہمارے دل کے اندر ناراضگی ورنجش پیدا نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ دل پاک نہیں ہے اور ان منکرات کا شائبہ ہمارے دل کے اندر موجود ہے۔ اُس چیز سے نفرت پیدا ہوتی ہے جس کی آلودگی سے ہمارا دل پاک ہو۔ جو خود سگریٹ نوشی کی آلودگی سے پاک ہے اسے دوسروں کا بھی تمبا کو پینا پسند نہیں ہے۔ لیکن جو خود سگاری، تمبا کو نوش واسموکر ہے

اگر وہ دوسرے کو اسموکنگ (Smoking) کرتا ہوا دیکھے تو اُس سے ناراض نہیں ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے یہ ایک بہترین عمل کر رہا ہے۔ اسی طرح بہت سارے منکرات ہماری آنکھوں کے سامنے انجام پا رہے ہوتے ہیں لیکن ہمیں وہ اُمور برے نہیں لگتے۔ مثلاً ہم بہت سارے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ بے نظم ہیں، وقت کے پابند نہیں ہیں لیکن ہمیں برا نہیں لگتا۔ چونکہ یہ منکر خود ہمارے اندر بھی پایا جاتا ہے اور پھر فخر سے بیان بھی کرتے ہیں کہ ہم تو آئے ہی دیر سے ہیں۔ فرض کریں معرکہ کربلا ہے اور یہ کربلا نہیں پہنچے بلکہ شہادتوں اور دفن کے بعد کربلا پہنچے تو پھر بھی فخر سے کہیں گے کہ ہم تو پہنچے ہی بڑی دیر سے تھے۔ کیوں؟ اس لئے کہ بے نظمی ان کے دل کے اندر موجود ہے۔ ان کی فطرت کے اندر یہ انحراف رچ بس گیا ہے اور اگر انسان کی طبیعت و مزاج کے اندر ایک برائی کا شائبہ آ جائے تو دوسروں کے اندر وہ برائی بری نہیں لگتی۔

انسان کو طاغوتی نظام اس وقت برا لگتا ہے جب انسان کا وجود خود طغیان سے پاک ہو۔ طاغوت کو طاغوت برا نہیں لگتا مثلاً بہت سارے لوگوں کو مغربی نظام و امریکا بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ کو بہت سے ایسے لوگ مل جائیں گے کہ جنہوں نے امریکی ویزے کے حصول کیلئے حضرتِ زہراء سلام اللہ علیہا کی منت مانی ہوئی ہے۔ انہیں امریکا و انگلستان اتنا اچھا لگتا ہے کہ پاکیزہ ہستیوں کی نذر کر کے ان ممالک کا رُخ کرتے ہیں تاکہ وہاں جاب یا نیشنلٹی مل جائے۔ پس ملاوٹ کرنے والا یا جھوٹ بولنے والا ہمیں اس وقت برا لگتا ہے جب ہم خود ان برائیوں سے اجتناب کرتے ہوں۔

اولی الامر سے متعلق غلط فکر کی ترویج

اہل سنت کے ہاں اس فکر کی ترویج کروائی گئی کہ حاکم جیسا بھی آ جائے وہ اولی الامر ہے اور اُس کی اطاعت واجب ہے۔ البتہ یہ اہل سنت کی حقیقی تعلیمات کا حصہ نہیں ہے بلکہ بنواُمیہ نے یہ مذہب بنا کر اہلسنت کی تعلیمات میں شامل کروا دیا۔ پھر اپنے وظیفہ خوار فقہاء سے اس کی ترویج کروا کر اور فتوے دلوا کر اس کو مسلم بنا دیا کہ جو بھی حاکم آ جائے وہ اولی الامر ہوتا ہے۔ اہل سنت کے بعض محقق علماء اسے قبول نہیں کرتے اور کہتے

ہیں کہ ہر حاکم اولی الامر نہیں ہوسکتا۔ اہل سنت کے مولا نا مودودی بھی اسے قبول نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر حاکم اولی الامر نہیں ہوسکتا بلکہ اس کی شرائط ہیں لیکن بہت سارے لوگ ہر حاکم کو اولی الامر تسلیم کرتے ہیں یعنی پرویز مشرف اولی الامر ہے، صدر زرداری اولی الامر ہے اور ضیاء الحق پر تو بعض نام نہاد شیعہ و سنی کا اجماع تھا۔ ضیاء الحق نے ایک اسلامی مجلس شوریٰ بنائی تھی اور اُس میں شیعہ و سنی ایم این ایز خود چنے تھے۔ آرٹیکل باسٹھ و تریسٹھ ضیاء الحق نے آئین کے اندر داخل کیا ہے۔ الیکشن کمیشن کا کام یہ ہے کہ سارے کانڈیڈیٹز آرٹیکل باسٹھ اور تریسٹھ کے مطابق ہونے چاہئیں۔ آرٹیکل باسٹھ اور تریسٹھ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ایم این اے پکا مسلمان ہو، باشریعت ہو، اُس کی داڑھی ہو، اسلام کا وفادار ہو، عادل ہو، نماز پڑھتا ہو، جمعہ پڑھتا ہو، اسے قرآن پڑھنا آتا ہو، کلمے سارے یاد ہوں۔ اس آرٹیکل کو اپلائی کرنے والے الیکشن کمیشن کے بیوروکریٹز ایم این ایز کا امتحان لیتے ہیں اور کلمے سنتے ہیں جبکہ خود سننے والے کے اندر یہ شرائط موجود نہیں ہیں۔

ضیاء الحق نے اپنی چنی ہوئی شوریٰ سے اسے منظور کروایا۔ اُس طاغوت نے شوریٰ میں اپنے تئیں ہر مسلک کے بہترین مومن چنے، اُس میں سے کچھ مومن ابھی باقی ہیں مثلاً دفاعِ پاکستان کونسل میں کچھ ایسے ہیں جو ٹھوڑی تک خون میں غرق ہیں، پھر اُس شوریٰ نے کہا کہ ضیاء الحق امیر المومنین ہے۔ طاغوت جو شیعہ چنتا ہے وہ شیعہ پارلیمنٹ کو شیعہ نہیں کرتا بلکہ طاغوتیت کا حصہ ہوجاتا ہے۔

ائمہ علیہم السلام کے نزدیک طاغوت سب سے بڑا منکر

سید الشہداء علیہ السلام کے نزدیک سب سے بڑا منکر طاغوت، حاکمِ جور و سلطانِ جور ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ حکومتِ جور، طاغوتی حکومت کیوں بری ہے؟ آپؑ اس کو کسی بھی سطح پر کیوں قبول نہیں کرتے؟ امامؑ نے فرمایا:

مَنْ تَحَاكَمَ اِلَيْهِمْ فِيْ حَقٍّ اَوْ بَاطِلٍ فَاِنَّمَا تَحَاكَمَ اِلَى الْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ الْمَنْهِيِّ عَنْهُ، وَ مَا حَكَمَ لَهُ بِهِ فَاِنَّمَا يَأْخُذُ سُحْتًا وَ اِنْ كَانَ حَقُّهُ ثَابِتًا لَهُ لِاَنَّهُ اَخَذَهُ بِحُكْمِ الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اَمَرَ اللّٰهُ اَنْ يَّكْفُرَ

بِهِ، ......[1] ”أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ أَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْکَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ يُرِيْدُوْنَ أَنْ يَّتَحَاکَمُوْٓا إِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ أُمِرُوْٓا أَنْ يَّکْفُرُوْا بِهٖ“ ......[2]

جو شخص بھی حق یا باطل میں طاغوت سے فیصلہ کرواتا ہے (طاغوت کی طرف رجوع کرتا ہے) پس اس نے فیصلہ کرایا ہے طاغوت سے کہ جس سے منع کیا گیا ہے اور جو شخص اس کو فیصلہ کیلئے اس بات میں حاکم قرار دیتا ہے تو اس نے حرام کو حاصل کیا ہے اگرچہ اس کا حق اس کیلئے ثابت ہو، کیونکہ اس نے اس چیز کو طاغوت کے فیصلہ سے لیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ تم طاغوت سے انکار کرو۔ ”کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ جو کتاب آپ پر نازل ہوئی اور جو کچھ آپ سے پہلے نازل کیا گیا ہے سب پر ایمان لائے ہیں مگر اپنے فیصلوں کیلئے طاغوت کی طرف رجوع کرتے ہیں حالانکہ انہیں طاغوت کا انکار کرنے کا حکم دیا گیا تھا“ ......

حکومتِ جور میں حق محو ہو جاتا ہے، قرآن ترک ہو جاتا ہے، حدودِ خدا پائمال ہو جاتی ہیں اور ظلم زندہ ہو جاتا ہے۔ ہر وہ برائی جو کسی بھی نظام کے اندر انجام پا رہی ہو اُس کا ذمہ دار درحقیقت حکومت و حاکم ہے۔ انسان کو فرعون اس وقت برا لگتا ہے جب خود اس انسان کے اندر طغیان موجود نہ ہو لیکن اگر طغیان انسان کے نفس میں موجود ہو تو پھر اسے فرعون، نمرود اور یزید جیسے طاغوت برے نہیں لگتے۔ یزید صرف سید الشہداء علیہ السلام کو برا لگتا تھا، باقی لوگوں کو برا کیوں نہیں لگتا تھا؟ اس لئے کہ ان کے اندر طغیان کا کچھ نہ کچھ درجہ و شائبہ موجود تھا۔ پس جس کے دل کے اندر طغیان موجود تھا اُس نے یزید کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھایا، کوئی آواز نہیں اٹھائی لیکن جس کا دل طغیان سے مکمل طور پر پاک تھا اس نے اُٹھ کر طاغوت کے خلاف قیام کیا۔

ائمہ علیہم السلام کے نزدیک طاغوت سب سے بڑا منکر

---

[1]......(اصول الکافی - ثقۃ الاسلام ابی جعفر محمد بن یعقوب بن اسحاق الکلینی الرازی رحمہ اللہ) (تهذيب الاحكام في شرح المقنعة للشيخ المفيد رضوان الله عليه - الشيخ الطوسیؒ، باب: من الزيادات فی القضايا والاحكام، الجزء ۲، صفحہ ۳۰۱) (من لا يحضره الفقيه - الشيخ الجليل الاقدم الصدوق أبی جعفر محمد بن علی بن الحسين بن بابويه القمیؒ، باب: الاتفاق علی عدلين فی الحكومة، الجزء ۳، صفحہ ۸)

[2]......(سورۃ النساء، آیہ ۶۰)

امت کا ناراضگئ زہراء سلام اللہ علیہا کو نہ اپنانا

بعض اوقات یہی کام بہت سخت ہوتا ہے جو حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کرنا چاہ رہی تھیں۔ حضرت زہراءؑ پوری اُمت کو اس نظام سے ناراض کرنا چاہ رہی تھیں لیکن امت ناراض نہیں ہوئی۔ حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو ایک اُن لوگوں پر دکھ تھا کہ جو رسولؐ کی راہ سے ہٹ گئے تھے اور دوسرا ان لوگوں پر افسوس تھا کہ نظامِ حکومت راہِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہٹ گیا ہے اور امت کے اندر ناراضگی و رنجش پیدا نہیں ہوئی۔

انبیاء وائمہ علیہم السلام کے دو اہم فریضے

خداوند تعالیٰ نے انبیاء وائمہ علیہم السلام کے دو اہم فریضے مقرر کئے ہیں:

۱۔ تولیٰ ۲۔ تبریٰ

نبی اور امام کا ایک اہم فریضہ لوگوں کو فرعونوں وظالموں سے ناراض کرنا ہوتا ہے۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا کام لوگوں کے اندر بتوں سے ناراضگی، ناراحتی ونفرت پیدا کرنا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اہم کام لوگوں کے اندر ظلم وستم وظالم سے نفرت پیدا کرنا تھا۔ تبریٰ اسی ناراضگی و بیزاری کا نام ہے۔ شرک، کفر، ظلم اور طاغوتی نظام کے خلاف تبریٰ فرائضِ انبیاء علیہم السلام میں سے ہے۔

تولیٰ یعنی اللہ سے قریب کرنا محبتِ خدا پیدا کرنا اور تبریٰ یعنی دشمنانِ خدا کی نفرت پیدا کرنا۔ رہبر الٰہی لوگوں کے اندر دونوں چیزیں پیدا کرتے ہیں یعنی ولایت وبرأت۔ وہ لوگوں کے دلوں میں حکومتِ عدل کی محبت ورغبت پیدا کرتے ہیں۔ لہٰذا دُعائے افتتاح جو حضرت حجت عجّل اللہ تعالیٰ سے مروی ہے اس میں آپؑ ارشاد فرماتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَرْغَبُ اِلَیکَ فِیْ دَوْلَۃٍ کَرِیْمَۃٍ......[1]

---

[1]...... (بحار الأنوار-الشيخ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء۸۸، صفحه۶، صفحه۲۵، والجزء ۹۴، صفحه ۳۳۲، و الجزء۹۵، صفحه ۲۰۹) (أنيس القلوب-آية الله السيد محمد تقی المدرسی) (اقبال الاعمال) (البلد الأمين-آية الله ابراهيم بن علي العاملي الكفعمیؒ) (مصباح المتهجد) (مصباح كفعمی) (مفاتيح الجنان)

اے پروردگار! ہم دولت کریمہ کے اندر رغبت رکھتے ہیں۔

دولت اُردو میں ثروت و مال کو کہتے ہیں لیکن عربی زبان میں حکومت کو کہتے ہیں۔ یہاں عربی دولت مراد ہے۔ دولت و دعوت قرآنی الفاظ ہیں لیکن انہیں معانی ہندی پہنا دیئے جاتے ہیں۔ نغمے حجازی ہیں لیکن لَے ہندی ہے۔ دولت گردش کو کہتے ہیں۔ یعنی جو چیز گردش میں ہو اور گھوم رہی ہو وہ دولت ہے۔ چونکہ حکومت مملکت کے اُمور کو چلاتی، گھماتی و گردش میں لاتی ہے اس لئے حکومت کو بھی دولت کہتے ہیں۔ یا اس وجہ سے کہ یہ حکومت خود مختلف ہاتھوں میں گھومتی رہتی ہے، کبھی اس کے پاس ہے تو کبھی اُس کے پاس اس وجہ سے اسے دولت کہتے ہیں۔ ہم یہ دُعا پڑھتے ہیں لیکن سمجھ نہیں آتی کہ کیا مانگ رہے ہیں؟ متحجرین بھی یہی دُعا مانگتے ہیں کہ......اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَرْغَبُ اِلَیْکَ فِیْ دَوْلَۃٍ کَرِیْمَۃٍ......اگر ان سے پوچھیں کہ کیا سیاست دین کا حصہ ہے؟ تو کہتے ہیں سیاست دین کا حصہ نہیں ہے۔

اس سیاسی دُعا میں امامِ معصوم، امام وقت، امام عصر (عج) اپنے پیروکاروں کو دُعا سکھا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا مانگا کرو کہ اے پروردگار! ہم ان طاغوتی حکومتوں میں رہنا پسند نہیں کرتے بلکہ دولتِ کریمہ، دولتِ عدل، دولتِ الٰہی و حکومتِ الٰہی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ وہ دولتِ کریمہ پاکستان کی مشکلات کا حل ہے جس کی طرف امامِ زمانہ (عج) راہنمائی فرمارہے ہیں لیکن جو لوگ ابوالکلام آزاد، سرسید احمد خان اور فضل الرحمٰن کی راہ و نظام کو ترجیح دیتے ہیں اُن کیلئے امامِ زمانہ (عج) کا راستہ مناسب و مفید نہیں ہے۔ یہ امامِ زمانہ (عج) کے پیروکاروں کیلئے ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَرْغَبُ اِلَیْکَ فِیْ دَوْلَۃٍ کَرِیْمَۃٍ، تُعِزُّ بِھَا الْاِسْلَامَ وَ اَھْلَہٗ، وَ تُذِلُّ بِھَا النِّفَاقَ وَ اَھْلَہٗ، وَ تَجْعَلُنَا فِیْھَا مِنَ الدُّعَاۃِ اِلٰی طَاعَتِکَ، وَ الْقَادَۃِ اِلٰی سَبِیْلِکَ، وَ تَرْزُقُنَا بِھَا کَرَامَۃَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ......

یعنی اے پروردگار! ہمیں ایسی حکومت چاہیئے جو دولت کریمہ ہو، جس کے اندر اسلام عزیز و مسلمان عزت میں ہو، جس کے اندر دشمنِ خدا ذلت کے اندر ہو اور اے پروردگار! وہ حکومت عطا کر جس کے ہم تماشائی نہیں بلکہ خدمت گزار رہوں۔ ہم تیری بارگاہ سے وہ حکومت چاہتے ہیں جس کے توسط سے تو ہمیں دُنیا و آخرت کا شرف و کرامت عطا فرمائے۔

امامِ عصر(عج) اپنے پیروکاروں کو زمانۂ انتظار و زمانۂ غیبت میں فریضہ بتا رہے ہیں۔ یہ ہر امام کے فرائض میں سے ہے۔ امامِ زمانہ(عج) امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ امامؑ نے ہمیں رغبتِ دولتِ کریمہ و نفرتِ دولتِ رذیلہ کا منشور دیا ہے۔ یہ تبریٰ پیدا کرنا امامت کے فرائض میں سے ہے۔ امام خمینیؒ کو ایرانی ملت کو طاغوت سے ناراض کرنے، رنجش پیدا کرنے، نفرت ابھارنے و ناراحتی کا احساس دلانے میں پندرہ سال لگے اور طاغوت کو گرانے میں ایک رات لگی۔ لوگ امام حسین علیہ السلام کے ساتھ کربلا میں کیوں نہیں آئے؟ چونکہ یزید کے نظام سے ناراحت و ناراض نہیں تھے۔ انہیں یزیدیت سے نفرت نہیں تھی۔ جن جن کو نفرت تھی وہ کربلا آ گیا۔ جس طرح اللہ کی محبت مقدس ہے اسی طرح طاغوت سے نفرت بھی مقدس ہے۔ جس طرح ولایت مقدس ہے اسی طرح تبریٰ بھی مقدس ہے۔

اعلانِ غدیر کے تارکین سے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا اظہارِ برائت

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا جب مسجد میں حاضر ہوئیں تو دو خطاب کئے۔ ایک عمومی اور ایک خصوصی۔ عمومی خطاب حکمرانوں اور عوام دونوں سے کیا۔ لیکن ایک خصوصی خطاب حکمرانوں سے کیا جو عوام کیلئے نہیں تھا اور ایک خصوصی خطاب عوام سے کیا جو حکمرانوں کیلئے نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ خطاب فقط مسجد میں موجود لوگوں کیلئے نہیں تھے بلکہ ان لوگوں کی مانند جو لوگ جہاں کہیں بھی ہوں جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کا خطاب ان سب کے لیے ہے۔ آپ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں:

لَا عَهْدَ لِيْ بِقَوْمٍ أَسْوَءَ مَحْضَرًا مِنْكُمْ، تَرَكْتُمْ رَسُوْلَ اللهِ صَلَى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ جَنَازَةً بَيْنَ أَيْدِيْنَا وَ قَطَعْتُمْ أَمْرَكُمْ فِيْمَا بَيْنَكُمْ، وَ لَمْ تُؤْمِرُوْنَا وَ لَمْ تَرَوْا لَنَا حَقًّا، كَأَنَّكُمْ لَمْ تَعْلَمُوْا مَا قَالَ يَوْمَ غَدِيْرِ خُمٍّ، وَ اللهِ لَقَدْ عَقَدَ لَهٗ يَوْمَئِذٍ الْوِلَاءَ لِيَقْطَعَ مِنْكُمْ بِذٰلِكَ مِنْهَا الرَّجَاءَ، وَ لٰكِنَّكُمْ قَطَعْتُمُ الْأَسْبَابَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ نَبِيِّكُمْ، وَ اللهُ حَسِيْبٌ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ......[1]

---

[1]......(الاحتجاج-أبی منصور أحمد بن علی بن أبی طالب الطبرسیؒ)

میں ایسی قوم کو نہیں جانتی جو تمہاری طرح بدرفتار ہو۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جنازہ ہمارے سامنے رکھ کر چھوڑ گئے اور اس عہد و پیمان کو جو ہمارے اور تمہارے درمیان تھا توڑ دیا اور مسلّم حق کو واپس نہیں کیا۔ گویا تم جانتے ہی نہیں ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم کے دن کیا کہا تھا۔ خدا کی قسم! اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کی ولایت و رہبری کو بیان کیا تا کہ تم فرصت طلب اور قدرت کے بھوکوں سے امید کو قطع کر دو لیکن تم نے اس رابطہ کو جو تمہارے اور نبی کے درمیان تھا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خداوند متعال ہی دنیا و آخرت میں ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے۔

یہ پراپرٹی کے چھن جانے کی رنجش نہیں ہے۔ آج ہم معمولی لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ پلاٹ، گھر و گاڑی چھن جاتی ہے تو بھی اتنا واویلا نہیں کرتے۔ اُن کو کہتے بھی ہیں کہ رپورٹ درج کراؤ تو کہتے ہیں کیا درج کرانی ہے اور لے لیں گے۔ جب ایک عام آدمی کی پراپرٹی ہاتھ سے چلی جائے تو اتنا رنجیدہ نہیں ہوتا تو کیا اس صدیقہ، طاہرہ، مبارکہ، زکیہ، راضیہ، مرضیہ، محدّثہ وجاہتِ خدا کے دل میں پلاٹ و درختوں کے چلے جانے پر اتنی رنجش پیدا ہوگئی؟ ماجرا کچھ اور تھا۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا ماجرا بیان فرما رہی ہیں کہ مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے تم سے زیادہ برے لوگ سنے یا دیکھے ہوں۔ لَا عَهْدَ لِي یعنی اصلاً ایسی قوم میری یاد میں نہیں ہے، نہ قرآن میں اتنی بری قوم پڑھی اور نہ تاریخ میں۔ قرآن میں جتنی قوموں کا تذکرہ آیا ہے مثلاً عاد و ثمود، بنی اسرائیل، قومِ نوح و قومِ لوط اور انبیاء علیہم السلام کی قاتل قوموں کا ذکر آیا ہے وہ سب جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے ذہن میں تھیں لیکن جن کے سامنے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا یہ خطبہ بیان فرما رہی ہیں ان سے کہتی ہیں:

لَا عَهْدَ لِيْ بِقَوْمٍ أَسْوَءَ مَحْضَرًا مِنْكُمْ، تَرَكْتُمْ رَسُوْلَ اللهِ صَلَى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ جَنَازَةً بَيْنَ أَيْدِيْنَا،

تم سے بری قوم مجھے یاد نہیں ہے۔ تم رسولؐ کا جنازہ ہمارے ہاتھوں پر چھوڑ کر چلے گئے۔

وَ قَطَعْتُمْ أَمْرَكُمْ فِيْمَا بَيْنَكُمْ، وَلَمْ تُؤْمِرُوْنَا وَلَمْ تَرُوْا لَنَا حَقًّا،

تم نے عہد شکنی کی۔ تم نے ہمیں اپنا امیر و حاکم نہیں بنایا، اور اصلاً ہمارے حق کو تم نے قبول نہیں کیا، تم

ہمارے لئے کسی حق کے قائل ہی نہیں ہوئے،

كَأَنَّكُمْ لَمْ تَعْلَمُوْا مَا قَالَ يَوْمَ غَدِيْرِ خُمٍّ، وَ اللهِ لَقَدْ عَقَدَ لَهُ يَوْمَئِذٍ الْوِلَاءَ لِيَقْطَعَ مِنْكُمْ بِذٰلِكَ مِنْهَا الرَّجَاءَ،

تم ایسے بن گئے کہ کچھ جانتے ہی نہیں کہ غدیر خم میں کیا کہا گیا تھا، گویا تم وہاں تھے ہی نہیں۔ مجھے پتا تھا کہ تمہارے دلوں میں کیا کینہ ہے، تمہاری یہ حالت کیوں ہے؟ اس لئے کہ غدیر خم میں میرے بابا نے علیؑ کی ولایت کا اعلان کر کے تمہارے اقتدار کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اس لئے آج تم ایسے بن کر بیٹھ گئے ہو جیسے غدیر میں تھے ہی نہیں۔

قرآن نے بھی یہی اعلان کیا:

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ......[1]

آج کافر لوگ تمہارے دین سے مایوس ہو چکے ہیں......

غدیر اُن لوگوں کیلئے مایوسیوں کا دن ہے جنہوں نے پہلے سے اقتدار کیلئے منصوبے بنا رکھے تھے۔

وَلٰكِنَّكُمْ قَطَعْتُمُ الْأَسْبَابَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ نَبِيِّكُمْ، وَاللهُ حَسِيْبٌ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ......

تم نے اپنے اور نبی کے درمیان تعلق کو کاٹ دیا اور خدا ہمارے اور تمہارے درمیان آخرت کے دن فیصلہ کرے گا۔

پس مجھے تم سے زیادہ کوئی بری قوم نہیں لگتی جو تاریخ میں گزری ہو۔ اس لئے کہ تمہارے سامنے ولایت ترک کر دی گئی، اعلانِ غدیر رد کر دیا گیا لیکن تمہیں کچھ بھی نہیں ہوا، تم بالکل نارمل و معمول کے مطابق رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس لئے بی بی سلام اللہ علیہا کے دل میں رنجش تھی۔

---

[1]......(سورۃ المائدۃ، آیہ ۳)

طاغوت سے برائت کے بغیر نظامِ ولایت ناممکن

پس جب تک لوگ طاغوت سے رنجور و ناراض نہیں ہوتے اُس وقت تک کبھی بھی ولایت حاکم نہیں ہوسکتی۔ ائمہ علیہم السلام کے ہوتے ہوئے طاغوت حکومتوں میں رہے کیونکہ عوام، مسلمان و مومنین ائمہ علیہم السلام سے محبت کرتے تھے لیکن طاغوت سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ طاغوتوں کے تحت رہنا اپنے لئے کوئی عار و عیب نہیں سمجھتے تھے۔ سید الشہداء علیہ السلام نے اس کو اپنے لئے ننگ و عار قرار دیا:

فَاِنِّیْ لَا أَرَی الْمَوْتَ اِلَّا سَعَادَةً وَالْحَیَاةَ مَعَ الظَّالِمِیْنَ اِلَّا بَرَمًا......[1]

اور شجاعت کی موت کو ایک سعادت سمجھتا ہوں اور ظالموں کے ساتھ زندگی گزارنا میرے نزدیک ذلت اور حقارت ہے......

ظالموں کے ساتھ رہنا، ظالمانہ نظام میں رہنا میں اپنے لئے ننگ و عار سمجھتا ہوں۔ سید الشہداء علیہ السلام نے کتنی کوشش کی کہ یزید کے خلاف نفرت وتبریٰ عمومی ہوجائے لیکن عوام بیدار نہیں ہوئے۔ کہتے تھے کہ ٹھیک ہے یزید غلط ہے لیکن وہ اپنے گھر میں ہے اور ہم اپنے گھر میں، وہ اپنا کام کررہا ہے ہم اپنا کام کررہے ہیں۔ اس لئے جناب سیدہ سلام اللہ علیہا ہر اُس شخص سے ناراحت ہوگئیں جو نظامِ طاغوتیت سے ناراض نہیں تھے۔ حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی ناراضگی آج تک ختم نہیں ہوئی۔ پس طاغوت سے رنجش پیدا ہونا ضروری ہے۔ طاغوت سے نفرت میراثِ فاطمہؑ و راہِ فاطمہؑ ہے۔ بی بی سلام اللہ علیہا کا عمل گواہی دے رہا ہے کہ خدا وحدہ لاشریک ہے۔ مسلمان کے لیے "لا" کہنا بہت مشکل ہے کیونکہ "لا" کہنا قیمت وقربانی مانگتا ہے۔

مولا علی علیہ السلام اور "لا" کہنے کی قیمت

ابن ابی الحدید معتزلی اپنی سب سے قدیمی تفسیر نہج البلاغہ میں ایک مطلب نقل کرتے ہیں کہ کربلا

---

[1]......(بحار الانوار-علامہ مجلسیؒ، الجزء ۴۴، صفحہ ۱۹۳)

میں بنواُمیہ نے اُن کشتہ شدگان کا انتقام لیا تھا جو امیر المومنین علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔قریش وبنواُمیہ سب کا انتقام علی علیہ السلام کی اولاد سے لیا گیا۔جو علی علیہ السلام کے ہاتھ سے قتل نہ بھی ہوا ہواُس کا بھی انتقام علی علیہ السلام کی اولاد سے لیا گیا۔کیونکہ جب خلیفہ سوم قتل ہوئے تو اُن کے قتل کے بعد مطالبہ علی علیہ السلام سے کیا گیا کہ مجرم آپ کے پاس ہیں لہٰذا آپ ہمارے حوالے کریں۔اس کے لئے تحریکیں چلیں،دمشق میں خلیفہ کی خون آلود قمیض کا جھنڈا بنا کر جلوس نکالے گئے۔اصحابِ جمل بھی یہی کام کر رہے تھے کہ آپ خلیفہ سوم کے قتل کا جواب دیں۔

امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

وِ إنَّهُمْ لَيَطْلُبُوْنَ حَقًّا هُمْ تَرَكُوْهُ وَ دَمًا هُمْ سَفَكُوْهُ...... ۱؎

وہ مجھ سے اس حق کا مطالبہ کرتے ہیں جسے خود ہی انہوں نے چھوڑ دیا اور اس خون کا عوض چاہتے ہیں جسے انہوں نے خود بہایا ہے......

پس "لَا" جو بھی کہے گا قیمت ادا کرے گا۔بتوں کو "لَا" کہنے پر نمرود کی آگ میں جانا پڑے گا،فرعون کو "لَا" کہے گا تو اُسے ظلم وستم کا نشانہ بننا پڑے گا،شرک کو "لَا" کہے گا تو اُسے طائف میں پتھر کھانے پڑیں گے اور مکہ میں اذیت دی جائے گی،جو بھی طاغوتی نظام کو "لَا" کہے گا اُس کی اولاد سے آخر تک انتقام لیا جائے گا۔

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک نظامِ ولایت کتنی بڑی قربانیاں دے رہا ہے؟ کس چیز کی؟ اسی "لَا" کی کیونکہ امام خمینیؒ نے سورۂ نور آیہ ۳۵ سے یہ شعار بلند کیا تھا:

"لَا شَرْقِيَّةٍ وَ لَا غَرْبِيَّةٍ" ......۲؎

یہ گواہی ہے کہ نہ شرقی نظام اور نہ غربی نظام،نہ کیمونزم،نہ امپیریل ازم،نہ امریکہ کے غلام نہ کسی اور طاقت کے غلام بلکہ نظام فقط خدا کا الٰہی وولائی نظام ہے۔اس کی قیمت چھتیس سال سے ادا ہو رہی ہے۔

۱؎......(نہج البلاغہ،خطبہ ۱۳۵)

۲؎......(التربية والمجتمع مظاهر عينية من فكر الامام الخمينیؒ)(خط الامام الخمينیؒ) (الامام الخمينیؒ...... الفكر والثورة)(مكانة العلماء فی فكر الإمام الخمينیؒ)

قوم کی شہادت

قوم جو اعمال انجام دے رہی ہوتی ہے وہ اس کی شہادت ہوتی ہے۔ ہم پاکستانی آج جو کچھ کر رہے ہیں یہ پاکستانی قوم کی شہادت ہے۔ آج اگر پاکستانی حکمران امریکہ کے دروازے پر جا کر جھک جاتے ہیں، غلامی کرتے ہیں تو یہ ان کی گواہی ہے۔ یہ شہادت دے رہے ہیں کہ امریکہ و مغرب ہمارا رب ہے۔ آج اگر کوئی باہر سے پاکستان آئے اور یہاں کے حالات مشاہدہ کرے تو جو کچھ یہاں دیکھے گا وہ ہماری شہادت ہے۔ آج جو کچھ تشیع کے عمل میں مجسم ہے وہ اس کی شہادت ہے۔ اگر آپ زبان سے علی ولی اللہ کہیں لیکن حکومت طاغوت کو دیں یا طاغوت کو چنیں تو جو کر رہے ہیں وہ شہادت ہے، نہ کہ جو کہہ رہے ہیں۔

اس وقت پاکستان میں مسلمان وحدت کی شہادت نہیں دے رہے چونکہ عمل سے وحدت و نظامِ خدا کی طرف حرکت نہیں کر رہے بلکہ طاغوتی نظام، مغرب نوازی و مغرب پرستی کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ گواہی لکھی جا رہی ہے۔ اقوال جھوٹ ہیں سچائی صرف اس گواہی و شہادت کے اندر ہے جو عمل میں مجسم ہو رہی ہے۔

قوم کی شہادت

شہادت سے انحراف کا انجام

اب اگر ہم نے زبان بدل لی اور گواہی کسی اور چیز کی دی تو اللہ کو یہ کہنے میں شرم نہیں آتی:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِ ......[1]

بے شک اللہ ذرا نہیں شرماتا......

بعض اوقات عرب کے بدو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر اُلٹی سیدھی باتیں کیا کرتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مروت و شرم میں اُنہیں کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو خطاب کر کے فرمایا کہ رسولؐ کو شرم آ جاتی ہے لیکن اللہ کو یہ کہنے میں شرم نہیں آتی:

---

[1]......(سورۃ البقرہ، آیہ ۲۶)

يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ إِلَّآ أَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ إِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ إِنٰهُ وَلٰكِنْ إِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ إِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِ مِنَ الْحَقِّ......[1]

اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں داخل نہ ہونا مگر یہ کہ تمہیں کھانے کے لئے اجازت دی جائے اور نہ ہی پکنے کا انتظار کرو لیکن جب دعوت دے دی جائے تو داخل ہو جاؤ اور جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور باتوں میں لگے بیٹھے نہ رہو۔ یہ بات نبی کو تکلیف پہنچاتی ہے مگر وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں لیکن اللہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا......

پس باز آجاؤ ورنہ خدا تمہیں رسوا کر دے گا۔

جیسا عمل ویسی شہادت

اگر آپ کے عمل سے جمہوریت ٹپک رہی ہے تو آپ گواہی دے رہے ہیں کہ آپ امامی نہیں بلکہ جمہوری ہیں، اگر آپ کے عمل سے آمریت لگ رہی ہے تو آپ کا عمل گواہی دے رہا ہے کہ آپ امامی نہیں بلکہ آمری ہیں اور اگر آپ کے عمل سے خلافت ٹپک رہی ہے تو آپ کا عمل گواہی دے رہا ہے کہ آپ امامی نہیں بلکہ خلافتی ہیں۔ آپ امامیہ اُس وقت ہوں گے جب نظامِ ولایت کی شہادت دیں گے۔ اس وقت ہر نظام کے حامی اپنے اپنے نظاموں کا پرچار کر رہے ہیں اور اس کیلئے جدو جہد کر رہے ہیں لیکن اس ملک میں رہنے والی ایک قوم کا عمل امامت کی گواہی و شہادت نہیں دے رہا۔

امامت کی شہادت سے پہلے توحید کی شہادت چاہئے چونکہ ولایتِ علیؑ دراصل اللہ کا نظام ہے۔ جب ہمارے عمل میں خدا کی وحدانیت آجائے گی اس وقت ہم ولایت کی گواہی کے قابل بن سکتے ہیں۔ ابھی تو ہم توحید و رسالت کی گواہی نہیں دے سکے۔ ہماری زندگیوں میں کون سی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے؟ کیا ہماری

---

[1]......(سورۃ الاحزاب، آیہ ۵۳)

ہماری سیاست، عدالت، تعلیمی نظام، معیشت، کاروبار، گھریلو ماحول، تہذیب وکلچر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے؟ جب کوئی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نہیں ہے تو صرف زبانوں پر ذکر مدینہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ ہم صرف زبانوں سے مچلے ہوئے ہیں کہ سوہنا آ گیا، سوہنا آ گیا لیکن سوہنا آ کر دیکھے کہ ہم کر کیا کر رہے ہیں تو شرم سے نظریں نہیں اٹھا سکیں گے۔

آج قوم کے اندر دردِ فاطمہؑ زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ شہادتِ وحدانیتِ خدا، شہادتِ رسالت وشہادتِ ولایت کی ضرورت ہے۔ قوم کا بچہ بچہ، فرد فرد، ہر مرد وزن توحید سے ولایت تک شہادت دے کیونکہ راہِ نجات اسی کے اندر ہے۔ سیرتِ فاطمیہؑ، انقلابِ فاطمیہؑ وحماسۂ فاطمیہؑ سے یہ کام ہوسکتا ہے۔

نسلِ کوثر کی قربانی

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی لسان، عمل، شہادت ووصیت خدا کی وحدانیت کی گواہی دے رہی تھی۔ اس وقت امت میں کسی کے اندر شہادت کی جرأت نہیں تھی لہٰذا فقط بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا میدان میں اُتریں اور پھر بھاری قیمت ادا کی۔ خدا نے اسی لئے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو کوثر کہہ کر فرمایا:

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ ○......[1]

لہٰذا آپ اپنے رب کے لئے نماز پڑھیں اور قربانی دیں۔

اے رسولؐ! آپ پریشان نہ ہوں، ہم نے آپؐ کو کوثر دی ہے، اب جبکہ کوثر آ گئی ہے تو آپؐ نے دو کام کرنے ہیں۔ بندگی خدا اور نحر وقربانی۔

کوثر یعنی ایسا منبع نسل دیا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ کوثر کی نسل قربانی دے گی اور ظالم جتنی قربانیاں لیں لیکن کوثر کو ختم نہیں کر سکتے۔ اس لئے خدا نے کوثر بنایا ہے چونکہ اس کو قربانیاں بہت دینی ہیں۔ پھر سب نے دیکھا کہ حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی اولاد نے راہِ خدا میں قربانیاں پیش کیں اور پہلی قربانی خود جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے دی۔

---

[1]......(سورۃ الکوثر، آیہ ۲)

تأویل کا مطلب

پھر جنابِ سیدہ طاہرہ سلام اللہ علیہا نے اپنے حماسی خطبہ کے اندر لوگوں کو متوجہ کیا:

كَلِمَةٌ جُعِلَ الْإِخْلَاصُ تَأْوِيْلَهَا، ......

اخلاص کو کلمہ توحید کی تاویل قرار دیا گیا ہے۔

تأویل، اَوْلٌ سے ہے۔ اَوْلٌ یعنی لوٹنا، رجوع کرنا۔ آل یعنی رَجَعَ یا اَرْجَعَ، رجوع کرنا یا رجوع دینا، تاویل جب تصریف کے معنٰی میں چلا جائے یعنی رجوع دینا، لوٹانا، پلٹانا۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کو کسی اور چیز کی طرف لوٹا یا و پلٹایا جاتا ہے۔ معانی اسی قبیل سے ہیں اور تاویل معانی کی ہوتی ہے یعنی معانی کو اپنے حقائق کی طرف پلٹانا تاویل کہلاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کسی شے یا کسی معنٰی کا اپنی حقیقت کی طرف لوٹنا یا اسے لوٹانا تاویل کہلاتا ہے لیکن الفاظ تاویل پذیر نہیں ہیں اور دقیقاً تاویل کا معنٰی لفظ میں استعمال نہیں ہوتا۔

تأویل وتفسیر کا فرق

تأویل تفسیر کے مقابلے میں ہے۔ الفاظ کے ذریعے معنٰی ومفہوم کشف کرنا، ان کی وضاحت کرنا اوران کے ابہام واجمال کو دور کرنا تفسیر کہلاتا ہے۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے متعدد آیاتِ قرآنی میں لفظِ تاویل کا ذکر فرمایا ہے۔ اللہ نے جہاں اپنے برگزیدہ بندوں کو دیگر نو کا علم عطا کیا وہاں انہیں تاویل کا علم یا طاقتِ تاویل عطا کی ہے۔ جس طرح خداوند تعالیٰ نے حضرتِ یوسف علیہ السلام کو صلاحیت تاویل عطا کی۔ اسی طرح اُس عبد صالح کو بھی تاویل کی قوت عطا کی جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف مزید رہنمائی کے لئے روانہ کیا۔ انہیں قرآن میں عبد صالح جبکہ روایات میں خضر کا نام دیا گیا ہے۔ جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انہوں نے سفر کیا تو اس مختصر سفر میں مختلف واقعات پیش آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہر موقع پر سوال کیا جبکہ کہا تھا کہ میں پوچھوں گا نہیں، اعتراض نہیں کروں گا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بار بار ہر ماجرا کے بعد معترضانہ سوال اُٹھائے تو تیسرے سوال کے بعد حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ آپ صبور نہیں نکلے، میں نے استقامت نہیں دیکھی

اوراب ہمارے اور تمہارے درمیان فراق ہے۔ وہاں جنابِ خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اب جو کچھ تو نے پوچھا یا دیکھا کہ دیوار کیوں تعمیر کی، بچے کو کیوں قتل کیا اور کشتی میں کیوں سوراخ کیا؟ میں اُس کی تاویل بتاتا ہوں۔ آپؑ نے یہ نہیں کہا کہ میں ان واقعات کی تفسیر، وضاحت یا تشریح پیش کرتا ہوں۔

اردو اور فارسی میں تأویل کا مطلب

اُردو میں تاویل کسی بات کے خلافِ ظاہر معنیٰ بیان کرنے اور کسی بات کو اپنے معنیٰ سے ہٹا کر اس کا رخ موڑ دینے کو کہتے ہیں۔ جیسے اکثر کہتے بھی ہیں کہ آپ اس حدیث یا اس بات کی تاویل کر رہے ہیں۔ بہت سارے بزرگان کے کلام میں بھی یہ نکتہ موجود ہے اور علامہ اقبالؒ یا دیگر بزرگان نے اپنے اشعار میں اسے بیان کیا ہے۔ جیسے ملائے رومی فرماتے ہیں:

کردہ ای تاویل حرف بکر را

خویش را تاویل کن نہ ذکر را.....[1]

یعنی بہت ہی بکر، تازہ، ناب وخالص بات کی تم نے تاویل وتوجیح کر دی ہے یعنی اُس کا جو ظاہر و واضح معنیٰ تھا اُس سے ہٹا کر ایک غیر معروف معنیٰ کر دیا ہے۔

اُردو اور فارسی میں لفظِ تاویل پھیر دینے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ پس جسے عربی میں تحریف کہا جاتا ہے اُسے فارسی اور اُردو میں تاویل کہا جاتا ہے۔ خود قرآنِ مجید میں تحریف کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسے یہود کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ماہرِ فنِ تحریف تھے۔

حرف کو حرف اسی پھیرنے کی وجہ سے کہتے ہیں۔ حرف یعنی پھیرنا یا گھما دینا چونکہ گھومنے سے حرف ادا ہوتا ہے۔ انسان کی ہوا یا زبان گھومتی ہے یا اور بھی توجیحات ہیں اور اس گھومنے سے لفظ ادا ہوتے ہیں اس وجہ سے اسے حرف اور حروف کہتے ہیں۔ تحریف اسی پھیرنے کو کہتے ہیں یعنی ہٹا دینا اور گھما دینا۔

---

[1]..... (مثنوی معنوی-مولانا روم، دفتر اول، بخش ۵۹، قصہ مکر خرگوش)

آیاتِ متشابہات سے مراد

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ہم نے دوطرح کی آیات نازل کی ہیں:

هُوَ الَّذِیٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ......[1]

وہی ذات ہے جس نے آپ پر وہ کتاب نازل فرمائی جس کی بعض آیات محکم ہیں، وہی اصل کتاب ہیں اور کچھ متشابہ ہیں......

محکمات اساس، مسلمات، اُم الکتاب واُم الآیات ہیں۔متشابہات کے معانی واضح وروشن ہوتے ہیں لیکن ان میں تشابہ پایا جاتا ہے۔متشابہات مجملات ومبہمات کونہیں کہتے۔قرآن میں کوئی آیت مبہم ومجمل نہیں ہے۔چونکہ قرآن بیان،مبین وتبیان ہے اور بیان کبھی مجمل نہیں ہوتا۔ بیان بیّن سے ہے یعنی واضح و روشن۔مبین یعنی جو بہت واضح وروشن ہو۔پس یہ خود دلیل ہے کہ قرآن کی کسی آیت میں ابہام واجمال نہیں ہے لیکن تشابہ ہے۔بعض لوگ اپنی کتابوں کے اندر یہ معنٰی لکھ بھی دیتے ہیں کہ متشابہات اُن آیات کو کہتے ہیں جن کے معانی واضح نہ ہوں جبکہ متشابہ اُن آیات کو کہتے ہیں جن کے معانی بالکل واضح ہوں لیکن یہ واضح معانی قرآن کے محکمات واصولوں کے مطابق نہ ہوں۔

آیاتِ متشابہات کوتأویل کی ضرورت

اس لئے اُن متشابہات کوتاویل کی ضرورت ہوتی ہے اوراگرانسان ان آیات کا معنٰی انہیں بغیر تاویل کئے انجام دےتوغلطی واشتباہ کرے گا۔بعض لوگ تاویل کی غرض سے متشابہات کی پیروی کرتے ہیں اوربعض لوگ ان متشابہات سے فتنہ ڈالنا چاہتے ہیں:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗ

---

[1]......(سورۃ آل عمران،آیہ۷)

آیاتِ متشابہات سے مراد

إِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ......

جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ اور تاویل کی تلاش میں متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جبکہ اس کی (حقیقی) تاویل تو صرف خدا اور علم میں راسخ مقام رکھنے والے ہی جانتے ہیں......

جن کے دلوں کے اندر زیغ، گمراہی، کھوٹ و انحراف ہے اور علمِ تاویل نہیں رکھتے وہ متشابہات کو چن کر ان کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ متشابہات کے واضح و روشن معانی اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہیں جب تک ان معانی کی تاویل نہ ہو جائے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے اصحابِ سجن یعنی جیل کے ساتھیوں کے خواب کی تاویل کی جسے ہم تعبیر بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح خود حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب دیکھا اور پھر اپنے والد بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ یہ خواب بھائیوں کو مت سناؤ کہ وہ مکر کریں۔

يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى إِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ......[1]

بیٹا! اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا ورنہ وہ آپ کے خلاف کوئی چال سوچیں گے......

وہ تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔ بحر کیف وہ خواب کسی طرح بھائیوں کو پتا چل گیا۔ اب فلم والے نے کوشش کی ہے کہ کس طرح لیک آؤٹ ہوا لیکن حقیقتاً کیسے پتا چلا یہ نہیں معلوم۔ ظاہراً خواتین کے ذریعے یہ خواب بھائیوں نے سن لیا اور اُس کے بعد انہوں نے وہ مکر کیا جو قرآنِ مجید اور تاریخ میں موجود ہے۔ برادرانِ یوسف محاورہ بن گئے یعنی وہ بھائی جو بھائی کو کنوئیں میں پھینک دیں، بھائی کی موت کے درپے ہو جائیں، بھائی کو تحمل نہ کر سکیں۔ بحر کیف حضرت یوسف علیہ السلام نے جب مصر جا کر حکومت قائم کر لی اور اموال کے امین بنے تو وہاں آخر کار بھائی اور والدین بھی آ ملے۔ اُس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ یہ ہے اُس خواب کی تاویل جو میں نے دیکھا تھا۔

غرضیکہ قرآنِ مجید میں کئی جگہ تاویل الاحادیث یا تاویل خواب کا ذکر موجود ہے۔ بعض علماء نے تاویل القرآن پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ جس طرح تفسیر قرآن کی کتب ہیں اسی طرح تاویل کی بھی کتابیں ہیں۔

---

[1]......(سورۃ یوسف، آیہ ۵)

معروف ترین تاویل کی کتاب تفسیر ابن عربی کے نام سے مشہور ہے جبکہ یہ کتاب کسی اور مولف کی ہے۔ یہ تاثر غلط ہے کہ چونکہ قرآن مشکل ہے لہٰذا اس میں تاویل کی ضرورت پیش آتی ہے۔

قرآن آسان ہے

قرآن میں کوئی چیز مشکل نہیں ہے۔ اگرچہ مفسرین، محشّیین، مدرسین، مترجمین، نحویوں، صرفیوں اور ادیبوں نے مل کر اسے مشکل بنانے کی کوشش کی کہ جہاں سے جبرئیل علیہ السلام نے اُتارا تھا وہیں لوحِ محفوظ و ملکوتِ اعلیٰ میں واپس لوٹا دیں تا کہ کسی کو بھی سمجھ نہ آئے لیکن پھر بھی اللہ نے چونکہ اہتمام کیا ہے اور خود ہی اُس کی حفاظت کا ذمہ بھی لیا:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ○......[1]

اس ذکر کو یقیناً ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے:

وَ لَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ......[2]

اور ہم نے اس قرآن کو آسان بنا دیا ہے......

بیشک آپ اسے مشکل بنانے کی کوشش کریں لیکن پھر بھی یہ آسان رہے گا۔ لہٰذا کبھی بھی قرآن سمجھتے ہوئے یہ احساس دل میں نہ رکھیں کہ قرآن مشکل وفہم سے بالاتر کتاب ہے اور اسے سمجھنے کے لئے فلاں فلاں کی ضرورت ہے۔ مشکل ہمارے ذہن میں ہے۔ ہمارا ذہن آمادہ نہیں ہوتا ورنہ یہی قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اعراب، بدوؤں اور دیہاتیوں کو تفسیر کئے بغیر سناتے تھے تو وہ سمجھ جاتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا فرما رہے ہیں۔ ہم چونکہ آیت کے معانی سمجھ کر پھر اُس میں اور چیزوں کی تلاش میں ہوتے ہیں لہٰذا مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔

---

[1] ......(سورۃ الحجر، آیہ ۹)

[2] ......(سورۃ القمر، آیہ ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰)

اسی طرح تاویل کا مطلب سمجھنا بھی آسان ہے۔اگر یسرنا نہ بھی کہتے تو فقط لفظِ نزول ہی کافی ہے کہ ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے۔قرآن کے نزول کا مطلب اوپر سے نیچے آنا نہیں بلکہ قابل فہم ہونا ہے۔یعنی ہم قرآن کو آپ کی سطحِ ذہنی کے مطابق لے آئے ہیں۔یہ قرآن جب ملکوت وکتابِ مکنون میں تھا تو دسترس سے باہر تھا:

لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلۡمُطَهَّرُونَ ۝......[1]

جسے صرف پاکیزہ لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔

اُس وقت تمہارے لئے قابل فہم نہیں تھا لیکن ہم نے اہتمام کیا اور قرآن کو ایسے مراحل سے گزارا کہ تمہارے لئے قابل فہم بن گیا۔مشکل قرآن میں نہیں بلکہ ہمارے پاس ہے۔اگر عربی زبان سیکھ کر سمجھتے تو نورٌعلیٰ نور تھا لیکن زبان سیکھے بغیر ترجموں کے ساتھ پڑھیں تو بھی بالآخر نور ضرور ہے اور انسان قرآن کے معانی و مطالب کو سمجھ جاتا ہے۔

معانی تک پہنچنا مقصد نہیں

جو افکار و باتیں ہم الفاظ کی مدد سے ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں ان الفاظ کے معانی و مفاہیم ہیں اور یہ معانی و مفاہیم ہمارے ذہنوں میں ہیں۔ان مفاہیم کی حقیقت خارج از ذہن موجود ہے یعنی ایک لفظ ہے دوسرا مفہوم ہے اور تیسرا حقیقت و مصداق ہے۔الفاظ مافی الضمیر کو اظہار کرنے کا ذریعہ ہیں۔ضمیر یعنی جو بات آپ کے باطن، ذہن یا دل میں ہے اسے الفاظ کی مدد سے پیش کردیتے ہیں۔

اگر آپ کے سامنے نامانوس الفاظ پیش کئے جائیں جن کے معانی ہم نہیں سمجھتے تو ان الفاظ کی تشریح کر کے مفاہیم پیش کرنا یا الفاظ کی مدد سے معانی بیان کرنا تفسیر کہلاتا ہے۔تفسیر یعنی الفاظ کے ذریعے ذہن و دل کی مراد پیش کرنا۔مفسرین صرف الفاظ کے معانی و تشریح بیان کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہم معانی سمجھ کر منزل تک پہنچ گئے ہیں اور ہمیں انہی معانی تک پہنچانا مقصود تھا۔

---

[1]......(سورۃالواقعۃ،آیہ ۷۹)

معانی، الفاظ کی قیمت

الفاظ میں معانی نہ ہوں تو الفاظ کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ الفاظ کی قیمت معانی کی وجہ سے ہے مثلاً مہمل الفاظ بے قیمت الفاظ ہیں کیونکہ ان کے کوئی معانی نہیں ہیں۔ مہملات کثرت سے استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً بعض لوگوں کی عادت ہے کہ تکیہ کلام، لذتِ زبان یا عادت پوری کرنے کے لئے ہر لفظ کے ساتھ ایک مہمل لفظ بھی استعمال کرتے ہیں جیسے پانی وانی، پانی شانی، روٹی شوٹی، کام وام وغیرہ۔ ایک شخص جسے مہملات بولنے کی عادت تھی اسے کسی نے ٹوکا کہ تم جو بات کرتے ہو اس میں مہمل بھی لگا دیتے ہو تو اُس نے کہا کہ یہ ہماری عادت وادت ہوگئی ہے کہ ہم مہمل شہمل ساتھ لگا دیتے ہیں اور بعض تو اس درجہ آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ مستعمل استعمال ہی نہیں کرتے بلکہ مہملات استعمال کرتے ہیں یعنی وہ باتیں جو لایعنی باتیں کہلاتی ہیں۔

خطبۃ المتقین میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ متقی وہ ہے جس کی زبان سے لایعنی و بیہودہ بات نہیں نکلتی۔

بَعِيدًا فُحشُهُ، لَيِّنًا قَوْلُهُ......

بے ہودہ بکواس اس کے قریب نہیں پھٹکتی، اس کی باتیں نرم ہیں......

اور

مَنْطِقُهُمُ الصَّوَابُ......[1]

ان کی گفتگو جچی تلی ہوئی ہوتی ہے......

لایعنی باتیں ایسی اول فول اور بے فائدہ باتیں جن سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ بات برائے بات یا بحث برائے بحث جو گھنٹوں بیٹھ کر ادھر اُدھر کی ہانکتے ہیں۔ کبھی ٹریفک میں چلے جاتے ہیں، ٹریفک سے نکل کر سیاست میں چلے جاتے ہیں، سیاست سے نکل کر الیکشن میں چلے جاتے ہیں، الیکشن سے نکل کر کسی اور کی غیبت شروع کر دیتے ہیں۔ یہ سب لایعنی باتیں ہیں چونکہ آپ کے کسی کام نہیں آتیں۔ اگر چہ ان کے مفاہیم ہیں

---

[1]......(نہج البلاغہ، خطبۃ المتقین، خطبہ ۱۹۱)

لیکن یہ بھی مہملات ہی ہیں۔ لغتاً مہمل نہیں ہیں لیکن انسان اور تقویٰ کے لئے مہمل ہیں۔ ایسی باتیں انسان کا وقت ضائع کرتی ہیں کہ جن سے کچھ حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

ہر لفظ اتنا ہی قیمتی ہے جتنا اُس کا معنیٰ قیمتی ہے اور ہر لفظ اتنا ہی بے قیمت ہے جتنا اُس کا معنیٰ بے قیمت ہے۔ ہر لفظ اتنا ہی اچھا ہے جتنا اُس کا معنیٰ اچھا ہے اور ہر لفظ اتنا ہی قبیح ہے جتنا اُس کا معنیٰ قبیح ہے۔ تاریخ میں بہت سارے اچھے اچھے لوگوں کے نام یزید ہیں لیکن یزید ابن معاویہ کے بعد خصوصاً شیعوں میں یہ لفظ قبیح ترین ہو گیا ہے۔ لفظ تو قبیح نہیں تھا لیکن وہ شخص جس کا یہ نام رکھا گیا اتنا گندہ، پلید و بیہودہ تھا کہ اب کوئی یزید نام رکھنے کیلئے حاضر نہیں ہے۔ معانی کی قباحت الفاظ میں چلی جاتی ہے۔ اسی طرح معانی کا حسن بھی الفاظ میں چلا جاتا ہے۔ مثلاً علی اچھا لفظ ہے جو ''ع، ل، ی'' سے مل کر بنا ہے لیکن نہ ''ع'' میں کوئی خوبی ہے اور نہ ''ل''، ''ی'' میں بلکہ لفظِ علی کی خوبی اُس معنیٰ کی وجہ سے ہے جو حقیقت و شخصیتِ علیؑ کی حکایت کرتا ہے۔

طلبہ کی ابتدائی کتاب ''صرف امثلہ'' ہے۔ طالبعلموں کی بدقسمتی ہے کہ اُن کا علم شروع ہی صرف سے ہوتا ہے جو خشک اور عجیب و غریب علم ہے۔ بعض طالبعلم گردانیں دیکھ کر ہی بھاگ جاتے ہیں کہ یہ تو ہماری سمجھ سے بالا ہیں۔ جس طرح اسکول میں بچے کو پہلے دن ہی پہاڑے پڑھانا شروع کر دیں تو بچہ بھاگ جائے گا۔ صرف و نحو میں ہی پڑھتے ہیں کہ لغت عرب کی تین قسمیں ہیں: ''لغت عرب اسم است و فعل است و حرف''۔ ایک جگہ کوئی ظریف، بذلہ گو، بذلہ سنج و نکتہ سنج آدمی علماء میں بیٹھا ہوا تھا تو اُس نے کہا کہ لغت عرب کی تین قسمیں نہیں ہیں بلکہ ''لغت عرب حرف است و حرف است و حرف'' یعنی باتیں ہی باتیں ہیں۔ یہ اسم یعنی صفات و نشانیوں اور فعل یعنی عمل سے عاری ہے۔ اہلِ مدرسہ نہ تو کوئی عمل کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے اندر علامتیں، نشانیاں و صفات ہیں بلکہ صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔

حقائق، مفاہیم و معانی کی قیمت

اسی طرح الفاظ کے اندر خود کوئی تاثیر نہیں ہے بلکہ بے خاصیت ہیں۔ یہ جو زائچے وغیرہ بناتے

ہیں یہ بے شعور لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے ہے ورنہ ان الفاظ کے اندر کوئی تاثیر موجود نہیں ہے۔ الفاظ میں تاثیر معانی کی وجہ سے ہوتی ہے اور معانی و مفاہیم بھی بذاتِ خود بے قیمت ہیں بلکہ معانی کی ساری قیمت اُن حقائق کی وجہ سے ہے جن سے یہ معانی نکلے ہیں۔ معانی فقط ذہنی مفاہیم، ذہنی تصویریں، ذہنی تصورات و ذہنی تخیلات ہیں اور اگر یہ ذہنی تخیلات حقائق سے مربوط نہ ہوں، حقائق کے آئینہ دار نہ ہوں، حقیقت کو کشف نہ کررہے ہوں اور انسان کے لئے حقیقت تک پہنچنے کا زینہ، وسیلہ و ذریعہ نہ بن رہے ہوں تو ان مفاہیم کی بھی کوئی قیمت نہیں ہے۔

اگر آپ مہمل الفاظ کی کئی جلدوں پر مشتمل کتاب لکھیں جس میں دس لاکھ مہمل الفاظ ہوں اور پھر مہملات کی یہ کتاب بیچیں تو اس کی کوئی قیمت نہیں ملے گی۔ اسی طرح آپ ان کا ورد کریں مثلاً سو دفعہ ''شوٹی''، کہیں تو کوئی آپ کی فریاد نہیں سنے گا، ممکن ہے ایک دفعہ روٹی کہہ دیں تو کوئی ایک آدھ لاکر دے ہی دے۔ اسی طرح اگر آپ ایک دفعہ ''پانی'' کہیں تو ممکن ہے کوئی ایک گھونٹ پلا دے لیکن اگر ہزار دفعہ ''وانی شانی'' کہتے رہیں تو کوئی تاثیر نہیں ہے۔ مفاہیم یعنی ذہنی تصورات کا اگر ذہن سے باہر حقیقت و واقعیت کی دُنیا سے کوئی تعلق نہ ہو تو یہ مفاہیم بھی کسی کام کے نہیں ہیں۔ آپ سارا دن آنکھیں بند کرکے ذہن میں تصورات دہراتے و گزارتے رہیں تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔

دعائے نبویؐ اور ائمہ علیہم السلام

تعقیباتِ نماز کی یہ بہت خوبصورت دُعا ہے جو دُعائے نبویؐ اور تمام معصومین علیہم السلام کی دُعا ہے جس میں بے فائدہ علم سے پناہ مانگی گئی ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَ مِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وِ مِنْ صَلَاةٍ لَا تُرْفَعُ وَ مِنْ دُعَآءٍ لَا يُسْمَعُ......[1]

---

[1]......(مفاتیح الجنان)

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ نَفْسٍ لَاتَشْبَعُ،

اے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں تیری بارگاہ میں اُس نفس سے جو سیر نہیں ہوتا، جس میں حرص وطمع ہے، اسے جتنا مال دیں یہ اور زیادہ لالچی ہوتا جاتا ہے، اس کی آنکھیں نہیں بھرتیں، یہ انسان کیلئے خطرناک نفس ہے۔ سب سے زیادہ مہلک نفس وہ ہے جس کے اندر سیرابی نہ ہو، خواہشات پوری بھی کردیں پھر بھی نہیں کہتا کہ بس کافی ہے بلکہ کہتا ہے:

هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ؟

کیا مزید ہے؟

مجھے اور دو۔

وَمِنْ قَلْبٍ لَايَخْشَعُ،

سب سے برا دل وہ ہے جو نرم نہیں بلکہ قصی وشقی قلب ہے۔ قصی کی علامت یہ ہے کہ جس پر موعظہ، وعظ ونصیحت اثر نہ کرتی ہو اور جو سن کر ان سنی کردے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پناہ مانگ رہے ہیں کہ اے پروردگار! اس دل سے، اس کے شر سے تیری بارگاہ میں پناہ مانگتا ہوں۔ یہ دل نہیں چاہیے جس میں خشوع نہ ہو۔

وَمِنْ عِلْمٍ لَايَنْفَعُ،

اے پروردگار! ایسے علم کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو غیر نافع وغیر مفید ہو۔

امام علی رضا علیہ السلام سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْعِلْمُ اِمَامُ الْعَمَلِ وَالْعَمَلُ تَابِعَهٗ......[1]

علم، عمل کا پیشوا ہے اور عمل اس کے تابع ہے......

علم غیر نافع سے پناہ مانگنے کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ علم جو عمل میں تبدیل نہ ہوتا ہو۔ وہ علم جو انسان کو عمل کی وادی میں نہ اُتارتا ہو، جو صرف ذخیرۂ علمی شمار ہوتا ہو علم غیر نافع ہے۔ ایک وہ علم غیر نافع ہے جو انسان

---

[1]......(تفسیر مجمع البیان-أبی علی الفضل بن الحسن الطبرسیؒ، الجزء ۲، ص ۲۳۰)

کو حقائق تک نہ پہنچاتا ہو، جس کے ذریعے حقیقت کشف نہ ہوتی ہو بلکہ صرف ذہنی معلومات، تصورات و تخیلاتِ ذہنیہ ہوں۔ اس لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا سے الہامِ الٰہی کے تحت دو دُعائیں مانگتے تھے:

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ○......[1]

پروردگارا! میرے علم میں اضافہ فرما۔

اور ساتھ ہی یہ بھی فرماتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْاَشْیَاءَ کَمَاھِیَ......[2]

اے اللہ ہمیں اشیاء کو ویسی دکھا جیسی وہ ہیں......

یعنی ایسا علم جو اشیاء وحقائق کو میرے لئے اس طرح کشف کرے جیسے حقائق ہیں۔

وہ علم جو حقیقت تک نہ پہنچائے ایک وبال ہے۔

حجابی علم وتقویٰ باعثِ ورودِ جہنم

ہمیں چند دفعہ امامِ راحل رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کی زیارت کی توفیق نصیب ہوئی۔ ایک دفعہ حوزۂ علمیہ قم کے علماء وطلاب کو موقع دیا گیا کہ وہ امامِ راحل کی بارگاہ میں شرفیاب ہوں۔ وہاں صرف حوزۂ علمیہ قم کے علماء اور بعض طلاب تھے اُس میں ہمیں بھی موقع ملا لہٰذا حاضر ہوئے۔ وہ امام راحلؒ کی عجیب تقریر تھی۔ وہ تقریر تحریری صورت میں محفوظ بھی ہے۔ ہم نے صحیفۂ امام میں چند دفعہ پڑھی بھی ہے۔ اُس تقریر میں امام خمینیؒ نے یہ جملے بیان فرمائے تھے کہ بعض لوگوں کو قرآن جہنم لے جائے گا، بعض کو علم جہنم لے جائے گا اور بعض کو تقویٰ جہنم لے جائے گا۔ امام خمینیؒ بھی بہت جذبے وجلال کے ساتھ بیان فرما رہے تھے اور اُس وقت امام خمینیؒ

1...... (سورۃ طہ، آیہ ۱۱۴)

2...... (التفسیر الکبیر أو مفاتیح الغیب- فخر الدین محمد بن عمر التمیمی الرازی الشافعی، المتوفی: ۶۰۶ھ، الجزء ۱۳، صفحہ ۳۷)

کے محضر میں اس کی ایک عجیب تاثیر تھی۔ظاہر ہے کہ مجھ جیسے طالبعلموں کی سمجھ سے بھی بالا تھا کہ ہم علم حاصل کررہے ہیں نجات کے لئے، قرآن پڑھتے ہیں نجات کے لئے، تقویٰ حاصل کرتے ہیں نجات کے لئے لہٰذا تقریر سنتے ہوئے ایک عجیب حالت بن گئی کہ اگر نجات کے اسباب ہی جہنم جانے کا باعث بن جائیں گے تو پھر نجات کہاں سے ملے گی۔پھر امام خمینیؒ نے تشریح فرمائی کہ وہ علم وتقویٰ جو حجاب بن جاتا ہے جہنم لے جائے گا۔

حجابِ علمی کی مثال

عموماً ہم کھڑکیوں کے آگے پردے لٹکاتے ہیں تاکہ اندر کے لوگ باہر اور باہر والے اندر نہ دیکھ سکیں۔چونکہ اندر اور باہر کچھ حقیقتیں ہیں لہٰذا ان حقیقتوں کو چھپانے و نظروں سے اوجھل رکھنے کے لئے پردہ لٹکا دیتے ہیں۔اسے پردہ اسی لئے کہتے ہیں کہ خود نظر آتا ہے لیکن اپنے پیچھے حقائق کو چھپا لیتا ہے۔

اگر علم یہ خاصیت پیدا کرلے کہ انسان کو علم نظر آنا شروع ہوجائے اور علم کے پیچھے جو حقائق ہیں وہ نظر نہ آئیں تو یہ علم نجات دہندہ نہیں بلکہ حجاب ہے۔حقیقتِ علم یہ ہے کہ علم نظر نہ آئے بلکہ حقیقت نظر آئے مثلاً انسان کو اگر عینک کا شیشہ نظر آنا شروع ہوجائے تو شیشے کے باہر حقیقتیں نظر نہیں آئیں گی۔یہ شیشہ حقیقت کو تب دکھائے گا جب یہ خود نامرئی ہو، جب خود بے رنگ ہوجائے۔عینک کا شیشہ اگر رنگین ہوجائے تو پھر رنگ نظر آتا ہے حقیقت نظر نہیں آتی۔اسی طرح بعض اوقات انسان کا علم رنگین ہوجاتا ہے۔انسان کو اپنی عالمیت کا احساس ہونے لگتا ہے کہ میں بہت بڑا عالم ہوں اور یہی حجاب بن جاتا ہے۔پس امامؒ نے فرمایا کہ یہ علم انسان کو جہنم لے جاتا ہے۔

ملاصدراؒ کا علم کے متعلق نظریہ

علم کے حوالے سے کتاب آدابِ فہمِ قرآن میں ملاصدراؒ کا ایک نظریہ بھی درج کیا ہے۔صدرالمتألہینؒ کو عوامی زبان میں ملاصدراؒ کہا جاتا ہے یعنی معرفت بشری کا شاہکار و نچوڑ۔معراجِ فکر انسان ملاصدراؒ ہیں۔اُن کا ایک نظریہ ہے کہ تمام کتابوں میں لکھا ہوا ہے انسان کو علم حاصل ہوتا ہے، علم ذہن کے پاس آتا ہے۔علماء علم

کی تعریف بھی یہی کرتے ہیں:

اَلْعِلْمُ هُوَ حُصُوْلُ صُوْرَةِ الشَّیْءِ عِنْدَ الْعَقْلِ......۱

اِنَّ الْعِلْمَ هُوَ الصُّوْرَةُ الْحَاصِلَةُ مِنَ الشَّیْءِ عِنْدَ الْعَقْلِ......۲

اَلْعِلْمُ صُوْرَةٌ حَاصِلَةٌ فِی الذِّهْنِ......۳

یعنی کسی شے کی صورت کا عقل و ذہن میں آنا علم کہلاتا ہے۔

صدر المتألھینؒ فرماتے ہیں کہ یہ علم نہیں ہے۔ علم کبھی بھی انسان کے پاس نہیں آتا بلکہ ہمیشہ انسان علم کے پاس جاتا ہے اور جب انسان علم کے پاس جاتا ہے تو علم انسان کو حقیقت کی دہلیز پر لاکر کھڑا کر دیتا ہے کہ میرا کام اتنا ہی تھا جیسے آنکھ انسان کو ایک حقیقت کے دروازے پر لاکر کھڑا کر دیتی ہے۔ مثلاً آپ کسی سے جامعۃ العروۃ الوثقیٰ کا ایڈریس پوچھتے ہیں تو وہ آپ کو اس مقام پر لاکر کھڑا کر دیتے ہیں۔ لانے والے کا کام یہیں ختم ہو جاتا ہے کہ یہ حقیقت ہے اور اب آگے آپ کا کام ہے۔ معانی کا کام ہمیں حقائق کے در تک پہنچا دینا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہم الفاظ کی مدد سے معانی تک پہنچ جائیں اور پھر کہیں کہ یہی مطلوب تھا بلکہ یہاں سے آگے مزید پوچھنا ہے۔ جیسے کوئی ہماری رہنمائی ایک چوک تک کرے تو اگلے چوک پر پھر پوچھنا پڑتا ہے۔ علم پوچھنے کے لئے ہے نہ کہ پہنچنے کے لئے۔ یوں نہیں ہے کہ ہم نے علم تک پہنچنا ہے بلکہ علم سے کہنا ہے کہ وہ ہمیں حقیقت کے در تک لے کر جائے۔

علم، حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ

کائنات حقیقت کے مجموعہ کو کہتے ہیں تصورات کے مجموعہ کو نہیں لیکن انسان کے پاس اس کائنات کی

۱......(المنطق-المظفرؒ، صفحہ ۱۴)

۲......(مفاہیم القرآن-الاستاد جعفر السبحانی)

۳......(منہاج البراعۃ فی شرح نہج البلاغۃ-الخوئی)

شناخت و پہچان کا ذریعہ علم ہے اور علم تک پہنچنے کا ذریعہ الفاظ، کتابیں، درس، مدرسے و اساتذہ ہیں۔ پس علمِ دین حقیقتِ دین تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ الفاظ و اصطلاحاتِ دینی ہمیں دین کی معلومات تک پہنچاتے ہیں اور علمِ دینی ہمیں حقائق دینی تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ دین الفاظ، معانی، تصورات، مفاہیم و معلومات کے مجموعے کا نہیں بلکہ حقائق کے مجموعے کا نام ہے۔ تمام دین حقیقت، عینیت و واقعیت ہے۔ جب ہم الفاظ، معانی اور دینی اصطلاحات کی مدد سے دینی مفاہیم تک پہنچتے ہیں تو علمِ دین کا پہلا مرحلہ طے کرتے ہیں جسے تفسیر دین کہتے ہیں اور جب علمِ دین حاصل ہوگیا، معلوماتِ دینی آگئیں، معانی و مفاہیم دینی ہمارے دل کے اندر آگئے تو ان معانی کے ذریعے حقیقتِ دین تک پہنچنا تاویل کہلاتا ہے۔

فلاح سے مراد

حدیث میں آیا ہے:

قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا......[1]

قرآن کی بہت فصیح وبلیغ تعبیروں میں سے ایک فلاح ہے جسے ہم نے محنت کر کے مبہم بنا دیا ہے۔ فلاح کا مفہوم قرآن میں بہت اعلیٰ معنیٰ رکھتا ہے۔ فلاحِ قرآنی مدینۂ فاضلہ کا نام ہے۔ جب قرآنی نظام قائم ہوجائے تو اس کو قرآن فلاح کہتا ہے جبکہ ہم ویلفیئر کو فلاح کہتے ہیں۔ آج کی پولیٹیکل سائنس میں معاشرے کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ رفاہی وفلاحی معاشرہ

۲۔ نظریاتی وآئیڈیالوجیکل معاشرہ

آج مغربی طرز پر بنی ہوئی حکومتیں فلاحی ریاستیں کہلاتی ہیں۔ پاکستان میں البتہ یہ ایک خوبی ہے کہ الحمدللہ ہمارے سیاسی لیڈران نہ پولیٹیکل سائنس پڑھے ہوئے ہیں اور نہ فلاحی و نظریاتی ریاست سے آشنا ہیں۔

---

[1]...... (میزان الحکمة - الریشهری، الجزء ۱۰، صفحه ۳۰۶)

اُنہیں اتنا پتا ہے کہ دو اور دو چار روٹیاں ہوتی ہیں۔ اُنہیں یہ دو ٹانگوں والے موجودات صرف ووٹر نظر آتے ہیں۔ یہاں سب نے اپنے اپنے سیاسی منشور کا اعلان کیا ہے۔ کسی نے کہا کہ ہم امیر شام کی طرز کی حکومت قائم کریں گے، یہ واضح طور پر کہا ہے نہ کہ چھپ کر۔ کوئی خلفائے راشدین کا نظام نافذ کرے گا، کوئی مغربی طرز کی جمہوریت، کوئی ترکی طرز کی جمہوریت اور کوئی سعودی طرز کی جمہوریت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اپنے اپنے رول ماڈل پیش کررہے ہیں۔ ان کے اَن پڑھ ہونے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ انسان ذہنی طور پر مشوش نہیں ہوتا اس لئے ہمارے سیاستدانوں کے ذہن میں کسی قسم کی تشویش نہیں ہے۔

قرآن فلاحی اسٹیٹ یعنی مفلحون بنانا چاہتا ہے۔ قرآن نے جا بجا اصول بیان کئے اور ان کا نتیجہ یہ دیا کہ اگر تم یہ راہ طے کرلو تو تم فلاح یافتہ بنو گے۔ اسی طرح کہا گیا کہ لا الہ الا اللہ کہو اور فلاح پاؤ۔

لفظ سے حقیقت تک پہنچیں

اساس و بنیادِ دین معرفت ہے اور لا الہ الا اللہ معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کی اساس و بنیاد ہے۔ لا الہ الا اللہ کے تین مرحلے ہیں یعنی لفظ، مفہوم وحقیقت۔ آج ایک ارب سے زیادہ مسلمان لا الہ الا اللہ پڑھ رہے ہیں لیکن کہاں پہنچے؟ جب بھی کسی مومن کو مارا جاتا ہے تو قاتل پہلے لا الہ الا اللہ پڑھتا ہے، نعرۂ تکبیر لگا کر خود کو بلاسٹ (Blast) کرتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کے بقول:

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل......[1]

لا الہ اگر زبان سے کہہ کر رسم پوری کردی جائے تو دنیا و آخرت میں فلاح و رفاہ، عزت و کامیابی اور نجات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ حقیقتِ توحید نہیں ہے۔ اسی طرح لا الہ الا اللہ کا مفہوم و معنی ہے جو تفسیر و عقائد کی کتابوں میں پڑھایا جاتا ہے اور تقریروں و درسوں میں مفاہیم بیان کئے جاتے ہیں کہ اللہ کیا ہے، الٰہ کیا ہے،

[1]...... (ضربِ کلیم-علامہ اقبالؒ، صفحہ ۴۳)

اس کا معنٰی وترکیب کیا ہے، یہ لا کونسا ہے اس کی لفظی و معنوی تشریح کیا ہے۔ بعض نے اس کے اوپر مفصل کتابیں لکھی ہیں جن میں فقط لا الہ الا اللہ کی تفسیر کی گئی ہے۔ اگر لا الہ الا اللہ زبان سے ادا ہو جائے اور بالکل دقیق و صحیح مفہوم بھی آ جائے، کسی بڑے قابل و اعلیٰ محقق اُستاد کے پاس بیٹھ کر ہم لا الہ الا اللہ کی تفسیر بھی پڑھ لیں تو بھی نجات کیلئے ناکافی ہے کیونکہ ابھی ہم حقیقت تک نہیں پہنچے ہیں۔

ذہنی تصور ہماری مخلوق

امامِ پنجم حضرت محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

كُلَّمَا مَيَّزْتُمُوهُ بِأَوْهَامِكُمْ فِي أَدَقِّ مَعَانِيهِ......

تم اللہ کے بارے میں جو تصور ذہن میں قائم کرتے ہو، اپنے اوہام و عقول کے ذریعے جو تصویرِ خدا ذہن میں حاضر کرتے ہو...... "فِي أَدَقِّ مَعَانِيهِ"...... بہت دقت کے ساتھ ذہن کے اندر لا الہ الا اللہ کا مطلب و معنٰی لاتے ہو، اگر تم نے غور و فکر، بڑی کاوشوں اور دقیق ترین مفاہیم کے ساتھ اس کا معنٰی درک کر لیا ہے تو بھی کچھ حاصل نہیں ہے۔

مَخْلُوقٌ مَصْنُوعٌ مِثْلُكُمْ، مَرْدُودٌ إِلَيْكُمْ...... [1]

یہ اللہ نہیں ہے بلکہ تمہاری طرح کی مخلوق ہے۔ چونکہ جو تصور بھی انسان کے ذہن میں آتا ہے وہ انسان کے اپنے ذہن کا پیدا کردہ ہے۔ ایک دن یاد ہے دوسرے دن بھول جاؤ گے یعنی کبھی ذہن میں آتا ہے اور کبھی ذہن سے چلا جاتا ہے اور جو اس طرح سے آئے جائے وہ اللہ نہیں ہو سکتا۔...... "مَرْدُودٌ إِلَيْكُمْ"...... جو تمہاری طرف لوٹ رہی ہے۔ پس نہ لفظِ لا الہ الا اللہ نجات دہندہ ہے اور نہ اس کے دقیق ترین معانی بلکہ لا الہ الا اللہ کی حقیقت تک پہنچنا و متصل ہونا تاویل لا الہ الا اللہ ہے۔

---

[1]...... (بحار الأنوار - علامہ المجلسیؒ، الجزء ٦٦، صفحہ ٢٩٣، والجزء ١١٠، صفحہ ٣٤)

قرآن میں اخلاص کی قدر

لا الہ الا اللہ جب زبان وتحریر میں آجائے تو لفظ ہوتا ہے، جب ذہن میں آجائے تو مفہوم ہوتا ہے اور جب عمل میں آجائے تو اخلاص ہوتا ہے۔ اخلاص قرآن کی آئیڈیالوجی کا حصہ ہے لیکن دیگر قرآنی الفاظ کی طرح اس لفظ کے ساتھ بھی ہم نے بہت براحشر کیا ہے۔ ہم نے ان الفاظ کو ہندی معانی کا لباس عطا کیا ہے اور قرآنی معانی سے صرف نظر کیا ہے۔

جس طرح اُردو میں دعوت کھانا کھلانے کو کہتے ہیں لیکن عربی اور قرآن میں دعوت پیغامِ خدا پہنچانے کو کہتے ہیں۔ داعیًا الی اللہ، دعوۃً الیٰ اللہ یعنی اللہ کا پیغام دینا اور اللہ کی طرف بلانا۔ دعوتِ ذوالعشیرہ پاکستان میں لنچ ہے اور قرآن میں پیغامِ خدا ہے۔ ہم نے یہی سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لنچ میں بکرے کی ران پکائی، لوگ تین دن مل کر کھاتے رہے لیکن ران ختم نہیں ہوئی۔ یہ اُردو میں ذاکری کی دعوت ہے لیکن جو قرآن پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہہ رہا ہے کہ اے نبی!

اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّکَ......[1]

(اے رسول) اپنے پروردگار کی راہ کی طرف دعوت دیں......

یعنی اپنے ذوالعشیرہ کو پیغامِ خدا کی طرف بلائیں۔

انہی قرآنی الفاظ میں سے ایک اخلاص ہے لیکن ہم نے ایک حالت یا ذہنی تصور کا نام اخلاص رکھ لیا ہے۔ اخلاص، مخلص، مخلصین وخلوص استعمال کر کر کے بے معنیٰ کر دیا ہے جبکہ قرآن کی زبان میں اخلاص بنیادی اہمیت وحیثیت رکھتا ہے:

أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ......[2]

آگاہ رہو! خالص دین صرف اللہ کے لئے ہے......

---

[1]......(سورۃالنحل،آیہ۱۲۵)

[2]......(سورۃالزمر،آیہ۳)

فَاعْبُدِ اللہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ٥......۱؎

لہٰذا آپ دین کو اسی کیلیئے خالص کر کے صرف اللہ کی عبادت کریں۔

قُلْ إِنِّیٓ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ٥......۲؎

کہہ دیجئے: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں دین کو اس کے لئے خالص کر کے اللہ کی بندگی کروں۔

قُلِ اللہَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّہٗ دِیْنِیْ ٥...... ۳؎

کہہ دیجئے: میں اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں اپنے دین کو اس کے لیے خالص رکھتے ہوئے۔

پس اللہ کو دینِ خالص چاہئے لہٰذا دین اخلاص کے ساتھ اپنانا ہے۔

اخلاص کا مطلب

اخلاص ملاوٹ والتقاط کے مقابلے میں ہے یعنی کسی حقیقت میں نہ کچھ کم ہو اور نہ کچھ زیادہ۔ حقیقت جب اپنے اصلی رنگ وروپ میں ہو تو اُس میں کسی اور چیز کا شائبہ تک نہیں ہوتا لہٰذا اسے خالص کہا جاتا ہے۔

امام خمینیؒ کی دین کے متعلق تشخیص

امام خمینیؒ نے دین خالص یعنی دینِ ناب واسلامِ ناب پیش کیا۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کی مشکل یہ رہی کہ جب سے مکہ میں تبلیغ وترویج ہوا اور آج ہم تک پہنچا اس دوران اپنی خالصیت وخلوص کھو بیٹھا۔ جس طرح آسمان سے خالص پانی اُترتا ہے لیکن جب ہمارے گھر سے واپس نکل رہا ہوتا ہے تو اُس وقت سیورج میں اس کی عجیب وغریب حالت ہوتی ہے۔ اصلاً دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا کیونکہ بدبودار، گندا، آلودہ ومتعفن

۱؎......(سورۃ الزمر، آیہ ۲)

۲؎......(سورۃ الزمر، آیہ ۱۱)

۳؎ ......(سورۃ الزمر، آیہ ۱۴)

ہوجاتا ہے۔اس لئے کہ ہم نے اپنے گھر میں جو کچرا تھا، بدن، کپڑوں اور برتنوں پر جو میل، حدث وخبث تھا وہ اُس میں ڈال دیا۔غرضیکہ جتنی غلاظت ممکن تھی اُس میں ملا کر گھر سے باہر بھیجی۔

یہی مشکل دین کے ساتھ بھی پیش آئی ہے۔دین اللہ کی طرف سے خالص آیا ہے لیکن جب ہمارے گھروں، زبانوں، وجود اور معاشرے سے نکلتا ہے تو ہم اس کا وہی حشر کر دیتے ہیں جو پانی کے ساتھ کرتے ہیں۔

تصفیہ کے نام پر ملاوٹ

بعض لوگ پانی کے کارخانہ لگاتے ہیں تا کہ اس کو صاف کر کے منرل بنایا جائے یعنی پانی اُڑا دو اور منرل رہنے دو۔ پانی اور چیز ہے منرلز اور چیز ہیں۔منرل یعنی موادِ معدنی۔ پانی کے اندر بہت ساری معدنی چیزیں ہوتی ہیں۔ پانی زمین سے اپنے ساتھ معدنی مواد بھی لے کر آتا ہے۔لیکن پانی نکلتے ہی آپ پانی کو ابال کر خالص کرنا چاہتے ہیں۔ پرانے زمانے کے ڈاکٹرز کہتے تھے کہ پانی اُبال کر پئیں لیکن نئے ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ پانی اُبالیں نہیں چونکہ جب پانی اُبالتے ہیں تو جو چیز بخار بن کر اُڑ جاتی ہے وہ پانی ہی ہے اور جو باقی رہ جاتا ہے وہ پانی نہیں ہے جبکہ پانی آپ کے بدن کی ضرورت ہے۔ یہ ڈاکٹری کی دُنیا کا فارمولا ہے کہ جب بھی علاج کرائیں تو کسی پرانے ڈاکٹر سے مت کرائیں بلکہ ہمیشہ نئے اور اپ ڈیٹ ڈاکٹر سے علاج کرائیں جو طبابت کی جدید ترین مہارت رکھتا ہو۔ چونکہ پرانے ڈاکٹرز بہت پرانی طب پڑھے ہوئے ہیں اور آج طب بہت ترقی کرگئی ہے۔ انصافاً انسان نے جو ترقی کی ہے ان انسانی کاوشوں میں ایک علم طب ہے کہ فوق العادہ، حیرت انگیز ومعجزاتی حد تک ترقی کی ہے۔ ظاہر ہے جن کو جدید ٹیکنالوجی پڑھائی جاتی ہے وہ بہترین ڈاکٹرز ہوتے ہیں البتہ لاہور کے ینگ ڈاکٹرز سے بچیں کہ وہ خطرناک ہیں۔

پانی کو اگر صاف کرنا ہے تو کسی اور چیز سے صاف کریں اُبالیں نہیں یا اگر اُبالتے بھی ہیں تو اتنا نہ اُبالیں کہ سارا پانی اُڑ جائے اور منرلز پیچھے رہ جائیں۔ پھر کہے کہ میں نے تو اُبلا ہوا پیا تھا بیمار کیوں ہوگیا؟ اس لئے کہ آپ نے جوس پیا ہے اور ابال ابال کر پانی اُڑا دیا ہے۔جس طرح عورتیں کھانا پکاتے ہوئے سارے

وٹامنز جلا دیتی ہیں۔ بار بار ڈھکن اُٹھا کر دیکھتی ہیں کہ آخری وٹامن بھی ختم ہوا یا نہیں ہوا۔ پھر جب دیگچے میں مکمل غذائیت ختم ہوجاتی ہے اور ہنڈیا کا رنگ سیاہ ہوجاتا ہے تو کہتی ہیں اب ڈش تیار ہوگئی ہے۔ پیٹ اس سے بھرلو پھر وٹامن وکیلشیم کی گولیاں الگ سے کھالینا۔ ہم دوخرچے کرتے ہیں کہ وٹامن کی گولیاں الگ کھاتے ہیں اور پیٹ الگ چیز سے بھرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے سارے وٹامنز کھانوں وسبزیوں میں رکھے ہوئے ہیں لیکن ہماری عادت ہوچکی ہے اور چونکہ ہمارا مزاج ہندی ہے لہٰذا ہم غذا جلا کر کھانے پر مجبور ہیں۔

ناخالص کرنے کے دوطریقے

غرض کسی چیز کی خالصی، خلوص وحقیقت دوطرح سے ختم ہوجاتی ہے۔ ایک اس طرح کہ اگر اُس حقیقت کا کچھ حصہ اُس سے لے لیں تو یہ خالص نہیں ہے مثلاً آپ دودھ سے ملائی و بالائی نکال لیں اور دوسرے یہ کہ اس میں اضافی کیمیکلز ڈال دیں۔ آج کل کے گوالے یہی دوکام کرتے ہیں کہ دودھ سے ملائی نکال لیتے ہیں اور مینڈک والا پانی اُس میں ڈال دیتے ہیں۔

اس طرح یہ دودھ کو دو دفعہ ناخالص کرتے ہیں۔ ہم صرف ایک چیز کو ناخالصی سمجھتے ہیں کہ کوئی ایڈیشنل چیز باہر سے دودھ میں ملا دینا لیکن اُس کی کریم ومکھن نکال لینے کو ہم ناخالصی نہیں کہتے جبکہ یہ بھی ناخالصی ہے۔ اس لئے کہ چربی اس کے اندر ہونی چاہیے۔ خالص دودھ اُس کو کہتے ہیں جو چربی سے مالا مال ہو، اُدھر سے پیو اور اِدھر ہارٹ اٹیک ہو۔ دودھ کہتے ہی اُسے ہیں جس کے اندر چربی ہو اگرچہ انسان کے مزاج کے ساتھ سازگار نہ ہو۔ دودھ کے لئے ضروری تو نہیں کہ انسان کے ساتھ سازگار ہو لیکن اگر یہ آپ کو راس نہیں آتا تو آپ اس میں پانی ڈالتے ہیں یا چربی نکال لیتے ہیں۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ یہ ناخالص دودھ ہے۔ اب ہمارے مزاج خالص دودھ کے قابل نہیں رہے بلکہ ناخالص استعمال کرکر کے اب خالص دودھ ہضم نہیں ہوتا۔ ہم نے اُس میں اتنے سارے ذائقے شامل کئے کہ یہ ناخالص دودھ آج ہمارا پسندیدہ دودھ بن گیا ہے۔

یہی حشر دین کے ساتھ ہوا ہے۔ دین بھی دوطرح سے ناخالص ہوجاتا ہے۔ ایک اُس وقت ناخالص

ہوتا ہے جب دین کے اصلی اجزا میں سے کچھ اجزاء نکال لئے جائیں اور ایک اس وقت ناخالص ہوتا ہے جب دین کے اندر غیر دینی اجزاء شامل کر دیئے جائیں۔

ناخالص دین کے متعلق امام خمینیؒ کی اصطلاحات

امام خمینیؒ بہت اعلیٰ بصیرت کے حامل ہیں اور خدا نے اس ہستی کے اندر حیرت ناک حد تک فوق العادہ بصیرت رکھی ہے لہٰذا امام خمینیؒ نے دیکھا کہ دین دو ناخالص شکلوں میں موجود ہے۔آپ نے ایک کو تحجر اور دوسرے کو التقاط کا نام دیا۔امام خمینیؒ کی یہ اصطلاحات (Terminologies) ہمیں یاد ہونی چاہئیں۔

......متحجرانہ دین

متحجرانہ دین وہ ہے جس سے ملائی و کریم نکال لی گئی ہو۔دودھ سے کریم نکال کر پیچھے صرف چھاچھ بچ جاتی ہے، اگر دودھ سے مکھن نکال لیں تو پیچھے چھاچھ یعنی لسی رہ جاتی ہے جس میں چربی نہیں ہوتی۔پس متحجرانہ دین وہ ہے جس کے ارکان، اصول و روح نکال لی گئی اور پیچھے رسومات اور چند ایک ظاہری عبادات رہ گئیں۔ کیونکہ آج کا مسلمان نازک مزاج ہے لہٰذا اصل و خالص دین سے اس کی طبیعت خراب ہوتی ہے۔بعض اوقات ہم کھانے پینے میں کریں یا نہ کریں لیکن دین میں بہت احتیاط کرتے ہیں۔عموماً ہم اپنی زندگیوں میں دین اتنا شامل کرتے ہیں جتنا آٹے میں نمک ڈالتے ہیں۔ایک کلو آٹا ہے تو ایک چٹکی نمک ہوتا ہے ورنہ وہ روٹی کھانے کے قابل نہیں ہوتی۔

ہم نے اپنے کلچر میں ایک چٹکی دین ڈال دیا ہے۔ چوبیس گھنٹے کلچر کے ہیں تو بیچ میں پانچ منٹ دین ہے تاکہ یہ تہذیبِ ہندی نمکین و دینی بن جائے۔سیکولرازم میں ایک چٹکی دین کی ڈال دیں تاکہ ہم مسلمان کہلائیں، سیاستِ شیطانی کریں لیکن بیچ میں اسلامی جھنڈا لگا دیں تاکہ مسلمان سیاستدان کہلائیں۔غرضیکہ ہر جگہ چٹکی ڈال دیں تاکہ وہ سب شربت بن جائے۔ہم دین کو چٹکی سے آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ مثلاً اگر کوئی عورت پردہ شروع کر دے یا دوپٹا اوڑھنا شروع کر دے تو باقی عورتیں اسے کہتی ہیں کہ یہ ملّانی ہوگئی ہے۔اسی

طرح اگر کوئی لڑکا داڑھی رکھ لے یا دو دن شیو نہ کرائے تو کہتے ہیں کہ یہ تو بالکل مولوی ہی ہوگیا ہے۔ یعنی عورتوں و مردوں کو اتنا خیال ہے کہ اس سے زیادہ دین قبول نہیں کرتے۔ سال میں ایک عشرہ سن کر اسے کافی سمجھتے ہیں کہ اور کتنا دین حاصل کریں۔ تجز یعنی دین کا اکثر حصہ و روح نکال کر پیچھے جو لسی بچ گئی ہے اس میں پانی ڈال کر کہیں کہ یہ دین ہے، یہ پیو کہ گرمیوں کے لئے مفید ہوتا ہے۔ لیکن اس میں چربی کدھر گئی، پروٹین کدھر گئے، اجزائے اصلی کدھر گئے؟ وہ نکال لئے کیونکہ اس زمانے میں نہیں چلتے۔

......التقاطی دین

التقاط یہ ہے کہ جو کچھ دین میں ہے وہ رہے لیکن جو کچھ کیمونزم، امپیریل ازم، کیپیٹل ازم، سوشل ازم، مارکس ازم، سیکولر ازم اور جس کسی بھی ازم سے ملے وہ سب کچھ دین میں ڈال کر کہو کہ یہ سب دین ہے۔ یہ دراصل معجونِ دین والتقاط ہے۔ یہ التقاط اور تجز دین کے خلوص کو ختم کر دیتا ہے اس لئے امامِ راحلؒ نے فرمایا کہ اسلامِ ناب، اسلامِ خالص و اسلامِ اصلی کی ضرورت ہے۔

التقاطی دین

خلوص کا حصول

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ دین کا خلوص زبان، ذہن اور دل میں نہیں ہوتا بلکہ خلوص تجسم دین و حقیقتِ دین کا نام ہے۔ یعنی دین جب الفاظ، مفہوم، دل، ذہن اور معقول و موصول کی منازل طے کر کے انسان کی زندگی کے اندر خالص ہو کر مجسم ہو جائے تو یہ تاویل دین اور حقیقتِ دین ہے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا یوں فرما رہی ہیں کہ

كَلِمَةٌ جُعِلَ الْإِخْلَاصُ تَأْوِيلَهَا......

یہ وہ کلمہ ہے جو اخلاص بن کر حقیقت کا لباس پہنتا ہے۔

کیونکہ یہ لا الہ الا اللہ جس کی تم لوگ زبانی گواہیاں دے رہے ہو شہادت نہیں ہے۔ لا الہ الا اللہ وہ

ہے جس کی حقیقت خلوص ہے یعنی اگر لا الہ الا اللہ کی گواہی تم نے دی ہوتی تو آج تمہارے پاس دینِ خالص موجود ہوتا۔ تم دین کے اہم رکن ولایت کو کم کر کے یہاں بیٹھے ہوئے ہو اور سمجھتے ہو کہ مسجد النبیؐ میں بیٹھ جانا دین دار ہونے کے لئے کافی ہے۔ دین کے اہم رکن کو فراموش و نظر انداز کر کے سمجھتے ہو کہ نماز جماعت سے پڑھ لینا اور پڑھا دینا دین دار ہونے کے لئے کافی ہے۔ زبان سے لا الہ الا اللہ یا محمد الرسول اللہؐ کہہ دینا کافی ہے۔ یہ کافی نہیں ہے بلکہ دین وہ کلمہ ہے جس کی تاویل وحقیقت اخلاص ہے۔ جب تک دین اخلاص بن کر تمہارے رویوں میں نہیں آجاتا، دینِ خالص تمہارے سلوک میں نہیں آجاتا تو تم نے شہادت ہی ادا نہیں کی ہے اور جب تک تم نے شہادت ہی ادا نہیں کی تو ایمان و دین کے دائرے میں داخل نہیں ہو۔ انسان شہادت سے مسلمان ہوتا ہے۔ جب تک اُمتِ اسلامیہ کے رویوں میں دینِ خالص تجسم پیدا نہ کر لے اس کی موجودہ بدحالی بدلنے والی نہیں ہے۔

خالص و ناخالص دین کی علامات

لوگوں نے دین سے سیاست، حکومت، ولایت و اجتماعیت نکال دی لہٰذا اب دین میں خانقاہیت بچی اور کہا کہ یہ دینِ خالص ہے۔ یہ تو لسی اور چھاچھ ہے آپ نے اس کی روح یعنی کریم تو نکال ہی لی اور رسموں، وِردوں، منتر و جنتر کو ڈال کر کہہ رہے ہیں کہ یہ دین خالص ہے۔ کریم نکلنے کی علامت یہ ہے کہ اگر یہ دودھ ہوتا تو دودھ پینے والے کے اندر دودھ کی علامات ظاہر ہوتیں۔ اب یہ گلاس کے گلاس پی رہا ہے لیکن اس کے اوپر اثر نہیں ہو رہا۔ اگر تمہارے پاس دین خالص ہوتا تو اسلام کا غلبہ ہوتا، مسلمان کا غلبہ ہوتا، مسلمان کی عزت ہوتی۔ دینِ خالص کے اندر وہ تاثیر ہے کہ جوں ہی کوئی اپنائے وہ مغلوبیت سے نکل کر غلبہ کی حالت میں آجاتا ہے اور ذلت سے نکل کر عزت میں آجاتا ہے۔

پس وحدانیتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کی شہادت اُس وقت ادا ہوتی ہے جب اُسے انسان کے دل و ذہن سے باہر تمثل ملے اور اخلاص کی صورت میں تاویل نصیب ہو۔ یہ شہادت اخلاص مثلاً توحیدِ خالص و

ایمانِ خالص کی صورت میں ظاہر ہو۔

جُڑنا، قلب کی خصوصیت

پھر جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں:

وَضُمِّنَ الْقُلُوْبُ مَوْصُوْلَهَا......

یہ وہ کلمہ ہے جس کا پیوند دلوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔

حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے اس جملہ کو علماء نے دو طرح سے قرأت کیا ہے:

وَضَمَّنَ الْقُلُوْبَ،

اور

وَضُمِّنَ الْقُلُوْبُ،

اب یہاں طالب علمانہ بحثیں ہیں کہ کیوں دو طرح پڑھتے ہیں لیکن ہم اس بحث میں نہیں جاتے۔ ضُمِّنَ باقی سیاق کے ساتھ متحد و متفق ہے اور زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

......جنتری دین

قلب کو سمجھنے کیلئے ہمیں ہندی اور قرآنی دین جدا کرنا پڑے گا۔ جنتری اور قرآن کو تھوڑی دیر کے لئے الگ کر دیں کوئی حرج نہیں ہے چونکہ رسالۂ عملیہ جو ہر ایک کے گھر میں موجود ہے وہ جنتری ہے۔ جنتر کا مجموعہ جنتری ہے اور قرآن اللہ کے کلام کا مجموعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جنتری ہماری اپنی ہے اور قرآن دور سے آیا ہے۔ جنتری اپنے آباء سے آئی ہے اور آبائی چیز زیادہ عزیز ہوتی ہے اس وجہ سے لوگوں کو جنتریاں زیادہ عزیز ہیں۔ نحس وسعد، قمر در عقرب منبع جنتری ہے لیکن اس میں کلینڈر بھی ڈال دیا گیا ہے جو جنتری کا حصہ نہیں ہے۔ بھارت میں ہندوؤں نے جو جنتری بنائی اس میں جنتر، منتر اور ہندو مذہب کے ورد و زائچے ہیں۔ اب ان

کے بیچ میں آپ نے ولادتیں وشہادتیں اور کلینڈر بھی ڈال دیا تو مومنین اسے امامیہ جنتری سمجھتے ہیں۔جنتری پاکستان میں تشیع کی طرف سے سب سے زیادہ چھپنے والی کتاب ہے جسے کئی ادارے چھاپتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ان کے دوایڈیشن چھپتے ہیں اور ہر دفعہ دولاکھ کی تعداد میں چھپتی ہے۔اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس کتاب سے کس قدر محبت ہے۔انہیں قرآن سے کوئی سروکار نہیں ہے۔جنتری کا دین وقرآنی دین، الٰہی دین وآبائی دین، ہندی دین ومحمدی دین کو ہم نے ہر مورد میں جدا کرنا ہے۔

قلب کی وضاحت

ان مراحل میں سے ایک مطلب قلب سے متعلق ہے۔اُردو میں دل اس پمپ کو کہتے ہیں جو سینے میں دھڑکتا ہے لیکن یہ طب کی اصطلاح ہے قرآنی اصطلاح نہیں ہے۔ڈاکٹروں کو اختیار ہے کہ جس کو مرضی آئے دل کہیں۔قرآنی دل انسان کی روح کا حصہ ہے، روح کا مرکز دل ہے، روح کو دل کہتے ہیں اور خودِ روح حقیقتِ انسان ونفسِ انسان ہے۔قرآن اس کو دل کہتا ہے اور دل میں جو موصول متضمن کیا گیا ہے وہ توحید ہے۔

یہ دل کہاں ہے؟

انسان روح ہے اور انسانی جسم روح کے اختیار میں ہے۔یہ روح نہ جسم کے اندر ہے نہ باہر ہے۔ایک وہ روح ہے جو مرنے سے نکل جاتی ہے اور بدن ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔یہ روح جسم کے اندر ہے اور بائیولوجیکل روح ہے۔یہ بھی طب کی اصطلاح ہے۔یہ روح جانور میں بھی ہوتی ہے۔ذبحِ شرعی کی تعریف ہی یہی ہے کہ **اذھاق الروح** ......[1] یعنی روح نکالنا ذبح کہلاتا ہے۔لیکن اس روح سے مراد حیات وجان ہے

[1]......(شرائع الاسلام فی مسائل الحلال والحرام - المحقق الحلیؒ ،الجزء،صفحہ۹)(بحار الانوار-علامہ مجلسیؒ، الجزء ۶۲،صفحہ۳۱۷)(مستند الشیعۃ-المحقق النراقیؒ، الجزء ۱۵،صفحہ۱۹۶)

جو جسمانی چیز ہے یعنی خون کی گرمائش یا بخارات۔ یہ فزکس (Physics) کا کام ہے کہ اس روح و حیات کی تفسیر کرے کہ یہ بایولوجیکل حیات کیا ہے؟

قرآن جسے روح کہتا ہے:

وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ......[1]

یہ روح صرف انسان میں ہے کسی جانور میں نہیں ہے۔

عبث و باطل سوالات

لیکن یہ روح نہ یہ جسم کے اندر ہے نہ باہر۔ پھر آپ پوچھیں گے کہ روح کہاں ہے؟ جس طرح ہزار دلیل دیتے ہیں کہ یہ نظام طاغوتی ہے لیکن پھر پوچھتے ہیں کہ ووٹ کس کو دیں؟

ائمہ اطہار علیہم السلام جب لوگوں کو توحید سکھاتے تھے تو فرماتے تھے کہ خدا کا کوئی مکان نہیں ہے، خدا کسی مکان میں نہیں ہے لہٰذا اشارہ مت کرو کہ اوپر والا، نیچے والا، دائیں والا، بائیں والا۔ اوپر نیچے وہ ہوتا ہے جو مکان رکھتا ہو اور خدا کسی مکان میں نہیں ہے لیکن جب امامؑ بحث ختم کرتے تھے تو آکر پوچھتے تھے کہ پھر خدا کہاں ہے؟ عجیب بات ہے کہ جب کہہ دیا کہ مکان نہیں ہے تو اب نہ پوچھو، چونکہ کہاں ہے سے مکان پوچھا جاتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی نے گھر بنایا ہی نہیں ہے اس سے آپ نہ پوچھیں کہ آپ کا گھر کہاں ہے؟ جس نے شادی کی ہی نہیں ہے اُس سے نہ کہیں کہ آپ کے بچے ٹھیک ہیں؟ جب وہ لوگ ائمہ علیہم السلام سے وہی سوال کرتے تھے تو امامؑ فرماتے:

إِنَّ اللهَ عَزَّ وَ جَلَّ أَيَّنَ الْأَيْنَ فَلَا أَيْنَ لَهُ، وَ جَلَّ عَنْ أَنْ يَحْوِيَهُ مَكَانٌ وَ هُوَ فِيْ كُلِّ مَكَانٍ، بِغَيْرِ مُمَاسَةٍ وَ لَا مُجَاوَرَةٍ......[2]

بے شک اللہ تعالیٰ نے مکان کو خلق کیا ہے پس اس کے لئے کوئی مکان نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ عظیم ہے

---

[1]......(سورۃالحجر، آیہ ۲۹) (سورۃص، آیہ ۷۲)

[2]......(بحار الأنوار-علامہ محمدباقر المجلسیؒ، الجزء ۴۰، صفحہ ۲۴۸)

اس سے کہ اس کیلئے کوئی مکان ہو، درحالیکہ وہ ہر مکان میں ہے، بغیر اس کے کہ اسے محسوس کیا جائے اور بغیر اس کے کہ اس کا کوئی پڑوسی تصور کیا جائے......

مکان اُس کی طرف سے ہے کہ نہ وہ مکان میں ہے۔ وہ خالقِ مکان ہے، مکان اُس کے کنٹرول و احاطے میں ہے۔ اسی طرح روح آپ کی بدن میں نہیں ہے۔ پھر نہ پوچھیں کہ کہاں ہے؟ اُس کا کوئی مکان نہیں ہے۔ مکان جسمانی چیز کا ہوتا ہے روح کا نہیں۔ حرج نہیں ہے کہ آپ پانچ منٹ اپنی طرف بھی توجہ کرلیں کہ آپ بدن نہیں بلکہ روح ہیں۔ ہم نہ بدن کے اندر ہیں نہ بدن کے باہر ہیں۔ پھر ہم کیا ہیں؟ ہم خود ہیں۔ اسی کی پہچان تو مشکل ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بہت زور مارا کہ ہمیں یہی خودی پہچنوا دیں۔

خودی کی پہچان مشکل امر

قرآن بھی یہی بتا رہا ہے کہ خود کو پہچانو اور معصومین علیہم السلام بھی یہی کہتے آئے ہیں:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ......[1]

جس نے اپنے آپ کو پہچانا بتحقیق اس نے اپنے رب کو پہچانا......

جسے اپنا پتا مل گیا اُسے خدا کا پتا بھی مل جائے گا، ہمیں ابھی خود اپنا معلوم نہیں ہے۔

شاعر کے بقول:

مری ذات کا جو نشاں ملے
مجھے دولتِ دو جہاں ملے......[2]

انسان اپنی اسی سالہ زندگی میں ہر چیز جانتا ہے مثلاً اسے پتا ہے کہ سرسوں کب کِھلتی ہے لیکن اپنا ہی

---

[1]......(مرآة العقول في شرح أخبار آل الرسولؐ - العلامة المجلسیؒ، الجزء ۲، صفحہ ۵۲)(بحار الأنوار - علامه محمدباقر المجلسیؒ، الجزء ۲، صفحہ ۳۲)(میزان الحکمة - الریشهری، الجزء ۷، صفحہ ۱۳۰)

[2]......(فیض احمد فیض)

نہیں پتا کہ میں کیا ہوں، کون ہوں، کدھر سے ہوں!

اس لئے امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

خدا رحمت کرے اُس انسان کو جو تین سوالوں کے جواب جانتا ہے۔

رَحِمَ اللّٰہُ امْرَءً عَرَفَ مِنْ أَیْنَ وَ فِیْ أَیْنَ وَ إِلٰی أَیْنَ ......[1]

خدا رحمت کرے اس شخص پر جس نے یہ پہچان لیا کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ اور (پھر) کہاں جانا ہے؟

مقصد اور مبدیٰ کے درمیان کہاں کھڑا ہے؟ مقصد سے کتنا دور اور کتنا قریب ہے؟ اگر آپ ان تین سوالوں کے جواب جانتے ہیں تو مولا علی علیہ السلام آپ کو دُعا دے رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اِدھر موم بتی جلاتے ہیں اور اُدھر بی بیؑ دُعا دیتی ہیں کہ تم نے موم بتی جلا دی خدا تیرا بھلا کرے۔

روح میں اضطراب

روح میں اضطراب

پس ہم روح ہیں اور یہ قلب روح کا قلب ہے۔ قلب یعنی مرکزِ ادراک، خودِ انسان و حقیقتِ انسان۔ اسے تقلب کی وجہ سے قلب کہتے ہیں۔ تقلب یعنی اُلٹتے پلٹتے رہنا۔ اس پمپ کو بھی قلب اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ٹکتا نہیں ہے، ایک حال میں نہیں رہتا بلکہ سکڑتا، پھیلتا، سمٹتا اور دھڑکتا رہتا ہے۔ جس دن سکڑ کر نہ کھلا اُس دن...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ......[2]، انسان کی روح کو بھی قلب کہتے ہیں کیونکہ ایک تڑپ و اضطراب انسان کی روح میں بھی موجود ہے۔

---

[1]......(علیؑ و پایان تاریخ، بحوالہ/اسفار- ملاصدراؒ، الجزء ۸، صفحہ ۳۵۵)

[2]......(سورۃ البقرۃ، آیہ ۱۵۶)

اضطراب باعثِ کمال

یہی اضطراب ہے جو انسان کو کسی مقام تک پہنچا تا ہے:

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوٓءَ......[1]

کون ہے جو مضطرب کی فریاد سنتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور اس کی تکلیف دور کرتا ہے......

علامہ اقبالؒ بہت چاہتے تھے کہ میرے جوانوں میں اضطراب ایجاد ہو جائے لیکن جوان اتنا ٹھوس ہو چکا ہے کہ اُس کے اندر اضطراب وتقلب پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہی چیز اقبالؒ کو پریشان رکھتی تھی کہ کسی طرح جوان طالبِ علم کے سکون، سکوت و جمود کو ختم کر دیں۔ لیکن جتنے جتن کئے پاکستانی جوان میں وہ تڑپ پیدا نہیں ہوئی۔ علامہ اقبالؒ خدا سے کیا مانگتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے

کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں...... [2]

روح میں اضطراب واطمینان کی وجہ

روح اس لئے مضطرب رہتی ہے چونکہ اپنے منبع و وطن سے دور ہے، اس کو وطن یاد آتا ہے۔ اس کا وطن کیا ہے؟ حافظ شیرازی کے بقول:

من ملک بودم و فردوس برین جایم بود...... [3]

میں یہاں کا نہیں ہوں بلکہ یہاں بھیجا گیا ہوں۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيٓ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ۝...... [4]

---

[1]......(سورۃ النمل، آیہ ۶۲)

[2]......(ضربِ کلیم، صفحہ ۹۵)

[3]......(حافظ، غزلیات، غزل شمارہ ۳۱۷)

[4]......(سورۃ التین، آیہ ۴)

بتحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا۔

وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ......[1]

یعنی ہم نے اپنی روح اس کے اندر ڈالی ہے۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ أَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ٥......[2]

پھر ہم نے اسے پست ترین حالت کی طرف پلٹا دیا۔

اس کو یہاں پست عالم میں بھیجا گیا، اسے اپنے مبدیٰ سے دور کر دیا اس وجہ سے پریشان ہے۔

ملّائے رومی کے بقول:

بشنو این نی چون شکایت می کند
از جدایها حکایت می کند
کز نیستان تا مرا ببریده اند
در نفیرم مرد و زن نالیده اند ......[3]

سن! کہ یہ بانسری تجھے کچھ بتا رہی ہے، یہ جدائی کے شکوے کر رہی ہے۔ تمہارے لئے بانسری ایک میوزک ہے لیکن بانسری کے لئے یہ آہ و فغاں، گریہ و زاری اور نالہ و فریاد ہے۔ اس لئے کہ تم اسے نیستان سے کاٹ کر یہاں لے آئے ہو۔ نیستان سے دوری اس کو رُلا رہی ہے۔ درحقیقت اس کے اندر نیستان کی طرف لوٹنے کی حسرت موجود ہے، اسے اپنا وطن یاد آ رہا ہے۔ اسی طرح جب تک یہ روح وہاں نہیں پہنچتی مضطرب رہے گی۔

روح کو اطمینان کب آئے گا؟

أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ٥...... [4]

---

[1] ......(سورۃ الحجر، آیہ ۲۹) (سورۃ ص، آیہ ۷۲)
[2] ......(سورۃ التین، آیہ ۵)
[3] ......(مثنوی معنوی، دفتر اول، بخش ۱، سر آغاز)
[4] ......(سورۃ الرعد، آیہ ۲۸)

اور یاد رکھو! یادِ خدا سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

یَآاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ○ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً○......[1]

اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف پلٹ آ، اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہو۔

جب یہ اپنے مبدیٰ و منبع کے قریب یعنی لقاء اللہ پر فائز ہو جائے گی تو اس کا اضطراب ختم ہو جائے گا ورنہ اس دنیا میں اضطراب ہے۔

اضطراب، باعثِ استجابتِ دعا

کوئی شخص اضطراب سے پکارے تو خدا سنے گا:

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ......[2]

کون ہے جو مضطرب کی فریاد سنتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور اس کی تکلیف دور کرتا ہے......

ہم نے اس آیت کو بھی ورد بنا لیا ہے۔ بیماروں کے لئے جب دُعا مانگتے ہیں تو کہتے ہیں کہ کون ہے جو مضطر کی سنے؟ یہ آیت کہہ رہی ہے کہ مضطر بنو نہ کہ مضطر مضطر کہو۔ مضطر بنو گے تو اضطراب خود تمہارے اندر فریاد و دُعا پیدا کرے گا اور وہ پکار تمہارے دل سے نکلے گی تو اس سے پہلے کہ تمہارا منہ بند ہو وہ پکار سن لی جائے گی۔ ابھی تم مضطرب نہیں ہو اس لئے تمہاری پکار میں تاثیر نہیں ہے۔ تم رسم ادا کرتے ہو نہ کہ دُعا کرتے ہو۔ پس دل خودِ روح ہے جس کے ذریعے انسان ہر حقیقت کو درک کرتا ہے اور دل کا کام جڑ جانا ہے۔

---

[1]......(سورۃ الفجر، آیہ ۲۸،۲۷)

[2]......(سورۃ النمل، آیہ ۶۲)

دینی الفاظ کی متروکیت اور ان کا غلط استعمال

بعض الفاظ دینی الفاظ تھے لیکن دین داروں نے استعمال کرنا چھوڑ دیئے تو بے دینوں نے استعمال کر کے اُنہیں خراب کر دیا مثلاً محبت و عشق کو آلودہ کر دیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم چھوٹے تھے تو ایک امام بارگاہ میں مومنوں نے عزاداری کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہاں منشیات فروشی کا بزنس شروع ہو گیا تھا۔ ایسے ہی ہوتا ہے کہ جس چیز کو آپ چھوڑ دیں گے تو دُنیا دار اُس کو برے طریقے سے آباد کریں گے۔

ہم نے دین یا دینی اصطلاحات استعمال کرنا چھوڑ دیں تو انہیں بے دینوں نے اُٹھا کر شہوتوں کی دُنیا میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ عشق و محبت دینی الفاظ تھے۔ آپ قرآن دیکھیں کہ سراسر محبت و مودّت کا ذکر ہے مثلاً خدا کی انسان سے محبت اور انسان کی خدا سے محبت۔ محبت دل سے ہوتی ہے۔ عقل محبت کے لئے نہیں بلکہ فہم کے لئے ہے۔ عشق و محبت کس چیز کا نام ہے؟ تعلق کا نام ہے اور دل کا کام تعلق برقرار کرنا ہے۔ دل حافظہ و کیلکولیٹر نہیں ہے بلکہ وہ حساب گر و بنیا عقل ہے۔ وہ بھی روح کا کام ہے لیکن وہ الگ شعبہ ہے اور شعبہ الگ ہونے کی وجہ سے ان کے نام بھی الگ ہیں۔ دل کا کام ہی تعلق قائم کرنا ہے۔ پہلے ذاتِ خدا و توحیدِ خدا کا تعلق دل سے ہوگا۔

موصول کی وضاحت

وَ ضُمِّنَ الْقُلُوْبُ مَوْصُوْلَهَا......

موصول، وَصْلُ سے ہے اور وصل رابطے، پیوند و تعلق کو کہتے ہیں۔ وَصلت رشتے و ملاقات کو کہتے ہیں۔ توحید کے ساتھ وصلت کی ضرورت ہے جس سے وِصال بنا ہے۔ لقائے خدا و وصالِ خدا اسی موصول سے ہے۔

جوں ہی موصول کی بات آتی ہے تو طلباء کا ذہن اُس ادبی بحثِ نحو کی طرف پلٹ کر چلا جاتا ہے کہ موصول اُسے کہتے ہیں جو صلے کا محتاج ہوتا ہے۔ یعنی ایک لفظ، جملہ و کلمہ ایسا ہے کہ اسے پڑھ بھی دیں تو اس وقت تک معنیٰ نہیں بنتا جب تک اس کا صلہ بعد میں نہ آجائے۔ جیسے ”الذی، و الذی، التی، و التی“، یہ سب

موصولات ہیں جنہیں صلہ چاہئے۔ موصول صلہ ادبیات کی اصطلاحات ہیں۔ موصول ایسی چیز ہے کہ معنیٰ دینے کیلئے اس کا بعد والے جملے کے ساتھ ربط ہے۔ اگر بعد والا جملہ آئے تو اس کا معنیٰ بنتا ہے لیکن اگر بعد والا جملہ نہ آئے تو اس کا کوئی معنیٰ نہیں ہے۔ مثلاً لفظ 'جو' گفتگو میں استعمال کریں تو کوئی معنیٰ سمجھ میں نہیں آتا۔ اب بعد میں اس کا صلہ آرہا ہے کہ مثلاً جو مومنین پیچھے بیٹھے ہوئے ہیں وہ آگے آجائیں۔ اب ''جو'' کا معنیٰ نکل آیا ہے۔ چونکہ ان دونوں کے معانی میں آپس میں ربط، وصل، وصلت، رشتہ و تعلق ہے اس وجہ سے ان کو بھی موصول صلہ کہتے ہیں۔ اصل میں موصول وصلہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ وصل ہونا دل کی خاصیت ہے۔ ہم نے جب دل کو دیکھا کہ وصل ہوجاتا ہے اس وجہ سے ہم نے الفاظ کیلئے بھی وہی الفاظ استعمال کئے۔

جسم کا وصال ناممکن

جسم تعلق قائم نہیں کرتا بلکہ اجنبیت و لاتعلقی رکھتا ہے۔ آپ کسی کے ساتھ کندھا ملا کر بیٹھ جائیں پھر بھی ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ تعلق کس کا قائم ہوتا ہے؟ دل کا دل سے تعلق قائم ہوتا ہے۔ اجسام کو اگر آپ ویلڈ بھی کر دیں تو پھر بھی کوئی تعلق قائم نہیں ہوتا۔ اینٹ کے ساتھ اینٹ ملا دیں لیکن ان میں کوئی وصلت نہیں ہے۔ دل وصالِ خدا کے لئے بنایا گیا ہے۔ وصال یعنی ایسا گہرا رشتہ جس میں دو چیزیں متصل و ایک ہوجائیں۔ اس کے مقابلے میں فراق و جدائی ہے یعنی الگ ہوجانا، فرقت ہوجانا، ایک دوسرے کو چھوڑ دینا۔ روحِ انسان کے اندر خدا نے ایک خاصیت یہ رکھی ہے کہ اس کا تعلق و رشتہ ہمیشہ خدا کے ساتھ ہے لیکن اُس وقت تک جب تک اس دل میں کچرا، میل، زنگ، گناہ، دُنیا و شہوتیں نہ آجائیں۔ چونکہ وصل ہونا تو اس کے اندر ہے لیکن بعض اوقات اُس جگہ وصل ہوتا ہے جہاں وصل نہیں ہونا چاہئے مثلاً جب شہوتوں کا غلبہ ہوجائے تو پھر کسی اور سے وصل ہوتا ہے۔

ضمن کی تشریح

کسی شے کے اندر کوئی اور شے اس طرح سے ڈال دیں کہ وہ اُس کا جُز بن جائے اسے ''ضَمَنَ''

کہتے۔ تضمن یعنی کسی چیز کے اندر کسی چیز کو قرار دینا۔ جس طرح آپ کے موبائل میں بہت ساری چیزیں ہیں۔ یہ چیزیں آپ نے اُس کے ضمن میں ڈال دی ہیں۔

وَضُمِّنَ الْقُلُوْبُ مَوْصُوْلَهَا......

یہ وہ کلمہ ہے جس کا پیوند دلوں کے اندر لگا دیا گیا ہے، اسے دلوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، دلوں کو اس سے مربوط کر دیا گیا ہے، دلوں کے ساتھ اس کی وصلت قائم کر دی گئی ہے، دل اس سے متصل کر دیئے گئے ہیں۔ جب انسان کا خدا کے ساتھ قلبی رابطہ برقرار ہو جائے، وصلتِ قلبی برقرار ہو جائے اُس کے بعد مقامِ شہادت آتا ہے۔

وصل کیلئے مرحلہ فہم

دل سے پہلے بھی ایک اور مرحلہ ہے اور وہ عقل وفہم ہے۔ پہلے معقولِ توحید یا معقولِ کلمہ توحید ذہن کے اندر ڈالا جاتا ہے پھر حقیقتِ توحید دل میں آتی ہے اور پھر حقیقتِ توحید دل سے شہادت وشہود کے اندر اُترتی ہے۔

چنانچہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا آگے فرماتی ہیں:

وَأَنَارَ فِي التَّفَكُّرِ مَعْقُوْلَهَا،

یعنی توحید کا معنیٰ ومفہوم عقول کے لئے نورانیت قرار دیا گیا ہے۔

معقول عقل سے ہے یعنی فہم شدہ و سمجھی گئی چیز۔ معقولِ توحید یعنی معنیٰ توحید جو سمجھا گیا ہے یہ فکرِ انسان وعقلِ انسان کے اندر روشنی ونور بن کر ڈالا گیا ہے۔ جب معنیٰ توحید روشنی وعلم بن کر فکرِ انسان میں آتا ہے تو پھر فہم سے یہ حقیقت دلِ انسان میں منتقل ہوتی ہے اور جو حقیقت دل میں منتقل ہو جائے وہ عمل بن کر انسان کے اعضاء وجوارح سے ظاہر ہوتی ہے اور جب اعضاء وجوارح سے سامنے آجائے اُسے شہادت کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جب انسان فکر وعقل کے ذریعے معرفتِ خدا حاصل کر لے تو پھر قلب میں توحید سے

وصلت پیدا ہوتی ہے، عقد وعقیدہ پیدا ہوتا ہے اور یہ عقد وعقیدہ جب دل پر آجاتا ہے تو عمل بن کر انسان کے جوارح سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ عمل شہادت کہلاتا ہے۔ اُس وقت انسان کو حق ہے کہ کہے:

أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ۔

خود کو خطبہ فاطمیہ سلام اللہ علیہا کا مخاطب سمجھیں

اہم بات یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے خطبہ کا مخاطب قرار دیں۔ کتاب ''آدابِ فہم قرآن'' جو چھپ چکی ہے اسے جن کی کوئی مصروفیت نہ ہو، پیسے بھی فالتو ہوں اور عمر بھی وہ ضرور پڑھیں۔ چونکہ ایک پاکستانی جوان سے میں نے پوچھا کہ کتاب پڑھتے ہو؟ تو اُس نے قاطعیت کے ساتھ جواب دیا کہ نہ کبھی پڑھی ہے نہ پڑھوں گا۔ میں نے پوچھا اتنے پرعزم کیوں ہو؟ کہتا ہے اس لئے کہ کتاب پڑھنے سے دو چیزیں ضائع ہوتی ہے: ایک عمر ضائع ہوتی ہے اور ایک پیسہ۔ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جو مصروف ہیں، جن کی عمر بہت قیمتی ہے، جن کے پاس تھوڑے پیسے ہیں وہ رہنے دیں لیکن جن کے پاس فالتو پیسے اور فالتو عمر ہے وہ یہ کتاب لے کر پڑھیں۔ قیمتی عمر کو کھانے پینے اور سونے میں صَرف کریں تا کہ ضائع نہ ہو۔ فارسی زبان میں ایک محاورہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے پوچھتا ہے: آج کل کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا: وِل می گردم کہ بیکار نہ مانم۔ یعنی ایسے ہی آوارہ گھومتا ہوں تا کہ بیکار نہ رہوں۔

بہترین مال وہی ہے جو انسان اپنی نجات، اپنے دین اور اپنے کمال کے لئے خرچ کرتا ہے اور بہترین عمر وہ ہے جو مقصدِ حیات کے لئے خرچ ہوتی ہے۔ آدابِ فہم قرآن میں ایک ادب یہ ذکر ہوا ہے کہ ہم اپنے آپ کو قرآن کا مخاطب سمجھیں۔ ابھی ہم قاری ہیں، استخارہ یا فال نکالتے ہیں اور عجیب وغریب حرکتیں کرتے ہیں لیکن تنہا کام جو نہیں کرتے وہ یہ ہے کہ قرآن جب بات کرتا ہے تو ہم اپنے آپ کو قرآن کا مخاطب نہیں سمجھتے۔ اسی طرح جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے خطبہ کے مخاطب بنیں نہ کہ سامعین تا کہ بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا کی باتیں سمجھ آسکیں۔

توحیدی شہادت کے مراحل

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے یہ خطبہ اُن لوگوں کے سامنے بیان فرمایا جو ایک بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے تھے۔ یہ مشکل کہاں سے پیش آئی؟ مسئلہ یہ تھا کہ وحدانیتِ خدا جو اساسِ دین ہے شہادت بن کر اخلاص کی صورت میں ان کے عمل میں ظاہر نہیں ہوئی۔ کیوں نہیں ہوئی؟ اس لئے کہ شہادت تک پہنچنے کے لئے دین کو جو مراحل طے کرنے ہیں وہ طے نہیں ہوئے۔

پہلے دین و معرفتِ خدا زینتِ عقلِ انسان بنے، پہلے انسان سمجھے اور معرفت پیدا کرے۔ فکرِ انسان معنیٰ توحید، معرفتِ توحید، علمِ توحید و نورِ توحید سے منور ہو۔ جب فکرِ انسان، تفکرِ انسان، ذہنِ انسان، عقلِ انسان و فہمِ انسان معقولِ توحید و مفہومِ توحید سے منور ہو جائے تو اُس وقت قلبِ انسان حقیقتِ توحید سے متصل ہوتا ہے اور یہ حقیقتِ توحید شہادت بن کر انسان کے عمل میں ظاہر ہو جاتی ہے اور جب توحید عمل بن کر انسان کے اعضاء و جوارح سے ظاہر ہو جائے اور رویہ، سلوک و مسلک بن جائے اُس وقت انسان کہتا ہے:

أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ۔

اور اُس وقت اللہ کی طرف سے جواب آتا ہے کہ تو شہداء میں سے ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ......[1]

تجھے خدا نے شہید قبول کر لیا ہے۔ لیکن اگر یہ کام نہ ہو اور دین شہادت نہ بنے، اُمت کے رویوں میں توحیدِ خالقیت، توحیدِ ربوبیت و توحیدِ حاکمیت نہ آئے۔ حاکمیت اللہ اُمت کا رویہ نہ بنے، گواہی نہ بنے، شہادت میں تبدیل نہ ہو، مسلمان لا الہ الا اللہ پڑھ کر ہر قسم کی حاکمیت میں داخل ہو جائے، ہر ایک کی حاکمیت قبول کر لے، طاغوت کی حاکمیت کو قبول کر لے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ توحید ابھی شہادت نہیں بنی ہے۔

اس لئے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا نے خطبے کا پہلا حصہ اُن لوگوں کی فکروں کے اندر نورِ توحید ڈالنے کے

---

[1] ......(سورۃ البقرہ، آیہ ۱۴۳)

لئے مخصوص کر دیا تا کہ نورِ توحید سے حقیقتِ توحید ان کے دلوں میں وصل پیدا کرے اور وہ ان کے عمل میں شہادت بن کر ظاہر ہو جائے۔ جس چیز کی کمی اُن مخاطبین میں تھی وہ کمی آج تک چلی آ رہی ہے۔ توحید فقط ایک لفظ رہ گیا ہے لا الہ الا اللہ رسم رہ گئی ہے۔

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی......[1]

دراصل جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا اُمت کو ایک بہت بڑے تضاد سے نکالنا چاہتی تھیں جس میں امت فوراً گرفتار ہو گئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اُمت تضاد کا شکار ہو گئی تھی اور وہ تضاد آج تک چلا آ رہا ہے۔

تضاد سے بھرپور زندگیاں

تضاد، ضدیت یعنی ٹکراؤ کو کہتے ہیں۔ ہم متناقض زندگیاں گزار رہے ہیں۔ دو آدمی دوڑتے ہوئے آپس میں ٹکرا جاتے ہیں تو دونوں چکرا جاتے ہیں اور دونوں کو درد ہوتا ہے۔ ایکسیڈنٹ اسی چیز کا نام ہے۔ ہم جسے اُردو، فارسی یا عربی میں حادثہ کہتے ہیں اسے آپ اپنی مادری زبان میں Accident کہتے ہیں۔ جو حادثات ملک وملت اور نظام کے اندر رونما ہو رہے ہیں ان کا سبب ٹکراؤ ہے۔ ایکسیڈنٹ تضاد کا نتیجہ ہے۔

امام خمینیؒ کے نزدیک شہید حسینیؒ کی شہادت کا سبب

حضرت امام خمینیؒ نے ملتِ پاکستان کے نام پیغام میں اس تضاد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ جملہ جو ہم پی گئے اور ڈکار بھی نہیں لی۔ مثلاً مقابلہ کرتے ہوئے ایک ہی سانس میں کولڈ ڈرنک پی جاتے ہیں اور پھر ڈکار بھی نہیں لیتے۔ اسی طرح ہم شہید حسینیؒ کی شہادت کی مناسبت سے امام خمینیؒ کا وہ خطبہ و جملہ بھی پی گئے کہ جس میں امام خمینیؒ نے شہید حسینیؒ کی شہادت کا سبب بیان فرمایا۔

---

[1]......(بانگِ درا - علامہ اقبالؒ، جوابِ شکوہ، صفحہ ۲۱۵)

شہید حسینیؒ کی شہادت ایک بہت بڑا دلخراش حادثہ تھا جس سے امام خمینیؒ کو بہت تکلیف ہوئی۔ وہ حادثہ رونما پاکستان میں ہوا لیکن درد وہاں ہوا۔ امام خمینیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حادثہ تضاد کی وجہ سے ہوا ہے۔ ایک ملت تضاد کے اندر ڈوبی ہوئی ہے اور جب تک یہ تضاد رہے گا یہ حادثہ ہوگا۔ یہ صرف ایک واقعہ یا ایک حادثے کا تجزیہ نہیں تھا بلکہ پوری تاریخ کا تجزیہ تھا۔ کربلا بھی ایک حادثہ تھا جو تضاد کی وجہ سے ہوا۔ اگر وہ تضاد ٹکراؤ نہ ہوتا تو یہ مصائب نہ ہوتے۔

وہ تضاد کیا ہے؟ امام خمینیؒ فرماتے ہیں: وہ تضاد یہ ہے کہ ایک ہی دین کے اندر دو مختلف راہیں نہیں ہوسکتیں، دو متضاد راستے نہیں ہوسکتے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک دین کے اندر، ایک مسلک کے اندر دو متضاد راہیں نہیں ہوسکتیں۔ اگر یہ حقیقت علماء، مبلّغین، مدرسے وحوزے اپنی اُمتوں کو بتا دیتے تو یہ شہید شہید نہ ہوتا بلکہ یہاں موجود ہوتا۔ اس جملے میں امامؒ نے ہر شہید کی شہادت کے حادثے کو تجزیہ کر کے بیان کر دیا ہے۔

پاکستان میں تضاد کا فساد

جب قومیں متضاد راہوں پر چل نکلتی ہیں اُس وقت یہ تلخ حادثات رونما ہوتے ہیں۔ اس وقت پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے تضاد کا نتیجہ ہے اور پوری شیعہ وسنی ملتِ پاکستان تضاد کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ایسی زندگی جس میں دو ایسی راہیں یا چند ایسی راہیں اپنالی ہیں جن میں آپس میں ٹکراؤ ہے۔

جس طرح بعض دو شادیاں کر لیتے ہیں تو اُن کے گھر کے اندر کیا ہوتا ہے۔ ایک آدمی گھر کے باہر فٹ پاتھ پر کمبل اوڑھ کر سویا ہوا تھا۔ اس کے ایک دوست نے جب یہ حال دیکھا تو پوچھا کیا چیز تجھے روڈ پہ لے آئی۔ وہ کہنے لگا کہ گھر کے اندر بیویاں سونے نہیں دیتیں۔ ایک زوجہ کے پاس جاتا ہوں تو وہ کہتی ہے جا دوسری کے پاس جا، دوسری کے پاس جاتا ہوں تو وہ کہتی ہے تو اُس کے پاس جا۔ اب دونوں نے مل کر اتفاق کر کے کہا کہ گھر میں ہم رہیں گے تو باہر چلا جا۔ دو بیویاں ہوں تو اُن میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور پھر حادثہ رونما ہوتا

ہے۔اسی طرح گھر میں دو متضاد باتوں سے جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں فرقہ واریت کو فرقہ واریت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ایک فرقہ کہتا ہے کہ فرقے کے نام پر ہم منتخب ہوں گے، دوسرا کہتا ہے فرقے کے نام پر ہم منتخب ہوں گے۔یعنی یہ جھگڑا جو باہر ہے اب پارلیمنٹ میں ہوگا۔

قول وعمل میں پہلا تضاد

سب سے پہلا تضاد یہ ہے کہ زبان سے انسان لا الہ الا اللہ کہہ کر طاغوت کو لا کہے اور عمل میں طاغوت کی سرپرستی قبول کرلے حالانکہ خداوند تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْم بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا......[1]

پس جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے بتحقیق اس نے نہ ٹوٹنے والا مضبوط سہارا تھام لیا......

لیکن ان کی بولی اور عمل میں تضاد ہے تو خدا کو یہی ناپسند ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ٥ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ......[2]

اے ایمان والو! تم وہ بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں ہو؟

خدا کو تضاد بہت ناپسند ہے۔اے مومنو! منہ سے ایسے اظہارات کیوں کرتے ہو جو تمہارے عمل میں نہیں ہیں۔منہ سے لا کہتے ہو اور عمل سے ہاں کہتے ہو۔شیخ بہائی جو ذوالفنون شخصیت تھے اور ان کی شاعری بھی بہت اعلیٰ ولطیف ہے فرماتے ہیں:

در روز الست، بلی گفتی

---

[1]......(سورة البقره، آیه ۲۵۶)

[2]......(سورة الصف، آیه ۲،۳)

امـــــــروز بـــــــہ بســــــتر لا خفـــــــتی......[1]

یعنی روزِ الست جب خدا نے پوچھا تھا: الست بربکم، کہ میں تیرا رب ہوں یا نہیں تو وہاں تو نے کیا کہا؟ بَلیٰ (ہاں) اور آج اللہ کو "لَا" کہہ رہا ہے کہ تو رب نہیں ہے بلکہ میرا کوئی اور ربّ ہے۔ جس کو بَلیٰ کہا اُس کو عملاً "لَا" کہہ رہا ہے اور جس کو "لَا" کہا اُس کو عملاً بَلیٰ کہہ رہا ہے۔ یہ تباہ کن تضاد ہے اور ہر ایسا تضاد تباہ کن ہے کہ انسان زبان و ذہن سے مسلمان ہو جائے لیکن عمل میں غیر مسلمان ہو جائے۔

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا امت کے اس متضاد رویے اور تضاد کے شکار دین و دینداروں سے ناراض ہوگئیں۔ جو تضاد پر راضی ہو جائے وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

اور کافری کیا ہے؟

ہماری زندگیاں سراسر متضاد ہیں۔ ہمارے عہد کچھ ہیں اور عمل کچھ اور۔..... "کَبُرَ مَقْتًا"......اسے خدا بھی بہت برا جانتا ہے اس لئے جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو یہ تضاد بہت برا لگا۔ جب ظاہر و باطن اور قول وفعل میں تضاد آ جائے تو یہی منافقت ہے۔ زبان سے کہے کہ میں مومن ہوں اور عمل سے کفر ظاہر ہو رہا ہے۔

اقبالؒ فرماتے ہیں:

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو صحیح اور کافری کیا ہے!......[2]

غیر الٰہی نظام کا سہارا لینا اور اللہ کے نظام سے مایوس ہونا کافری نہیں تو اور کیا ہے۔ مملکتِ پاکستان میں شیعہ کتنا مایوس ہے کہ یہاں ہر گند، ہر طاغوتی نظام نافذ ہو سکتا ہے لیکن نظامِ ولایت و امامت کی بات کریں تو کہتا ہے یہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے بتا تو صحیح پھر کافری کیا ہے؟ کیوں نہیں ہو سکتا؟ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا اس تضاد پر

[1]......(شیخ بہائی، شیر و شکر، بخش ۱، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم)

[2]......(بالِ جبریلؒ، صفحہ ۵۵)

برہم تھیں۔تم اُمتِ رسولؐ ہو،کلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا پڑھتے ہو،شہادت اللہ کی دے رہے ہو، اظہارِ دین کرتے ہو لیکن کیا کیا ہے تم نے؟ پہلا قدم ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بتائے ہوئے نظام کے خلاف اٹھایا ہے۔

آج ہم زمانۂ بعداز رسولؐ......[1] میں ہیں لیکن جینے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا اسی پر برہم تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رحلت کو ابھی چند دن ہوئے ہیں اور تمہاری یہ حالت ہوگئی کہ تم نے ایسا قدم اُٹھایا۔آج بھی امت میں یہ آشکار تضاد موجود ہے اور تضاد جتنا آگے بڑھتا ہے اتنا زیادہ شدید ہوتا ہے۔

راہِ سیدہ سلام اللہ علیہا، پاکستان کا راہِ حل

پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا لیکن برطانوی نظام نافذ کر کے اسے تضاد کی راہوں پر ڈال دیا گیا۔ ہندو سے جدا کر کے انگریز کا غلام بنا دیا گیا۔ یہ ملک قرآن کے نام پر بنا لیکن یہاں قرآن کا نظام نہیں لایا گیا۔سارے جھگڑے اس تضاد کی وجہ سے ہیں اور اس تضاد کو ختم کر کے راہِ سیدہ سلام اللہ علیہا اپنانا پاکستان کا راہِ حل ہے۔ملت پاکستان نے ہر ایک کو ووٹ دے لئے،فوجی بوٹوں وآمریت کے تحت بھی مسلے گئے، جمہوریت کی مکاریوں کو بھی آزمالیا۔اب مزید موقع ملے تو پتا نہیں اور کیا کیا خر بازی کرنی ہے۔پینسٹھ سال سے یہ سب کچھ ہو چکا ہے لیکن تاریخ پڑھ کر دیکھ لیں کہ ہر حکومت کے بدلنے سے حالات مزید بدتر ہوئے ہیں۔اس لئے کہ یہ راستہ ہی تضاد کا ہے۔امت کو تضاد کے راستوں پر ڈال دیا گیا ہے اور لوگ اسی تضاد پر چل کر اسی اندھیرے میں بہت مطمئن ہیں۔

چنانچہ کوئی جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے خطبے کا مخاطب بنے یا نہ بنے لیکن ملتِ پاکستان،شیعہ پاکستان، سنی پاکستان، مسلمان پاکستان اس خطبہ کا زیادہ محتاج ہے۔جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ تم تضاد کی راہوں

---

[1]......مصنفِ کتاب نے زندگی بعداز رسولؐ کے عنوان سے بھی ایک انتہائی اہم گفتگو کی ہے جس میں نشاندہی کی ہے کہ اب جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور امام معصومؑ ہماری دسترس میں نہیں ہیں تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ امت کس ڈھنگ سے زندگی گزارے؟ یہی ڈھنگ سیکھنا بصیرت وعقل ہے اور جس قوم کو یہ ڈھنگ آ گیا وہ نجات پا سکتی ہے۔

پرچل پڑے ہو۔ یاتو اس نظام سے دین کاعنوان اتار دواور جو مرضی آئے کرو۔

عزیزانِ من! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نظامِ ولایت ترک ہو جائے تو جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا ناراض ہیں لیکن آج کسی مملکت میں نظامِ ولایت نہ ہو تو کیا فاطمہ سلام اللہ علیہا راضی ہیں کہ میرے بچے کو رو رہے ہو؟ ہمیں اس تضاد کو ترک کرنا ہے اور راہِ حضرتِ سیدہ سلام اللہ علیہا کو اپنانا ہے۔

رنجش و ناراضگی حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا سے سیکھ لیں

میں ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ صرف یہی رنجش و ناراض ہونا جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے سیکھ لیں کہ ہمیں ناراض و ناراحت کس سے ہونا ہے؟ جس طرح آپ نعرہ لگاتے ہیں کہ جینا علیؑ سے سیکھ لو اور مرنا حسینؑ سے، لیکن دونوں نہیں سیکھے۔ چونکہ جس طرح ہم جیتے ہیں علی علیہ السلام اس طرح نہیں جیتے تھے، جس طرح ہم مرتے ہیں حسین علیہ السلام اُس طرح نہیں گئے تھے۔ آپ ناراض ہونا زہراء سلام اللہ علیہا سے سیکھ لیں کیونکہ یہ ناراضگی ہی آج پاکستان کے تشیع کو بچا سکتی ہے۔ شیعہ کی کمزوری یہی ہے کہ ناراض ہونا نہیں جانتا، ناراضگی اس کے اندر پیدا نہیں ہو رہی، وہ رنجش فاطمیؑ اس کے دل میں نہیں اُتر رہی، اس نے اپنے آپ کو رنجش کیلئے تیار ہی نہیں کیا۔ ہمیں کچھ اور پلایا و سکھایا گیا ہے۔ کتنا بڑا لطفِ خدا ہے کہ وہ کسی کے دل میں رنجشِ فاطمہؑ جیسی رنجش ڈال دے۔

غمِ حسین علیہ السلام اپنائیں

اسی طرح خدا سے وہ غمِ حسینؑ مانگیں جو حسین علیہ السلام کا غم تھا۔ ایک وہ غم ہے جو امام حسین علیہ السلام کیلئے ہمارے دلوں میں ہے، جس کا ذکر عموماً مجلسوں میں ہوتا ہے اور ہم روتے ہیں۔ اس کا نام بھی غمِ حسینؑ ہے چونکہ حسین علیہ السلام کے بارے میں ہے لیکن غمِ حسینؑ کا ایک معنٰی یہ ہے کہ وہ غم جو خود حسین علیہ السلام کے دل میں ہے۔ وہ غم جو ہمیں رُلاتا ہے یہ ہمارا غم ہے۔ ہر ایک کا کسی کے بارے میں کوئی غم ہوتا ہے۔ لیکن ایک غم حسین علیہ السلام کے دل میں تھا جس نے حسین علیہ السلام سے مدینہ چھڑایا، گھر چھڑایا، مکہ چھڑایا، کنبہ چھڑایا، کربلا پہنچایا، جس نے

حسین علیہ السلام سے اپنے بیٹے میدان میں بھجوائے وہ غم، غمِ حسینؑ ہے۔ اُس غم کی تشریح وتفسیر امامِ محمد باقر علیہ السلام نے بیان کی ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

يَا عَبْدَ اللهِ مَامِنْ عِيْدٍ لِلْمُسْلِمِيْنَ أَضْحٰى وَلَا فِطْرٍ إِلَّا وَهُوَ يَتَجَدَّدُ فِيْهِ لِآلِ مُحَمَّدٍ حُزْنٌ،

قُلْتُ فَلِمَ؟

قَالَ: لِأَنَّهُمْ يَرَوْنَ حَقَّهُمْ فِيْ يَدِ غَيْرِهِمْ......[1]

اے عبداللہ! عید الفطر اور عید الاضحٰی میں سے مسلمانوں کیلئے کوئی عید ایسی نہیں آتی مگر یہ کہ اس میں آلِ محمدؐ کا غم تازہ ہوجاتا ہے۔

راوی نے پوچھا: ایسا کیوں ہے؟

آپؑ نے فرمایا: کیونکہ وہ اپنا حق اغیار کے ہاتھوں میں دیکھتے ہیں۔

یہ امامؑ کربلا میں کمسنی کے عالم میں موجود تھے۔ امامِ پنجمؑ فرمارہے ہیں کہ ہمارا غم تازہ ہوجاتا ہے کیونکہ عید کا دن جو روزِ امام مسلمین ہے جب میں اس دن مسندِ امامت وحکومت پر طاغوت کو بیٹھا ہوا دیکھتا ہوں تو میرا غم تازہ وزندہ ہوجاتا ہے۔ یزیدیت کی حکومت غمِ حسینؑ تھا۔ یہ غم ہمارے دلوں میں نہیں ہے۔ آج تشیع کے دل میں اس غم کی جگہ خالی ہے۔ یہ غم ہے جو گھروں سے نکالتا ہے اور کربلا پہنچا کر بچے قربان کرواتا ہے۔

طاغوتیت سے ناراضگی کی آمادگی

پس اے مومن! اے شیعہ! اے پاکستانی! اپنے دل کو اس رنج کیلئے تیار کر جو حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے دل میں تھا۔ حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا جس چیز سے دکھیہ ہوکر اس دُنیا سے چلی گئیں وہی دکھ تمہیں نجات دے

---

[1]...... (علل الشرایع - الشیخ الصدوقؒ، العلۃ من أجلھا یتجدد لآل محمد صلوات اللہ علیھم فی کل عید حزن جدید، الجزء ۲، صفحہ ۱۴۳)

سکتا ہے۔ فاطمہ سلام اللہ علیہا وہ رنج و دکھ وراثت میں چھوڑ کر چلی گئیں تا کہ میرے پیروکاروں کے اندر یہ رنج و دکھ پیدا ہو جائے کہ جس زمانے میں بھی اُن کو حکومت امامت و ولایت نظر نہ آئے کم از کم فاطمہ سلام اللہ علیہا کا پیروکار اس دُنیا سے راضی نہ ہو۔

یا ایھا الراضی! جو طاغوتیت و یزیدیت پر راضی ہو تم جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو کیا جواب دو گے کہ میں تو اس بات پر ناراض، رنجور و ناراحت ہو کر دُنیا سے چلی گئی اور تو اسی پر خوشحال ہے۔ طاغوت کی حکومت میں بیٹھ کر تیرا میرے بیٹے کو رونا مجھے خوشحال نہیں کر سکتا۔ ہم اگر یہی رنجش جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا سے سیکھ لیں اور اپنا لیں تو ہماری دُنیا و آخرت اور پاکستان کے حالات ٹھیک ہونے کے لئے کافی ہے۔

قیامِ فاطمہ سلام اللہ علیہا، حق کا چمکتا سورج

قیامِ جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا تا قیامِ قیامت بشریت کے لئے ہدایت کا منارہ ہے۔ تاریخ میں اس اقدامِ فاطمیؑ نے تشیّع کے حق کو ہمیشہ بچا کے رکھا ہے اور یہ قیامت تک باقی رہے گا۔ جب تک اقدامِ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا موجود ہے اس وقت تک یہ حق کا چمکتا سورج بن کر رہے گا اور اسی سے لوگوں کو ہدایت ملتی رہے گی۔ اسی سے لوگ سوچنے پہ مجبور ہوتے ہیں اور یہیں سے لوگوں کو حق کی طرف نشانِ راہ ملتا ہے۔ آج بھی تشیّعِ فاطمیؑ کا راستہ ہمارے لئے کھلا ہوا ہے۔ تشیّعِ فاطمیؑ اپنا فریضہ جانتا ہے اور اس کا انجام بھی جانتا ہے۔ بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا نے یہ راستہ طے کیا اور اس کے لئے قربانی بھی دی۔ پس اگر کسی کو دعوتِ حق دینے کیلئے تشیّع کی حقانیت بتانی ہو تو اس کے سامنے سیرتِ عظمیٰ جنابِ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا پیش کریں۔ جہاں نظامِ حق نہیں ہے وہاں اپنی ناراضگی کا اعلان و اظہار کریں اور نظامِ امامت و ولایت کے نفاذ کیلئے بھرپور جد و جہد کریں۔

فہرستیں

- فہرستِ آیات
- فہرستِ روایات
- فہرستِ دعا و زیارات
- فہرستِ اشعار
- فہرستِ منابع و مآخذ

فہرستِ آیات

سورۂ أنعام

سورۂ توبہ

سورۂ یوسف

سورۂ رعد

	آیت	صفحہ
سورۂ صف		
یَاأَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ	۲	308
کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللہِ أَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ	۳	308
سورۂ جمعہ		
عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّھَادَۃِ......	۸	234
سورۂ منافقون		
إِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْھَدُ إِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللہِ......	۱	251
إِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ o......	۱	253
سورۂ تغابن		
عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّھَادَۃِ......	۱۸	234
سورۂ انسان		
ھَلْ أَتٰی عَلَی الْإِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ	۱	178

سورۂ تین

سورۂ کوثر

فہرستِ روایات

صفحہ

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

صفحہ

حضرتِ امام علی علیہ السلام

صفحہ

صفحہ

حضرتِ فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا

صفحہ

حضرت امام حسین علیہ السلام

صفحہ

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

امامِ موسیٰ کاظم علیہ السلام

صفحہ

امام علی رضا علیہ السلام

امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف

حضرتِ زینب سلام اللہ علیہا

فہرستِ دعاوزیارات

صفحہ

فہرستِ اشعار

صفحہ

(فارسی اشعار)

علامہ اقبالؒ

مولانا روم

صفحہ

حکیم سنائی غزنوی

شیخ سعدی

صفحہ

حافظ شیرازی

شیخ بہائی

(اردو اشعار)

علامہ اقبالؒ

فیض احمد فیض

صفحہ

مری ذات کا جو نشاں ملے

مجھے دولتِ دو جہاں ملے...... 296

فہرستِ منابع وماخذ

◆ القرآن الکریم

◆ نہج البلاغہ

◆ خطبۂ فاطمیہؑ

◆ صحیفہ سجادیہ

❖ ا

❖ اہل البیتؑ فی تفاسیر أہل السنۃ

❖ ارشاد القلوب - الحسن بن أبی الحسن محمد الدّیلمیؒ، من أعلام القرن الثّامن

❖ اسرار نماز - مرحوم ملا محسن فیض کاشانیؒ

❖ اسفار - ملا صدراؒ

❖ اصول الکافی - ثقۃ الاسلام ابی جعفر محمد بن یعقوب بن اسحاق الکلینیؒ، المتوفی: سنۃ ۳۲۸ھ

❖ اقبال الاعمال

❖ الاحتجاج - أبی منصور أحمد بن علي بن أبي طالب الطبرسیؒ

❖ الامام الخمینیؒ ...... الفکر والثورۃ

❖ البلد الامین - آیۃ اللہ الشیخ ابراہیم بن علي العاملي الکفعمیؒ

❖ التربیۃ والمجتمع مظاہر عینیۃ من فکر الامام الخمینیؒ

❖ التفسیر الکبیر أو مفاتیح الغیب - فخر الدین محمد بن عمر التمیمی الرازی الشافعی، المتوفی: ۶۰۶ھ

❖ الجواہر السنیۃ فی الاحادیث القدسیۃ - الحر العاملیؒ

❖ الخرائج والجرائح - قطب الدین الراوندیؒ، المتوفي: سنۃ ۵۷۳ھ

❖ الخصال-الشيخ الجليل الاقدم الصدوق أبي جعفر محمد بن علي بن الحسين بن بابويه القميؒ، المتوفی:۳۸۱ھ
❖ السنن الكبرى-النسائي، المتوفی: ۳۰۳ھ
❖ العلماء فی فكر الامام الخمينیؒ
❖ العوالم، الامام الحسينؑ -الشيخ عبدالله البحرانی
❖ الكافی-ثقة الاسلام ابي جعفر محمد بن يعقوب بن اسحاق الكلينیؒ، المتوفی: سنة ۳۲۸ھ
❖ المُعْجَمُ الكبير-ابوالقاسم الطبرانی، المتوفی: ۳۶۰ھ
❖ المستدرک علی الصحيحين-أبوعبدالله الحاكم محمد بن عبدالله بن محمد بن حمدويه بن نعيم بن الحكم الضبی الطهمانی
❖ النيسابوری المعروف بابن البيع، المتوفی: ۴۰۵ھ
❖ المعجم الكبير-سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمی الشامی، أبوالقاسم الطبرانی، المتوفی: ۳۶۰ھ
❖ المغازی-أبوعبدالله محمد بن عمر بن واقد الواقدی، المتوفی: ۲۰۷ھ
❖ الملهوف علی قتلی الطفوف-علی بن موسیٰ بن جعفر بن طاووسؒ، المتوفی: سنة ۶۶۴ھ
❖ المنطق-المظفرؒ
❖ امالي الصدوقؒ
❖ انيس القلوب-آية الله السيد محمد تقی المدرسی

❖ب

❖ بالِ جبریلؑ-علامہ اقبالؒ
❖ بانگِ درا-علامہ اقبالؒ

❖ بحارالانوار-الشیخ العلامہ محمد باقر المجلسیؒ

❖ت

❖ تاریخ بغداد-الخطیب البغدادی، المتوفی: ۴۶۳ھ
❖ تہذیب الاحکام في شرح المقنعۃ للشیخ المفید رضوان اللہ علیہ-الشیخ الطوسیؒ
❖ تفسیر القمی-علی بن ابراہیم القمیؒ
❖ تفسیر مجمع البیان-أبي علی الفضل بن الحسن الطبرسیؒ
❖ تفسیر نور الثقلین
❖ تلخیص المتشابہ في الرسم-أبوبکر أحمد بن علي بن ثابت بن أحمد بن مهدي الخطیب البغدادي
❖ تمام نہج البلاغۃ-السید صادق الموسوی
❖ توحید-الصدوقؒ

❖ح

❖ حماسہ حسینیؑ-شہید مرتضیٰ مطہریؒ

❖خ

❖ خط الامام الخمینیؒ

❖د

❖ دراسات في الحدیث والمحدثین-ہاشم معروف الحسینی

❖ دیوان حکیم سنائی غزنوی

❖ر

❖ رجال الکشی

❖ روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی -شہاب الدین محمود بن عبداللہ الحسینی الالوسی

❖ روضۃ الواعظین -الفتال النیسابوری، الشہید فی سنۃ ۵۰۸ھ

❖ز

❖ زندگی نامہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا

❖س

❖ سنن الترمذی-الترمذی،أبوعیسی ،المتوفی:۲۷۹ھ

❖ش

❖ شرائع الاسلام فی مسائل الحلال والحرام-المحقق الحلیؒ

❖ شرح نہج البلاغۃ-ابن ابی الحدید

❖ کشف الغمۃ-العلامۃ المحقق أبي الحسن علي بن عیسی بن أبي الفتح الاربلیؒ

❖ص

❖ صحیح البخاری-ابوعبداللہ محمد بن اِسماعیل بن اِبراہیم بن المغیرۃ البخاری

❖ صحیح مسلم-أبوالحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیر ی النیسا بوری

❖ض

❖ ضربِ کلیم-علامہ اقبالؒ

❖ع

❖ عدۃ الداعی-ابن فہد الحلیؒ

❖ علل الشرایع -الشیخ الصدوقؒ

❖ علیؑ وپایان تاریخ

❖ عوالی اللآلی-ابن ابی جمہور احسائیؒ

❖ عیون اخبار الرضاؑ-الشیخ الصدوقؒ

❖ف

❖ فضائل ـ ابی الفضل سدید الدین القمیؒ

❖ فقہاء نامدار شیعہ

❖ک

❖ کنز العمال في سنن الاقوال والافعال-علاء الدین علی بن حسام الدین المتقی الہندی البرہان فوری، المتوفی: ۹۷۵ھ

❖ گ

❖ گلستان-شیخ سعدی

❖ م

❖ مثنوی معنوی-مولا ناروم

❖ مختصر بصائر الدرجات-الحسن بن سلیمان الحلی

❖ مرآة العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ-العلامة المجلسیؒ

❖ میزان الحکمة-الریشہری

❖ مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل-میرزا حسین النوری الطبرسیؒ

❖ مستدرک سفینة البحار-العلامة آیة اللہ الشیخ علی النمازی

❖ مستدرک نہج البلاغة-آیة اللہ العظمیٰ الشیخ هادي کاشف الغطاءؒ

❖ مستند الشیعة-المحقق النراقیؒ

❖ مسند أبي داود الطیالسی-أبوداود، الطیالسی البصری، المتوفی: ۲۰۴ھ

❖ مسند الامام أحمد بن حنبل-أبو عبداللہ أحمد بن محمد بن حنبل بن ہلال بن أسد الشیباني، المتوفی: ۲۴۱ھ

❖ مصباح الشریعة المنسوب للصادقؑ

❖ مصباح المتہجد

❖ مصباح کفعمی

❖ مفاتیح الجنان

❖ مفاہیم القرآن-الاستاد جعفر السبحانی

❖ مکانۃ العلماء فی فکر الامام الخمینیؒ

❖ مناقب آل أبی طالبؑ-الحافظ ابن شہر آشوب مشیر الدین أبی عبداللہ محمد بن علی بن شہراشوب ابن أبی نصر بن أبی حبیشی السروی المازندرانیؒ،المتوفی:سنۃ ۵۸۸ھ

❖ من لایحضرہ الفقیہ-الشیخ الجلیل الاقدم الصدوق أبی جعفر محمد بن علی بن الحسین بن بابویہ القمی

❖ منہاج البراعۃ فی شرح نہج البلاغۃ-الخوئی

❖و

❖ وسائل الشیعۃ-الشیخ محمد بن الحسن الحُر العاملیؒ،المتوفی:سنۃ ۱۱۰۴ھ